برطانوی ہند کا مستقبل؟
بیورلے نکولس
ترجمہ
ثمینہ راجہ
عظیم الرحمان فرقان
مقتدرہ قومی زبان ★ پاکستان

برطانوی ہند کا مستقبل؟

بیورلے نکولس

ترجمہ

ثمینہ راجہ
عظیم الرحمان فرقان

مقتدرہ قومی زبان ★ پاکستان

۲۰۰۷ء

بسلسلہ درسیات: مطالعۂ پاکستان

عالمی معیاری کتاب نمبر ISBN ۹۷۸-۹۶۹-۴۷۴-۱۷۶-۵

☆

طبع اوّل	....	۲۰۰۷ء
تعداد	....	۱۵۰۰
قیمت	....	۳۰۰/= روپے
فنی تدوین	....	عبدالرحیم خان
ترتیب وصفحہ بندی	....	منظور احمد
اہتمامِ اشاعت	....	حاجی غلام مہدی
طابع	....	ورڈ میٹ، اسلام آباد
ناشر	....	پروفیسر فتح محمد ملک صدر نشین مقتدرہ قومی زبان، ایوانِ اُردو، پطرس بخاری روڈ، ایچ۔۸/۴، اسلام آباد، پاکستان۔

☆

مطبوعات ترقیاتی منصوبہ : ۱

کابینہ ڈویژن، حکومت پاکستان

''سائنسی، تکنیکی وجدید عمومی موادِ خواندگی کی قومی زبان (اُردو) میں تیاری''

پیش لفظ

یہ کتاب نامور برطانوی ادیب اور صحافی بیورلے نکولس کی علمی بصیرت اور سیاسی پیش بینی کا شاہکار ہے۔ بیورلے نکولس نے "Verdict on India" کے عنوان سے اپنی اس عہد آفرین تصنیف میں برطانوی ہند کے مستقبل کو نہ تو سلطنتِ برطانیہ کے حکمرانوں کے اندازِ نظر سے سمجھا ہے اور نہ وہ اِس باب میں برطانیہ کی رائے عامہ کے فریب میں آئے ہیں۔ اُن کا یہ عمیق اور بصیرت افروز مطالعہ ایک غیر جانبدار اور حقیقت پسند تجزیہ نگار کے دل ودماغ کا کرشمہ ہے۔ وہ برصغیر میں برطانوی استعمار کے دورِ آخر میں آئے اور اُنھوں نے ایک برس سے زیادہ عرصے تک یہاں قیام کیا۔ اِس دوران اُنھوں نے برطانوی ہند کی تمام چھوٹی بڑی سیاسی جماعتوں کے زعماء سے ملاقاتیں کیں، ہر جماعت کے نمایاں ترین قائدین سے جماعت کے سیاسی منشور اور نظریاتی مزاج کی روشنی میں مکالمات اُستوار کیے اور ہندوستانی زندگی کی گہرائیوں میں پنپنے والے اندیشہ وافکار سے آگاہی حاصل کی۔ اِس سلسلے میں اِس برطانوی دانشور نے ادبیات وفنونِ لطیفہ، طب وصحافت اور تھیٹر اور سینما سے لے کر مذہب وملت کے دائرہ ہائے فکر وعمل کے مطالعہ اور مشاہدہ سے ہندوستانی زندگی کے سنگین حقائق کو قریب سے دیکھا۔ برطانوی ہند کے مستقبل کے موضوع پر اُن کی زیرِ نظر کتاب اِسی مطالعہ اور مشاہدہ کا ثمر ہے۔

جب یہ کتاب پہلے پہل ۱۹۴۴ء میں آکسفورڈ سے شائع ہوئی تھی تب برطانیہ اور برطانوی ہند میں ایک تہلکہ سا مچ گیا تھا اور ایک نئی بحث شروع ہوگئی تھی۔ بیورلے نکولس نے اپنے غیر جانبدارانہ اندازِ نظر سے قیامِ پاکستان کے مطالبے کو جائز اور برحق قرار دیا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کو ایشیا کا عظیم ترین اور اہم ترین سیاسی رہنما قرار دیا تھا اور برطانوی ہند کے تمام سرکردہ رہنماؤں کو قائداعظم کے مقابلے میں بونا قرار دیا

تھا۔ قائداعظم اور مسلم لیگ پر اس کتاب کا ایک باب بعنوان "ایک دیو قامت شخصیت سے مکالمہ" اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

یہ کتاب سن چوالیس سے لے کر سن سنتالیس تک متعدد بار شائع ہوئی مگر قیامِ پاکستان کے بعد اس کا کوئی نیا ایڈیشن منظرِ عام پر نہیں آیا۔ ہماری تاریخ اور سیاست کے موضوع پر اس اہم ترین کتاب کو پھر سے قارئین تک پہنچانے کی خاطر مقتدرہ قومی زبان نے اپنے ترقیاتی منصوبے "سائنسی، تکنیکی اور جدید عمومی مواد خواندگی کی قومی زبان (اُردو) میں تیاری" کے تحت اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

—— پروفیسر فتح محمد ملک

فہرست

☆☆☆

حصّہ اوّل

پہلا باب

مبہم ہندوستانی

"کیا تم کبھی کسی ہندوستانی سے ملے ہو؟" سوال کافی تعجب خیز تھا۔

آخر اس سوال سے اُس شخص کا مطلب کیا تھا کہ تم کسی ہندوستانی سے ملے ہو؟

میں تقریباً ایک برس سے اس ملک میں مقیم تھا اور شمال مغربی سرحد کی برف سے تراون کور کے شاداب کناروں تک، حیدرآباد کی پہاڑیوں سے مدراس کے بازاروں تک، بمبئی کے عشرت کدوں سے کلکتہ کے فاقہ زدوں کے علاقوں تک، ہزاروں میل کا سفر کر چکا تھا اور سب سے آخر میں ہمالیہ کے سائے تلے آرام کرنے کے لیے پہنچا تھا اور اس مرحلے پر مجھ سے یہ سوال کیا جا رہا تھا۔

"ہاں تو کیا تم مل چکے ہو؟"

"میں سمجھا نہیں۔ کیا کہیں کوئی اُلجھاوا ہے؟"

"ہوسکتا ہے" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے ایک قلی کو دیکھنے کے لیے نیچے ہسپتال تک جانا ہے، جس کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ میں آدھے گھنٹے تک واپس آؤں گا۔ پھر ہم ایک ایک چھوٹا پیگ لیں گے اور اس کے بعد تم مجھے اپنے جواب سے آگاہ کرو گے۔"

میں تقریباً تیس میل پر پھیلی ہوئی ایک وادی کے نظارے میں محو تھا، جہاں بے داغ نیلے آسمان تلے کنچن چنگا کی سفید قبائیں پھیلی تھیں۔ سماوی ملبوسات کی طرح، جنھیں محنتی فرشتے دیوہیکل ٹوکروں میں سمیٹ کر جمع کرنے والے ہوں۔ فرشتوں کو اپنا کام جلدی سمیٹ لینا چاہیے تھا کیونکہ سورج بہت تیزی سے غروب ہو رہا تھا جبکہ ان ملکوتی ملبوسات پر پہلے ہی سنہری اور قرمزی رنگ کے علاوہ اس تیزابی سبز رنگ کے دھبے پڑ رہے تھے، جس میں ہندوستانی جھٹپٹے کا اسرار نہاں ہوتا ہے۔ گھر کے نزدیکی پہاڑ، نشیب میں نقرئی رنگ کے رقص کرتے ہوئے دریا کی طرف خطیبانہ انداز میں جُھکے ہوئے تھے۔

ہر چند یہ سب کچھ بہت فاصلے پر نشیب میں تھا لیکن دریا کی موسیقی ایک مدہوش سرگوشی کی طرح پربتوں کی اطراف میں پھیلی ہوئی تھی۔ دریا کے اور ہمارے درمیان سوائے چائے کے کھیتوں کے کچھ نہیں تھا۔ ہزاروں ایکڑ پر پھیلی ہوئی چائے۔ چائے کے نہ ختم ہونے والے رجمنٹ اور ڈویژن .... چھوٹی چھوٹی

اگر کوئی چاہتا تو جھیل اونتاریو .... تراشیدہ جھاڑیاں، جنگل کے سایوں کی طرف پیش قدمی میں مصروف
کے سارے پانی سے ایک کپ چائے بنا سکتا تھا۔ بلاشبہ یہاں چائے کی اتنی مقدار موجود تھی۔
جیسے ہی فضا میں پانچ کے گھنٹے کی ٹن ٹن گونجتی، ڈاکٹر جانسن اپنی دائمی سرخوشی کے ساتھ آ موجود
ہوتا۔ ''کیا تم کبھی کسی ہندوستانی سے ملے ہو؟''

یہ آدمی آخر چاہتا کیا تھا؟ یقیناً اس سوال کے پیچھے کوئی خاص مقصد تھا۔ وہ کوئی غیر سنجیدہ آدمی ہرگز
نہیں تھا اور اگر کبھی رہا بھی ہو تو دارجلنگ کے بیس برس کے قیام نے اس کے کس بل نکال دیے ہوں گے۔
ابدی برف کی متجسس نگاہوں میں رہتے ہوئے، آپ غیر سنجیدہ نہیں رہ سکتے۔

میں نے کچھ ہندوستانیوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا، جن سے میں مل چکا تھا۔ وہ مجھے
حیران کُن تنوع اور رنگوں کے نظارے کے ساتھ اپنے سامنے حرکت کرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ مجھے یہ
بتاتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ ان میں سب سے نمایاں چہرے چار قاتلوں کے تھے جو پشاور کے ایک ہسپتال
میں میرے ہمسائے رہے تھے۔ وہ اپنے اپنے بیڈز پر زنجیروں میں جکڑے ہوتے اور رات میں ان زنجیروں
کی چھنک سنائی دیتی تھی۔ نرم آنکھوں، ملائم آوازوں اور بامروت حرکات والے قاتلوں کا ایک بشاش ٹولہ۔
ان میں سے ہر ایک نے سونے چاندی کے لیے نہیں بلکہ عشق میں، یا جوش میں، یا عزت کی خاطر قتل کیا تھا۔
کیونکہ شمال مغربی سرحد کا دستور یہی تھا!

قاتلوں کی یاد کے بعد (کیونکہ دھندلا کا ذہن کو کسی خاص نکتے سے بھٹکانے کے لیے ایسی چالیں
چلتا تھا جیسے کسی وادی میں سائے تھرتھراتے ہیں) تین ناچنے والیوں کا خیال، تصور کے پردے پر اُبھرا۔ یہ
ناچنے والیاں مہاراجا میسور کے محل کی مذہبی رسومات کے سلسلے میں خاص مقام رکھتی تھیں اور انھیں ایک بار
دیکھنے کے بعد کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ یہ ہماری توقعات سے حیران کُن حد تک مختلف تھیں۔

اُس روز پورا ایک گھنٹہ ہمیں سیڑھیوں پر، رنگوں کے موجیں مارتے ہوئے دریا کے سامنے کھڑے
رہنا پڑا۔ جامنی اور سبز رنگوں کی پالکیاں اُٹھائے ہوئے کہار .... خالص سونے کے اژدر نما ڈنڈے تھامے
ہوئے سپاہی .... جواہرات سے مزین چاندی کے دوشاخہ شمع دان اُٹھائے ہوئے پادری۔

اس کے بعد مقدس گائیں .... خوش وضع اور عشوہ طراز .... پشت، قرمزی اور لاجوردی
پچکاری سے ڈھکی ہوئی .... شاندار سینگوں پر سنہری ملمع کاری .... چہرے کاجل اور سیندور سے سجے

ہوئے .... یہاں تک کہ پاؤں میں سونے کی جھانجھنیں پڑی ہوئی .... اور ان کے بعد ...... بالآخر
ناچنے والیاں۔

''دیکھو'' وہ چیخے'' وہ آ رہی ہیں!''

''لیکن کہاں؟'' میں بے صبری سے آگے کی طرف جُھکا۔

آخر کسی کا پہلی بار ایک رقاصہ کو دیکھنا کافی اہم تجربہ ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی طرح کی اور مخلوق کے
گرد رومانویت اور شاعری کا ایسا ہالہ نہیں ہوتا۔

''وہاں .... ایک سنہری لباس میں ہے۔ ایک جامنی میں اور ایک چمکیلے سفید میں۔ کیا تمھیں
دکھائی نہیں دے رہیں؟''

ہاں۔ میں نے دیکھ لیا .... میں نے مس زاز وپٹس، مس ہیڈی رائٹ اور ایک اور خاتون کو
دیکھا جو ٹھیک کی مرحوم نواب زادی سے حیرت انگیز طور پر مشابہ تھی۔ یہ خواتین اپنے اپنے انداز میں کافی چمکتی
دمکتی صلاحیتوں کی حامل ہونے کے باوجود رقاصاؤں کی داستانی روایت کا تسلسل ہرگز نہیں تھیں۔ ماضی کی
رقاصائیں بلاشبہ ان کی ہندوستانی ہمزاد رہی ہوں گی۔ لیکن .... آخر کیا وجہ تھی کہ یہ نسبتاً باشعور عورتیں،
لوگوں کی تفریحِ طبع کے لیے یوں تھرک رہی تھیں؟ غالباً اس لیے کہ میسور میں اس پیشے کا تیزی سے خاتمہ ہو رہا
تھا اور اس موقع پر پرفارم کرنے کے لیے دستیاب عورتوں میں یہ سب سے بہتر تھیں۔ لیکن اُن کا وجود ہمارے
لیے صدمے کا باعث تھا۔ خاص طور پر مشرقی مس پٹس! جو اس انداز سے اپنے کولہے مٹکاتی اور گردن لچکاتی
تھی، جو ممکن ہے ہندوؤں کے دیوتاؤں کو محظوظ کر سکتا ہو لیکن ایک مغربی تماش بین کو خوف زدہ کرنے کے لیے
کافی تھا۔

۲

اس طرح تو کامیابی محال تھی۔

شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میرا دوست، سانپ کا شکار ہونے والے قلی کو دیکھ کر لوٹنے والا تھا اور
میں اپنے جواب کے آغاز کی تیاری تک نہیں کر سکا تھا۔

''کیا تم کبھی کسی ہندوستانی سے ملے ہو؟''

کسی ہندوستانی سے ملے ہو؟...... کسی ہندوستانی سے؟

میں کتنے ہی ہندوستانیوں سے مل چکا تھا۔ بلامبالغہ.......... کم از کم ایک ہزار سے!

لیکن ان کو فرداً فرداً یاد رکھنا کارِ محال تھا۔

فرض کیجیے .... ایک عام انداز سے سوچتے ہیں۔ فرض کیجیے۔ ہم ہندوستان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ لوگوں کو ایک بلندی سے دیکھتے ہوئے اور یہاں کی آبادی کی کثیر تعداد کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے۔ ان دلکش پُرسکون تصاویر کی طرح، جو ایک عام آدمی کو کسی بہت بڑی جنگ کا خاکہ بنانے میں مدد دیتی ہیں۔

ہوسکتا ہے اس طرح کچھ مدد مل سکے۔

لیجیے۔ یہ ان کا پہلا گروہ ہے۔

اٹھارہ کروڑ کاسٹ ہندو.......... یہ درست ہے کہ وہ ہندوستانی تھے۔ ہندوستان کا دل! لیکن ایک منٹ ٹھہریے۔ کیا واقعی ایسا تھا؟ پھر چھ کروڑ نان کاسٹ ہندوؤں کے بارے میں کیا کہا جائے، جو کیڑے تھے یا یوں کہیے کہ رینگ رہے تھے اپنی خاک میں۔ کیا وہ ہندوستانی تھے؟ کاسٹ ہندوؤں کی رائے میں تو وہ مرد اور عورت تک نہیں تھے۔ وہ تو اچھوت تھے!

جن کے ساتھ ایک برتن میں پانی پینا، روحانی طور پر زہر پینے کے مترادف تھا۔ جن میں سے کچھ کی شکل تک دیکھنا جائز نہیں تھا۔ جن کے لیے دن میں اپنے آپ کو چھپا کر رکھنا ضروری تھا اور وہ صرف اُس وقت باہر نکل سکتے تھے، جب گہرے بادلوں نے چاند پر اپنا نقاب ڈال رکھا ہو۔

اگر یہ چھ کروڑ انسان (تقریباً سلطنتِ برطانیہ کی کل آبادی کے برابر) اپنے ہی بھائیوں کے خیال میں، رزیل ترین حیوانوں سے بھی ارزل تھے تو کوئی غیر ملکی مغربی شخص انھیں "ہندوستانی" کس طرح گردان سکتا تھا؟ انسانوں کے یہ دونوں طبقے بیک وقت تو ہندوستانی نہیں ہو سکتے تھے۔...... یا ہو سکتے تھے؟..........

یہ سب بے حد اُلجھا دینے والا تھا۔ [1]

کچھ دیر کے لیے ہندوؤں کو یہیں چھوڑ کر مسلمانوں کی طرف پلٹتے ہیں۔ کتنے؟ تقریباً دس کروڑ! ہم

(۱) گاندھی جی کے اقوال کی کافی تشہیر اور اچھوتوں کے ایک رہنما ڈاکٹر امید کر کی بے پناہ کوششوں کے باوجود، برطانوی قانون سے قطعِ نظر، ہندوستان میں اچھوتوں کی حالت زار وہی ہے جو ہمیشہ سے تھی۔

تو اُن سے یہ سوال تک نہیں کر سکتے کہ کیا وہ ہندوستانی ہیں؟ کیونکہ وہ بآوازِ بلند چلا رہے ہیں "ہم ہندوستانی ہیں!" وہ چیختے ہیں "انگریز کے علاوہ، صرف ہم وہ قوم ہیں جس نے ایک عظیم ہندوستانی سلطنت کی بنیاد قائم کی۔ اور اب، ہم اپنی سلطنت واپس مانگتے ہیں! ہوسکتا ہے کہ یہ سلطنت پورے ہندوستان پر مشتمل نہ ہو (اگرچہ ہم میں سے بعض اس سلسلے میں اپنے الگ نظریات رکھتے ہیں کہ اقتدار کے حصول کے بعد ہم کیا کریں گے) لیکن کم از کم یہ ایک مسلم مملکت ہوگی۔ ہم اسے ہندومت کے کلنک سے ممکن حد تک محفوظ رکھیں گے۔ جو نہ صرف ایک مختلف مذہب ہے بلکہ مختلف ثقافتوں اور سماجی نظاموں کا حامل ہے اور ہم اپنی مملکت کو پاکستان کا نام دیں گے!"

پاکستان! پاکستان! اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ عجیب و غریب نازائیدہ ملک۔ جس کا وجود محض ایک خواب ہے؟ بعد میں ہم اس کا تجزیہ بھی کریں گے۔ اس دوران اس امر پر غور کرنا ضروری ہے کہ پاکستان کی یہ پُکار، باقی تمام لوگوں کو ہندوستان کے چاہِ بابل میں ڈبونے کی دھمکی کے مترادف ہے۔

سو اگر مسلمان، ہندوستانی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندو، ہندوستانی نہیں ہیں اور اگر ہندو، ہندوستانی ہیں تو پھر مسلمان، ہندوستانی نہیں ہیں۔ انسانوں کے یہ انبوہِ کثیر اس قدر شدید باہمی اختلاف رکھتے ہیں کہ نہ صرف ایک ساتھ خورد و نوش سے انکاری ہیں بلکہ کسی ایک علاقے میں رواداری سے مل جُل کر رہنے سے بھی منکر ہیں۔ وہ ذاتی جغرافیے کے ساتھ ساتھ ذاتی تاریخ کے بھی آرزومند ہیں۔ اپنی زمین کے علاوہ اپنے آسمان کے بھی تمنائی ہیں۔ ان کی بہت بڑی اکثریت کے ہونٹوں پر "Civis Indianus Sum" جیسا محاورہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

۳

روشنی آہستہ آہستہ مدھم پڑ رہی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ اُس ہندوستانی سے ملنے کا امکان بھی معدوم ہوتا جا رہا ہے، جسے ہم تلاش کر رہے ہیں۔ لیکن شاید ہم ان کی تعداد میں گم ہو چکے ہیں۔ شاید کروڑوں کے ہجوم کی چنگھاڑ میں فرد کی آواز ڈوب رہی ہے؟

چلیے۔ اُس تک رسائی کا کوئی اور طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ چلیے۔ دوسرے سرے پر ہندوستان کی مختصر ترین کمیونٹی سے آغاز کرتے ہیں۔ پارسیوں سے!

ان کی کل تعداد نوے ہزار سے بھی کم ہے اور ان میں تقریباً نصف بمبئی میں آباد ہیں۔ دنیا کے بہت

کم لوگ پارسیوں کے طرز زندگی سے واقفیت رکھتے ہیں کیونکہ وہ ان کے انداز مرگ پر غور و خوض میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ پارسی ہیں۔ زرتشت کے ماننے والے، جو اپنے مُردوں کو مینار خاموشی پر لے جاتے ہیں اور وہاں منتظر بھوکے گِدھوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ دنیا کو خیر باد کہنے کا بے حد ڈرامائی انداز ہے اور پہلی نظر میں کسی قدر ہولناک بھی۔ لیکن کم از کم یہ صاف ستھرا اور غیر مشتبہ تو ہے۔ اگر آپ واقعی یہ ایمان رکھتے ہیں کہ روح ہی سب کچھ ہے اور جسم کی کوئی اہمیت نہیں! اس کے علاوہ یہ آدمی کی طرف سے زمین کے لیے آخری بخشش ہے۔ اُس زمین کے لیے جس نے اس کے جسم کی نشو و نما کی، یہ آخری عمل ہے۔ ہَوا کے پرندوں کو جو بہر حال خدا کی مخلوق ہیں، اپنا جسم دان کرنا۔

بہر حال۔ یہ کتاب مُردوں کے بارے میں نہیں بلکہ جیتے جاگتے انسانوں کے بارے میں ہے اور اگر ہم انھیں ان کی کامیابیوں کے تناظر میں دیکھیں تو ہندوستان کے منظر نامے پر نمایاں کامیابیوں کے سبب پارسی ایک دم، اہم مقام حاصل کر لیتے ہیں اور اس خیال سے ہمارے حوصلے پھر بلند ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم ''ہندوستانیوں'' کی تلاش میں ہیں تو اس مرتبہ ہمیں ضرور کامیاب ہونا چاہیے۔

جہاں تک ہندوستان کے دولت مند طبقے کا تعلق ہے، اس میں آپ کو پارسی ہی ملیں گے۔ نہ صرف (ہم شتابی سے اضافہ کرتے ہیں) گِدھوں کے طور پر، بلکہ دولت کی تخلیق میں دھماکہ خیز کردار ادا کرنے کے معاملے میں بھی۔ صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔

ٹاٹا انڈسٹریز کا وسیع و عریض نیٹ ورک، مرکزی خیال سے تکمیلی مراحل اور موجودہ صورت تک، مکمل طور پر پارسی ہے۔ ٹاٹا انڈسٹریز کا مطلب ہے، انڈسٹریل انڈیا! اس کے جمشید پور کے سٹیل ورکس میں تیس ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ اس کا ہائیڈرو الیکٹرک سسٹم جس کی طاقت پچیس ہزار ہارس پاور ہے، ملک کا سب سے بڑا یونٹ ہے۔ اس کی ایئر کرافٹ انڈسٹری اگلے چند ہی برس میں مغرب کی بڑی سے بڑی صنعت کے لیے چیلنج بننے والی ہے۔ ہندوستان میں گلائیڈر سے گولی و گس تک اور کارک سکریو سے یوڈی کلون تک ہر چیز ٹاٹا کی بنائی ہوئی ہے!

اسی طرح ہندوستان میں جب بھی آپ کو کلچر کی تلاش ہوگی تو وہ پارسیوں ہی میں ملے گا۔ آرٹ کے وہ تنہا سرپرست ہیں۔ صرف یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہسپتالوں اور لائبریریوں کی تعمیر اور پارک اور کھیل کے میدان بنانے جیسے رفاہِ عامہ کے کاموں کو بھی اپنی دولت میں اضافے کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ صرف یہی

لوگ نچلے درجے کا ذہن رکھنے والے انڈین پریس کی رسائی سے باہر ہیں۔ ہندوستان، پارسیوں کے بغیر اس طرح ہے جیسے نمک کے بغیر، بلکہ زردی کے بغیر انڈا!

لیکن............ اور یہ ایک بہت بڑا ''لیکن'' ہے۔ ہم انھیں واقعی ہندوستانی نہیں کہہ سکتے۔ خواہ یہ خود اس خطاب کے لیے کتنا ہی اصرار کیوں نہ کریں۔ (ان کی بہت بڑی تعداد، خود کو اقلیت میں شمار کرنا پسند نہیں کرتی) جبکہ ہندوستانیوں کی بہت بڑی تعداد، انھیں اپنے میں شمار نہیں کرتی۔ وہ کہتے ہیں کہ پارسی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، دراصل ایرانی ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ایرانی تھے اور ہمیشہ ایرانی ہی رہیں گے اور یہ بات جس انداز سے کہی جاتی ہے وہ کسی طرح بھی بامروت نہیں کہلا سکتا۔

پارسیوں کے لیے اُبھرنے والی شدید جلن کے باعث ہزاروں لاکھوں انگلیوں میں ان کا سونا حاصل کرنے کے لیے کھجلی ہو رہی ہے۔ ''ہمیں آزاد تو ہونے دو، یہاں پارسیوں کی خاک بھی نہیں ملے گی'' عموماً یہ فقرہ سُننے کو ملتا ہے اور یہ وہ فقرہ ہے جس پر کان دھرنا پارسیوں کے لیے سود مند ثابت ہوگا۔

۴

اور اب تاریکی تقریباً مکمل طور پر پھیل چکی ہے۔ ہمارے چاروں طرف پہاڑیوں اور وادیوں کی تاریکی ہے اور ذہن کے اندر اس تلاش کی تاریکی جس کے آخری سرے پر، کوئی نہیں ہے۔ بہر کیف، جس طرح آسمان پر کچھ سنہری کرنیں ابھی باقی ہیں اُسی طرح اُمید کی کچھ شعاعیں ہمارے ذہن میں بھی موجود ہیں۔ کیونکہ ابھی تک لاکھوں انسانوں کے بے شمار طبقات باقی ہیں جن پر ہم نے توجہ نہیں دی۔ مثال کے طور پر، ہم سکھوں کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ نہ جینی اور بدھوں کی طرف اور سب سے بڑھ کر، عیسائیوں کی طرف۔

ہو سکتا ہے ان میں سے کسی میں......؟

سو ہم سکھوں سے آغاز کر کے ایک مزید کوشش کرتے ہیں۔

سکھوں کا شمار ہندوستان کی اصل اشرافیہ میں ہوتا ہے۔ یہ مردانہ خصوصیات ...... تیز ذہن اور جسم کے مالک ہیں۔ صاف ستھری زندگی گزارتے ہیں اور اپنے پہلے گُرو[1] نانک کی تعلیمات کے مطابق، خدا کا تصور رکھتے ہیں۔ نانک نے ہندو برہمنوں کو اسی طرح طنز کا نشانہ بنایا، جس طرح یسوع مسیح نے فریسیوں کو بنایا تھا۔ مسیح نے کہا تھا ''تم پتھروں کو نہلاتے دھلاتے اور اُن کی پوجا کرتے ہو لیکن خدا کے خیال سے تر ہوئے بغیر

---

(۱) پیدائش ۱۴۶۹ء اور وفات ۱۵۳۶ء

تم گندگی سے بھی گندے ہو" نا قابلِ فراموش قوت الفاظ کے ساتھ اس نے خدا کی طاقت کا اعلان کیا تھا۔" وہ ایک کیڑے کو اقتدار عطا کرسکتا ہے اور ایک فوج کو راکھ کا ڈھیر بنا سکتا ہے۔" اور خدا کی محبت پر قناعت کرنے کا درس اس نے اس طرح دیا تھا" اگر تو راضی ہو تو سوکھی زمینوں پر دریا بہتے ہیں اور اگر تو راضی ہو تو آسمانوں میں کنول کھلتے ہیں اور اگر تو راضی ہو تو آدمی خوفناک سمندروں کو عبور کر لیتا ہے۔ میں امن کے ساتھ تجھ میں رہوں گا۔ تجھ میں رہنا ہی میری کل خواہش ہے۔" نانک ایک سچا صوفی تھا لیکن وہ ایک عوامی آدمی بھی تھا اور اس کی تعلیمات، روزمرہ زندگی کے سادہ محاوروں کے ساتھ، کسانوں کے دلوں میں لَو جگا دیتی تھیں۔ (بُرا ذہن، فاحشہ عورت ہے۔ ظلم، قصاب کی بیوی۔ لوبھ، ایک کتا ہے۔ دھوکے سے حاصل کیا ہوا کھانا، مُردار۔ غصہ، جلا دینے والی آگ ہے)(۲)۔

اپنے عظیم گُرو کی یاد میں انہماک نے پچاس لاکھ سکھوں کو ایک علیحدہ مخلوق بنا دیا ہے۔ وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ انھیں مغلوں کے مقابلے میں شکست کی ہزیمت برداشت کرنی پڑی اور دغا باز شہنشاہ اورنگ زیب نے ان کے نویں گُرو کو اس لیے موت کے گھاٹ اُتار دیا کیونکہ اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

مسلمانوں سے عداوت نے انھیں خوابوں کی مملکت "پاکستان" کا بے رحم دشمن بنا دیا ہے۔ کیونکہ اگر یہ خواب کبھی تعبیر آشنا ہو جاتا ہے تو سکھوں کی اکثریت جو تقریباً ساری کی ساری پنجاب میں آباد ہے، نا اُمید اور تنہا ہو جائے گی۔ وفاداری کے ایک چھوٹے سے جزیرے کی طرح، جو چاروں طرف سے دشمنی کے سمندر میں گھرا ہوا ہو۔

"اگر آپ پاکستان بنانے کی اجازت دیتے ہیں۔" وہ تڑپ کر کہتے ہیں "تو ہم خالصتان کے نام سے علیحدہ سکھ ریاست بنائیں گے اور اس کے دفاع کے لیے مرتے دم تک لڑیں گے۔"

"Civis Indianus Sum"

اگر ہمیں کبھی ایسے ہندوستانیوں سے ملنے کا اتفاق ہو، جو ان الفاظ کو سچے خلوص کے ساتھ، منافقت کے بغیر اور کسی قسم کے ذاتی مفاد سے بالا ہو کر دہراتے ہیں، تو وہ سکھ ہرگز نہیں ہوں گے۔

تو کیا ہمیں ہار مان لینی چاہیے؟ کیا ہمیں چت لیٹ کر املی کے پیڑ کی شاخوں پر جُھنڈ کی صورت میں

---

(۱) "Thus Spoke Guru Nanak" نامی کتاب، مرتبہ سر جوگیندرا سنگھ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

چمکتے ہوئے جگنوؤں کو دیکھتے رہنا چاہیے۔ جو اپنی ہزاروں جگمگاہٹوں سے املی کے اس پیڑ کو کسی دیو قامت کرسمس ٹری کی طرح روشن کر رہے ہیں؟...... لیکن کرسمس کی مناسبت سے ہمیں یاد آتا ہے کہ ابھی تک ایک عقیدے کے لوگ باقی ہیں، جن کی طرف ہم نے توجہ نہیں کی۔

ہو سکتا ہے جس ہندوستانی کی ہمیں تلاش ہے، وہ ایک کرسچین ہو؟ ہو سکتا ہے کہ اس کے لیے مسیح کی عظیم تعلیمات ان برادر کُش نفرتوں کو فراموش کرنے کا باعث بن سکیں اور اُسے خدا کے عظیم گھرانے کا ایک فرد بننے میں مدد دے سکیں۔ ہندوستانی گھرانے کا ایک فرد؟ مناسب ہوگا کہ اس سوال کا جواب ایک کہانی کی صورت میں دیا جائے۔

کچھ عرصہ پہلے میں مدراس کے ایک چھوٹے سے ہندوستانی ریسٹورنٹ میں بیٹھا ایک دوست کا انتظار کر رہا تھا، جس نے مجھے گوا کے کچھ قدیم گرجوں کی تصاویر دکھانے کا وعدہ کیا تھا۔ پرتگیزیوں کا مفتوحہ علاقہ ہونے کے سبب گوا میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں تعمیر شدہ بے ڈھنگے قسم کے گرجوں کی بہتات ہے۔ ہرچند اب وہ کافی خستہ اور شکستہ ہو چکے ہیں۔ ان پر جڑے ہوئے بیش قیمت جواہرات چُرائے جا چکے ہیں اور مسلسل دو صدیوں تک برسنے والی ہندوستانی دھوپ نے ان کی شاندار پیشانیوں پر سجی رنگوں کی لہروں کو دھندلا دیا ہے اور اب وہ ساحلِ سمندر پر بھوتوں کی طرح کھڑے ہیں اور ان کی کھڑکیاں گھروں کی طرف خالی آنکھوں سے گھور رہی ہیں۔ تاہم پژمردہ اور ریزہ ریزہ ہونے کے باوجود یہاں آج بھی عبادت کرنے والوں کا ہجوم رہتا ہے۔ زمانوں پہلے عیسائیت قبول کرنے والے، جو آج بھی اپنے پُرانے عقیدے پر قائم ہیں۔

میرا دوست آ گیا۔ اُس کے سر پر پٹی بندھی تھی۔

"ہیلو...... یہ چوٹ کیسے لگی؟"

وہ کھسیانی ہنسی ہنسا "سب سے اچھی جگہ پر...... چرچ میں۔

"چرچ میں؟"

اُس نے تفصیل بیان کی جو کچھ اس طرح تھی کہ وہ دعا میں شریک تھا۔ جب متبرک شراب پیش کی جا رہی تھی تو ایک کرسچین ہندو نے دیکھا کہ پیالہ اُس سے پہلے ایک نیچ جاتی کی عورت کو دیا جا رہا ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور پیالے کو عورت کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کی۔ عورت چیخنے لگی تو اُس کی جاتی کے لوگ اُس کی حفاظت کے لیے جمع ہو گئے............ اور چند ہی لمحوں میں تنگ درمیانی گزرگاہ پر ہندوستانیوں کے بے قابو جسموں کی

دھکم پیل سے ایک غیر متبرک ہنگامہ شروع ہو گیا۔ جس کے نتیجے میں راستہ شراب اور خون سے بھر گیا۔

''تم حیران نظر آتے ہو؟'' میرے دوست نے پوچھا۔

''اچھا .... کیا یہ کوئی خوشگوار کہانی تھی؟''

''اوو ....لیکن یہ تو پورے ہندوستان میں ہوتا ہے، اکثر۔ ہر کرسچین چرچ میں۔ کیونکہ یہاں نیچے، جنوب میں جھگڑے اتنے جوش وخروش سے شروع ہوتے ہیں کہ جلوس کو نشستوں کے درمیانی راستے پر روک دیا جاتا ہے۔ لوگ جھنڈے کو ایک دوسرے کے ہاتھوں سے جھپٹ کر دھجیوں میں بکھیر دیتے ہیں اور یہ سارا عمل مقدس عشائے ربانی کے موقع پر زیادہ ہولناک ہو جاتا ہے۔ ہمیں مختلف جاتیوں کی پہچان کے لیے نشستوں پر تانبے کے چھوٹے چھوٹے نشانات لگانے پڑتے ہیں، اس کے باوجود وہ شکایت کرتے ہیں کہ ایک ہی پیالے میں پینے کی وجہ سے اُن کا دھرم بھرشٹ ہو گیا ہے۔''

''بھرشٹ ....یسوع مسیح کے پیالے سے؟''

Civis Indianus sum!

تلاش اپنے انجام کو پہنچی۔

۵

اور اب تاریکی میں قدرے کمی آ گئی تھی کیونکہ ستاروں کا ظہور ہو چکا تھا۔ جگنو املی کے پیڑ پر جشن کی رات منا رہے تھے۔ پورا پیڑ یوں جگمگا رہا تھا جیسے اس کے پتوں کو سیال چاندی میں ڈبو دیا گیا ہو۔ اس کی چمک دمک میں اضافے کے لیے چاند کی ایک قاش نچلی شاخوں پر جھول رہی تھی۔ جیسے ایک بھڑکیلا کھلونا۔

پہاڑیوں کی جانب سے آہٹ سنائی دی اور میرا میزبان قلیوں کے ایک گروپ کے ساتھ نمودار ہوا۔ سب قلیوں کے چہروں کے نقوش چینیوں جیسے تھے، جو شمالی بنگال کی خصوصیت ہے۔ (کیا وہ ہندوستانی تھے؟ .... مگر نہیں..........ہم تو یہ سوال ترک کر چکے تھے)۔ میرے میزبان نے قلیوں کو کچھ ہدایات جاری کیں اور وہ سب یکساں لے میں گنگناتے ہوئے پہاڑی راستوں پر بکھر گئے۔

''ہاں بھئی .... ہم نے اُسے بچا لیا۔ اُس بے چارے کو، جسے سانپ نے ڈس لیا تھا اور وہ موت کے منہ میں پہنچ چکا تھا۔'' وہ بوتل کی طرف بڑھا ''چھوٹا یا بڑا؟''

''بڑا بہتر رہے گا۔''

''تمھاری ہندی پچھلے سال کے مقابلے میں بہتر ہو گئی ہے۔''

''تم نے میری تامل نہیں سُنی اور میری بنگالی کا تو کہنا ہی کیا۔''

''یہ ایک عجیب وغریب ملک ہے۔ ہے نا؟''

''ایک ملک؟''

وہ ہلکی روشنی میں میری بات پر مسکرایا ''ایسا لگتا ہے تم نے میرے سوال کا جواب تلاش کر لیا ہے۔''

''ہاں''

''منفی؟''

''بالکل''

''خوب ...... زیادہ تر انگریز جتنے عرصے میں جان پاتے ہیں، تم نے اس سے بہت کم عرصے میں بہت کچھ جان لیا۔''

''ہو سکتا ہے کہ میں کچھ جان گیا ہوں لیکن اگر واقعی اس بارے میں سوچیں تو یہ گھٹیا حد تک غیر تسلی بخش جواب ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''دراصل میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں لیکن کسی منفی نتیجے کے بارے میں کتاب لکھنا، ایک تھکا دینے والا عمل ہوگا۔''

''لیکن فرض کرو، تمھارے پاس کوئی متبادل راستہ ہی نہ ہو؟'' وہ آگے جُھکا اور بڑی متانت سے کہنے لگا ''فرض کرو، تم اس نتیجے پر پہنچے ہو کہ ہندوستان مکمل طور پر ایک منفیت کا سلسلہ ہے..........تم ماڈرن آرٹ کے سلسلے میں اپنی تلاش سے پہلے ہی مجھے آگاہ کر چکے ہو..........اور ہوا کیا؟ تمھیں کچھ نہیں ملا۔ تم درجنوں ممتاز سیاسی شخصیات سے مل چکے ہو اور خود مجھے بتا چکے ہو کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی تخلیقی منصوبے نہیں تھے[1]۔ اس کو ایک اور طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان سب کا ایک ہی پسندیدہ لفظ ہے۔ ''نہیں''

---

(۱) یہ جناح سے ملاقات سے پہلے کی بات ہے۔

جبکہ یہ ''ہاں'' ہونا چاہیے۔''

''یہ بات کرنے کا ایک انداز ہو سکتا ہے۔''

''لیکن کیا یہ سچ نہیں؟ کیا آغاز سے انجام تک ہندوستان ''نہیں'' کا ایک جناتی سلسلہ نہیں؟''

''میں اتنا تھک چکا ہوں کہ اس تجریدی سوال کا جواب دینے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔''

''لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری کتاب کسی اہمیت کی حامل ہو تو ان سوالات کے جواب تلاش کرو۔ ایک بات اور ...... تمھیں ''کیوں'' کا جواز بھی تلاش کرنا ہے۔''

''کیا، کیوں، کا کوئی جواز ہے؟''

''میرے خیال میں ہے۔ لیکن جواز فراہم کرنا میرا کام نہیں۔ آفٹر آل، یہ تمھاری کتاب ہے۔''

''ہاں...... بدقسمتی سے۔''

سو بہتر ہوگا کہ ہم آغاز یہیں سے کریں۔

☆☆☆

دوسرا باب

شان وشوکت اور صورتِ حالات

علاوہ ازیں ہمیں ممکنہ بلندی سے آغاز کرنا چاہیے، مثلاً وائسرائے کے ہاں قیام کے پروگرام کے ساتھ۔

اس طرح ہندوستان کے بارے میں تو زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں لیکن بعض دیگر معاملات کے سلسلے میں کافی تعمیری تجربہ ہونے کا امکان ہے۔

وائسرائے کے ہاں یہ میری پہلی طلبی تھی اور ایک اُمید کا شائبہ سا تھا کہ ان تجربات کو آگے چل کر وقائع نگاری کی ترتیب میں لایا جا سکے گا۔ یہ احساس کافی خوش کن تھا کہ نہ صرف یہ کہ میرے سامنے ایک تصویری مرقع کھلنے والا تھا بلکہ مجھے ایک دانشورانہ ترقی کا موقع بھی ملنے والا تھا۔

ہندوستان بہت جلد آپ کے ذہنی وجسمانی نظام کا حصہ بن جاتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر اولین صدمات کا اثر بتدریج کم ہوتا جاتا ہے اور سنہری گُل مہر کے درختوں کے شعلہ بار شگوفے، جن پر پہلی نظر ڈالتے ہی آپ کی آنکھیں جھلس جاتی ہیں، جلد ہی اپنی تابانی کھو دیتے ہیں اور جس منظر سے ایک روز پہلے آپ کی نظر نہ ہٹتی تھی، آج آپ اُسے پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔ خوف ودہشت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے، مثلاً جانوروں پر ہندوستانی دانستہ طور پر ظلم نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے لیے ایک فطری سرپرستانہ اور مشفقانہ جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی جہالت اور غربت، بلاواسطہ طور پر ان حیوانات کی دردناک تکالیف کی ذمہ دار ہیں۔

مجھے ہندوستان میں قدم رکھے ابھی دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے، جب میں نے اپنی زندگی کا پہلا ڈھانچہ نما ہندوستانی گھوڑا دیکھا۔ سڑک پر لنگڑاتے اور لڑکھڑاتے ہوئے اور بالآخر درد اور اذیت سے لرزتی ہوئی چیخ کے ساتھ ایک گٹر میں غرق ہوتے ہوئے۔ جب آپ ایسا کوئی منظر پہلی بار دیکھتے ہیں تو اس سلسلے میں کوئی اقدام ضرور کرتے ہیں اور جو اقدام آپ کرتے ہیں وہ عام طور پر بے حد احمقانہ اور اکثر بے سود ہوتا ہے۔ کافی ہیجان پیدا کرنے اور پولیس کو پریشان کرنے کے باوجود آپ کو گھوڑے کی مدد کرنے میں کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ نتیجتاً تلخ ضرورت کے طور پر، آپ اپنے دل کو سخت کرنا سیکھ لیتے ہیں۔[1] بھکاریوں کے

---

(۱) اس کے باوجود RSPCA کی مدد سے باز رہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ خواتین وحضرات کی ایک انتہائی اچھی تنظیم ہے جو دنیا بھر میں جانوروں کی بہتری کے لیے جنگ میں مصروف ہیں۔ ان کا پتا ہے: 359-Hornby Road, Bombay اور اس سلسلے میں ایک پیسے کی مدد بھی کافی ہے۔

سلسلے میں بھی ہاتھ روکنے کی ضرورت ہے۔ ریلوے سٹیشن پر، جو ہندوستان کے بھکاریوں کا پسندیدہ مقام ہے، آپ کی پہلی آمد، ویانا کے عظیم پریٹرفیئر میں شومین کی طرف سے نمایش کے لیے رکھے گئے موی عفریتوں کے نظارے کے مترادف ہوگی۔ یہاں کوڑھیوں اور تیسرے درجے کے آتشک میں مبتلا فقیروں کے علاوہ نابینا بچے بھی ملیں گے۔ پیدائشی نابینا نہیں۔ بلکہ وہ بدنصیب جن کے ماں باپ یا سرپرستوں نے ان کی آنکھوں کی روشنی، مستقبل میں بھکاریوں کے بازار سے ہونے والی یقینی آمدنی کی خاطر بجھادی۔ یہاں سینٹ وٹس کے ڈانسرز بھی ملیں گے، اصلی یا نقلی.......... جو اپنے دماغوں میں گونجنے والی بھتاتی موسیقی کی دُھن پر اُچھلتے کودتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ ان کی موت تک جاری رہتا ہے۔ کچھ بھکاری تشنج کی اداکاری کرتے ہیں۔ رال اور تھوک سے لتھڑی ہوئی زنجیروں میں جکڑے کچھ پاگل بھی یہاں ملتے ہیں.......... اور بہرے.......... اور گونگے، جو اپنے لجلجے ہونٹوں کو پٹپٹاتے ہوئے آپ کے ڈبے کی طرف لپکتے ہیں۔

ابتدائی چندروز آپ اُن کو بھی خیرات دیتے ہیں۔ لیکن سکوں کی جھنکار سے مسحور، اس وحشت ناک مخلوق کے غول جوا‌ڑ کر آپ کی طرف آتے ہیں، اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ ان سے نمٹنا ناممکن نظر آتا ہے۔ نہیں معلوم وہ نمودار کہاں سے ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ آسمان سے اور درختوں سے ٹپک رہے ہیں۔ بے ربط الفاظ دہراتے ہوئے، تھوکتے ہوئے، منمناتے ہوئے، چلّاتے ہوئے اور اپنے زخموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ پھر آپ اس معاملے کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اب آپ جانتے ہیں کہ اس کا علاج ایک ہندی لفظ ہے۔ ''جاؤ''

پہلے آپ یہ لفظ ہچکچاتے ہوئے کہتے ہیں۔ پھر اونچی آواز میں۔ پھر اور اونچی آواز میں۔ یہاں تک کہ چیخنے لگتے ہیں ''جاؤ۔'' اس کے بعد، آخرکار آپ کو سکون اور خاموشی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن یہ ایک لرزتی ہوئی خاموشی ہوتی ہے۔ ملامت آمیز بازگشتوں سے بھری ہوئی۔

خدا خدا کر کے نئی دہلی پہنچتے ہیں۔ جہاں سٹیشن پر ایک شاندار کار ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ سفید اور سنہری لباس میں ایک دیو اسے چلا رہا ہے۔ ایک اور دیو اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ کار میں داخل ہونے سے پہلے ہم اپنے سر کو ذرا سا بائیں جانب موڑتے ہیں تاکہ اُس قلی کا شکریہ ادا کر سکیں جو توقع سے زیادہ مستعد ثابت ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم مُڑتے ہیں، الفاظ ہمارے ہونٹوں پر دم توڑ دیتے ہیں۔ ہم نے کچھ دیکھا ہے۔ پہلا شاک۔

۲

''ہندوستان چھوڑ دو''

ایک فٹ کی بلندی پر وہ موجود تھا۔ چند گز کے فاصلے پر، دیوار پر لکھا ہوا۔ میں پلکیں جھپک جھپک کر اُسے دیکھتا رہا۔ چہرے پر تمتماہٹ کے ساتھ.......... غصے کے سبب نہیں بلکہ ایک طرح کی سماجی توہین کے احساس سے۔ جیسے کوئی بن بُلائے مہمان کے طور پر محسوس کرتا ہے۔

''ہندوستان چھوڑ دو''

ایسا لگتا تھا جیسے ان الفاظ کا اطلاق میری اپنی ذات پر ہوتا ہے۔ میں نے کن اکھیوں سے اپنے قوی الجثہ ڈرائیور کی طرف دیکھا.......... فرض کیجیے، وہ اچانک میری طرف مُڑے اور بھونکنے لگے: ''اچھا...... تو تم جانتے ہو کہ اب تمھیں کیا کرنا ہے؟ نہیں جانتے؟ چلو کار سے باہر نکلو اور دفع ہو جاؤ۔'' لیکن وہ دیو بے خبری کے عالم میں سامنے دیکھ رہا تھا۔

''ہندوستان چھوڑ دو''

یقیناً یہ ایک غیر معمولی صورتِ حال تھی.......... توہین کا دہکتا ہوا احساس.......... نفرت کو اُبھارتا ہوا...... ہزاروں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے لہراتا ہوا.......... لیکن کوئی اس کا نوٹس نہیں لے رہا تھا۔ کیا وہ نابینا تھے؟ یا دھوپ نے ان کی آنکھوں کو چندھیا دیا تھا؟ یا پھر ان کا دماغ ٹھیک نہیں تھا؟ تمام مسافر تیزی میں تھے۔ پسینے میں بھیگی ہوئی پشت پر رائفلیں اُٹھائے برطانوی سپاہی۔ اپنے اٹیچی کیس سنبھالے کاروباری حضرات.......... ہری چمکیلی ساڑھیوں میں ہندوستانی عورتیں.......... برہمن پنڈت.......... مرغیوں کو ٹانگوں سے پکڑ کر لٹکائے ہوئے دہقان.......... سفری سامان اُٹھائے ہوئے علاقائی ملاح.......... کوئی شخص ذرا سی توجہ بھی نہیں دے رہا تھا۔

اور پھر میں نے ایک اور منظر کے بارے میں سوچا.......... بہت فاصلے پر.......... سرمئی درخت.......... نومبر کا کہرا.......... کالک زدہ جنگلے.......... ہائیڈ پارک اور عوامی مقرر.......... ان کی کرخت آوازوں کی بازگشت میری یاد کے کانوں میں گونج رہی تھی.......... اور وہ تمام بھی چلّا رہے تھے۔ ''چھوڑ دو''

وہ یہ الفاظ بادشاہ اور ملکہ سے، انگلستان کے نوابوں اور نواب زادیوں سے، اور ان سب سے جو سونے کے محلات میں رہتے تھے، کہہ رہے تھے۔ لیکن کوئی شخص توجہ نہیں دیتا تھا۔ پولیس والے کھسیانی ہنسی

ہنستے۔ ہجوم اکھڑ لیکن خلوص بھرے انداز سے ہمنوائی کرتا۔ الفاظ رالیس پائر کے لیکن ردِعمل رابی والا۔

کیا انگلستان، ہندوستان میں اپنے ایک اور غیر شعوری معجزے کا آغاز کر چکا تھا؟ یا وہ ایک بار پھر کھولتے ہوئے لاوے کو نظر انداز کر کے اس جوالہ مکھی کو کوئی اور روپ دینے کی غلطی کر رہا تھا۔

یقیناً ایسا ہی تھا۔

تقریباً ایک ہی ہفتے میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' سے لگنے والے دھچکے کا اثر کم ہو گیا۔ کیونکہ یہ نعرہ ہر طرف کثرت سے سنائی دیتا تھا۔

امریکی فوجیوں کے پسندیدہ مشاغل میں ایک مشغلہ تھا۔ چاک کا ٹکڑا حاصل کرنا اور Quit India کے نعرے کو Quit Indianapolis میں تبدیل کرنا۔ انگریزوں کی طرف سے بھی کافی اصلاحات تھیں لیکن وہ اتنی بامروت نہیں کہ یہاں درج کی جا سکیں۔

۳

دوسرا شاک ایک گھنٹے کے بعد لگا۔ جب ہم تیز رفتاری سے نئی دہلی کا دورہ کرنے کے بعد وائسرائے کی قیام گاہ کی طرف جا رہے تھے۔

یہ ایک منفی قسم کا شاک تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک طویل جمائی لینے میں مصروف ہوں، ساتھ ہی مجھے ایک شدید بوریت کا احساس ہوا۔ سب کچھ کتنا عجیب و غریب تھا۔ وہ تمام اجنبی آوازیں اور چہرے.......... عورتوں کی سبز چمکیلی ساڑھیاں.......... کوؤں کی کائیں کائیں اور چیلوں کی چلاہٹ.......... وہ تمام خوب صورت پھول.......... لالہ ُسرخ کی تراشیدہ روشیں.......... چارفٹ اوپر زینیا کی چادریں.......... بالی ووڈ کا مخصوص ہجوم.......... سینکڑوں ننھی سبز.......... عریاں حالت میں راستوں پر لاپروائی سے بکھری ہوئی۔ لڑکیوں کی لمبی قطار، اپنے سروں پر ہر ممکن چیز اُٹھائے ہوئے، سوائے چولہوں کے.......... کسی ہندوستانی شہر میں پہلی مرتبہ آمد پر آخر کوئی کس طرح بور ہو سکتا تھا؟

کار کی کھڑکی سے پیچھے دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ مجھے جواب کا اندازہ ہو چکا ہے۔

ہم وائسرائے کی قیام گاہ کی طرف جانے والی چڑھائی چڑھ رہے تھے اور اس طرح نئی دہلی کو ایک کل کے طور پر دیکھنا پہلی مرتبہ ممکن لگ رہا تھا۔ وہ سامنے لیٹی تھی۔ دُور تک پھیلی ہوئی، وسیع و عریض، بنی ٹھنی،

مشرقی واشنگٹن کی طرح، سفید کے بجائے رنگین، پکی مٹی سے بنی ہوئی۔ وہ سامنے لیٹی تھی اور اس کا نظارہ بے حد اثر انگیز اور باوقار تھا۔ اور وہ تقریباً اتنا ہی ہندوستانی تھا، جتنی کہ شیفرڈ کی پُش۔

یہی وجہ تھی کہ میں ہندوستانی شہر میں پہلی مرتبہ آمد پر اس قدر بوریت کا شکار ہو رہا تھا۔ کیونکہ لوگوں کی باتوں کے برعکس، جنھوں نے اسے پست قامت اور تاریک ترین بنا کر پیش کیا تھا، یہ کسی طرح بھی ایک ہندوستانی شہر نہیں تھا۔ یہ بالکل جدید اور اجنبی شہر تھا جس کی جڑیں ماضی میں گہری معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ ماضی میں بسنے والی سات عدد آسیب زدہ دلّیوں (Delhis) کے مقابلے میں، جو اس کے اردگرد کھنڈرات کی صورت میں گرد آلود میدانوں میں بکھری پڑی تھیں، خود اس میں حقیقی ہندوستانی روح بہت کم تھی.......... کیونکہ کم از کم اُن کھنڈرات میں بسنے والے بھوت تو ہندوستانی تھے، وہاں کے اصل باشندے! مگر یہ نئی دہلی تو کسی فینسی ڈریس شو کی برطانوی منتظمہ دکھائی دیتی تھی جو نہایت دردناک انداز سے مقامی زبان بولنے کی کوشش کرتی لیکن اُس کا لہجہ ساؤتھ کنسنگٹن کا لہجہ ہی رہتا۔

سرایڈون لیوٹینس نے جو اس کا حقیقی ذمہ دار تھا، ہر قسم کے لوگوں کو ایک ہی نگاہ میں رضامند کرنے کی سرتوڑ کوشش کی تھی۔ اس نے ہندو ستونوں پر مسلم گنبدوں اور سارسینی محرابوں پر ہوئے سالا کے مندر (Hoysala Temple) سے درآمد شدہ سجاوٹ کے ذریعے عمارت کے چہرے کو متوازن ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی جو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی تھی ''دیکھو...... میں کس قدر غیر جانبدار ہوں!'' لیکن انجامِ کار وہ کسی ایک کو بھی راضی نہیں کر سکا تھا۔ ان تمام کوششوں کا منطقی نتیجہ تھا۔ ''اسپرانتو طرزِ تعمیر''...... اور اسپرانتو ہرگز ایسی زبان نہیں جس میں مرد اظہارِ عشق کر سکیں یا سپاہی رزمیہ نغمے گا سکیں یا ماہرینِ تعمیرات کوئی عظیم خواب دیکھ سکیں۔

اگر نئی دہلی بھی کلکتہ کی جاذبِ نظر کولونیل عمارتوں کی طرح، یا اندرونِ ملک کی سفید ستونوں اور وسیع برآمدوں والی قدیم پُروقار رہائش گاہوں کی طرح، شعوری بے رحمی کے ساتھ برطانوی شکل اختیار کر لیتی تو نتیجہ زیادہ خوش کن ہوتا۔ جیسے ہم کہہ رہے ہوں۔ ''ہم موجود ہیں! خواہ کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔ ہم اپنے آپ پر ذرہ برابر شرمندہ نہیں۔ ہم تاریخ کے ایک خاص دور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جسے ہم نے خود تحریر کیا ہے اور ہمیں کوئی خواہش نہیں کہ اسے دوبارہ تحریر کیا جائے۔'' لیکن نئی دہلی، اپنے تمام تر شان و شکوہ کے باوجود ایسا کوئی یقین نہیں رکھتی۔ یہ سمجھوتے کی اولاد ہے.......... لہٰذا کبھی آزادی کا سانس نہیں لے سکتی۔.......... اور غالباً اس میں سب سے غیر معمولی چیز یہی ہے۔ حقیقت.......... جو جنگ کی لرزہ خیزی اور اژدہام میں بھی قائم رہتی

عمارتی نقشہ نویس کا بنایا ہوا ایک خاکہ۔ اس قسم کے نمونہ شہر میں آوارہ گردی
ہے........ناقابلِ تسخیر........
کرنے کے لیے لٹی پٹ بننا ضروری ہے۔ بے شمار گز یا گھروں کی قطاروں میں منڈلاتے ہوئے۔
یقیناً اس کی دیواریں گتے سے بنی ہوئی ہیں یا رنگی ہوئی پکی مٹی سے؟ اور یہ سنتری۔ کیا یہ بُھس
بھرے کھلونے ہیں جنھیں ایک مشینی سادگی کے ساتھ حیات بخش دی گئی ہے؟ اوپر پھیلا ہوا آسمان........کیا
یہ واقعی کسی شیشے کے صندوق کا ڈھکن نہیں؟ اور کیا یہ یقینی بات نہیں کہ کسی بھی لمحے کوئی فرشتہ آئے گا اور اس
ڈھکن کو ہٹا کر اس سارے باشیشہ نظام کو کسی برزخ میں دھکیل دے گا؟

نئی دہلی میں انگریزوں کو "ہندوستان چھوڑ دو" کہنا بالکل بیکار تھا۔ کیونکہ وہ تو یہاں کبھی آئے ہی
نہیں تھے۔

۴

شاک نمبر تین، درحقیقت بہت سے چھوٹے چھوٹے دھچکوں کا مجموعہ تھا۔ اطراف کے براب ڈنگ نیگین[1]
کی وجہ سے۔ وائسرائے سے متعلق میرے تمام ابتدائی تاثرات کچھ اسی قسم کے اظہار پر مبنی ہوں گے۔ "وسیع و
عریض........ جناتی........" میرے بیڈروم سے اے ڈی سی کے کمرے تک، جہاں ہمیں ڈنر سے پہلے جمع
ہونا تھا، طویل فاصلہ تھا۔ اور وسیع راہداریوں والے پورے راستے میں، دس دس گز کے وقفے سے، سفید و سنہری
وردیوں میں ملبوس گرانڈیل ملازموں کے دستے تھے۔ جب کوئی مہمان کوریڈور کے آخری سرے پر نمودار ہوتا،
ملازموں کا پہلا گروپ (ہر ایک گروپ میں سات یا آٹھ آدمی تھے) اپنی نشستوں سے اُٹھ کر اٹن شن ہو
جاتا........ اور مہمان کے گزر جانے تک، ٹکٹکی باندھ کر ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہتا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ
فرش پر ڈھے جاتا، اسی دوران دوسرا گروپ اُٹھ رہا ہوتا........ اور یہی عمل پورے راستے دوہرایا جاتا۔ ایسا
محسوس ہوتا تھا کہ اس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس سارے عمل میں کافی سنسنی خیزی تھی۔ اس کوریڈور میں چلتے
رہنے میں........ دیوؤں کی مسلسل اٹھک بیٹھک میں........ سفید اور سنہری وردیوں میں........ اس
میں مشرقی اپسراؤں کی محفل کی طرح، یکسانیت کا ایک حیرت انگیز احساس تھا۔

میں کچھ خواتین کو جانتا ہوں (جن کے نام ظاہر نہ کرنا ہی بہتر ہوگا) جو اس عمل کو سراہیں گی۔ اپنے
تئیں رومانیہ کی ملکہ تصور کرتے ہوئے، غلامی کے اس مظاہرے پر ایک خوش کن ہیجان کے ساتھ، وہ ان

---

(۱) گلیور کے سفر میں جناتی جزیرے کا رہنے والا۔ دیوزاد

کوریڈورز میں دیر تک گھومتی رہیں گی۔ مگر۔ میرے لیے یہ سب باعث شرم تھا۔ سچ مچ مقامِ عبرت۔ میں ان
ملازمین کو کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ سفید ہوں یا سیاہ، وہ بھی آدمی ہیں جوان راہداریوں میں جمگھٹا کر کے،
سراسیمہ مصنفین کو سلیوٹ پیش کرنے کے منتظر رہنے کے بجائے........ مثلاً .... محبت کر سکتے ہیں اور دھوپ
سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

جہاں تک وائسرائے کا تعلق ہے، اس کے لیے یہ سب، تاثر قائم کرنے کے لیے ضروری ہے مگر
اس طرح کے موقعوں پر کوئی کیا تاثر قائم کرسکتا ہے؟ میرا اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ کاریڈور میں سفر کے آغاز پر میں
قدرے نخوت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتا لیکن ایک سو گز کے فاصلے کے بعد یہ نخوت کچھ ڈھیلی پڑ جاتی اور اس
کے بعد ایک اعصابی تناؤ میں بدلنے لگتی۔ کیونکہ یکا یک مجھے محسوس ہونا شروع ہوتا کہ میرا ایک بٹن کھلا ہے۔
لیکن میں اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا کہ کہیں وہ دیو اس کا غلط مطلب نہ لے لیں۔

آخرِ کار اے ڈی سی کے کمرے میں وقت سے بہت پہلے پہنچنے پر........ کیونکہ مہمان پر ہمیشہ
لیٹ ہو جانے کا خوف طاری رہتا ہے اور شدید قسم کے اعصابی تناؤ میں مبتلا مہمان، باغ کا نظارہ کرنے کے
لیے ایک قدم آگے ٹیرس پر آتا ہے۔ باغ بھی دوسری تمام چیزوں کے مانند وسیع و عریض ہے بلکہ میری
رائے میں قدرے دہشت ناک........ یہ اس طرح کے باغات ہیں جو مالیوں کے سوا ہر ایک کے انبساط کا
موجب ثابت ہوتے ہیں۔ یہ شطرنج کے تختے کی طرح ہیں۔ سرخ اینٹوں میں گھرا ہوا صحرا........ اور اس
میں چھوٹے چھوٹے چوکور خانوں کا لامختتم سلسلہ۔ ہر ایک چوکور، جگمگاتے ہوئے پھولوں سے اَٹا ہوا........
لالۂ سرخ کا ایک تختہ نیلاہٹ کی شدت سے پھٹ پڑنے کے لیے بیتاب۔ ایک تختے پر کوس موس کے ہجوم،
آئس کریم کے بلاک کی طرح۔

اس اعتراف میں کوئی حرج نہیں کہ لیڈی لن لتھ گاؤ (Linlith gow) نے بُرے ذوق کا بہت اچھا
مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے شطرنج کے بورڈ کو حتمی اہلیت اور صلاحیت کے ساتھ تیار کیا تھا اور رنگوں کی لامتناہی اقسام
پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔

مجھے باغ کے ایک یک و تنہا حصے میں قدرے باغ پن نظر آیا۔ مختصر سا میدان۔ جس کے درمیان
ایک اُتھلا تالاب تھا۔ یہاں اس خاتون نے قدرتی حُسن پیدا کیا تھا۔ یہاں اُس نے قدیم اقسام کی جڑی
بوٹیاں اُگانے کے لیے لمبائی میں ایک باغیچہ بنایا تھا۔ اس کے گرد ایک طرف سے سیب کے درخت اور دوسری

واقعی جنت تھی۔ ...... اوران کے درمیان ...... جانب سے پانی کے ذرم تک بازگی تھی

لیکن ان باغات کا مجموعی تاثر، ان کے ڈیزائنر سرایڈون لیوٹنس سے معذرت کے ساتھ، نمایاں طور پر اُکتا دینے والا تھا۔

باغات وسیع تھے۔ سوئمنگ پول وسیع تھا۔ بال رومز وسیع تھے اور ملاقاتیوں کے کمرے بھی۔ اوران میں وسیع ترین تھے، وائسرائے اور وائسرائن ...... ان کے سراور شانے، ہجوم سے بہت بلندی پر تھے اوران کی دانشورانہ صلاحیتیں ان کے مقام کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں تھیں۔

۵

عالم پناہ تشریف لاتے ہیں۔

آپ وسیع فاصلے سے انھیں آتا ہوا دیکھتے ہیں۔ آہستہ خرامی سے ...... ملحقہ کمروں کے سلسلے کے آگے سے گزرتے ہوئے ...... ان کے آگے دبے پاؤں ایک اے ڈی سی چلتا ہے۔ ہمیشہ ...... دفتری اوقات کے دوران ایک اے ڈی سی کا ان کے آگے چلنا ضروری ہے۔ ایک مرتبہ باغیانہ مزاج رکھنے والی ایک سابق وائسرائن نے مجھے بتایا تھا کہ کچھ برس کے بعد اُسے یہ بات بُری لگنے لگی کہ وہ اس وقت تک باتھ روم میں نہیں جاسکتی، جب تک ایک اے ڈی سی پہلے اس کے اندر داخل نہیں ہو جاتا۔

مہمان قطار میں کھڑے ہیں اور جیسے ہی تعارف ہوتا ہے۔ خاتون کے احترام میں مہمان مرد اپنی ایڑیاں بجاتے اور کورنش بجالاتے ہیں۔ عالم پناہ آگے چلتے ہیں۔ ڈائننگ ہال میں داخل ہو کر ہم دیکھتے ہیں کہ شاہی پوشاک میں ملبوس دیوؤں کا تازہ دستہ موجود ہے۔ ہر کرسی کی پشت پر ایک دیو...... یہ دیو ایک مختصر اور خوبصورت لمحے کے لیے، سفید دستانوں میں چھپے ہاتھوں سے اپنے چہرے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اس دوران ہم بیٹھ جاتے ہیں۔

یہ وہ طریقہ تھا جو لن لتھ گاؤ کے عہد میں رائج تھا۔ لیکن ویولز (Wavells) نے (ان کے ساتھ ٹھہرنے کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا) ان تکلفات کو کسی حد تک کم کر دیا اور معاملات قدرے بے تکلفی سے چلنے لگے۔

یہ امر البتہ قابلِ توجہ ہے کہ دونوں ادوار میں خوراک ممکنہ حد تک سادہ تھی۔ ہندوستانی راجوں اور دولت مند ہندو تاجروں کی جانب سے دی جانے والی ضیافتوں کے مقابلے میں ان کی مثال سپارٹا کی ضیافتوں

جیسی تھی۔

وائسرائے کا طرزِ زندگی بھی سپارٹا جیسا تھا ...... ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ وہاں ہمیشہ ہی کاموں کے پہاڑ، سر کرنے کے لیے موجود ہوتے۔ آرام کے لیے لن لتھ گاؤ کے پاس فقط ڈنر کے بعد کے بیس منٹ ہوتے۔ جب وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر دھرے خبریں سنتا رہتا۔ جیسے ہی خبریں ختم ہوتیں، وہ تھکن کے ذرا سے احساس کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ سلاموں اور کورنشوں کا سلسلہ شروع ہوتا اور اس کے بعد وہ اپنے مطالعے کے کمرے میں غائب ہو جاتا۔ جہاں سبز روشنی والے لیمپ کے نیچے کاغذات اور دستاویزات کا ایک انبار اس کا منتظر ہوتا۔ یہ لیمپ آدھی رات کے بعد تک جلتا رہتا۔

وہ سلطنتِ برطانیہ کے کسی بھی ملازم سے زیادہ سخت اور تلخ ترین کام سرانجام دے رہا تھا اور اپنے سات سالہ دور کے اختتام پر وہ سب کر چکا تھا، جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ ہندوستان کے باشندوں کے لیے گہری موانست رکھتا تھا اور یہاں کے باشندوں کے بارے میں اس کی معلومات کسی بھی ہندوستانی سے زیادہ تھیں۔ اس میں اس کا قصور ہرگز نہیں تھا کہ اس کا تمام تر ریکارڈ "ہونا چاہیے تھا" پر مشتمل تھا۔ اور یہ تمام "ہونا چاہیے تھا" بھی قطعاً بے ثمر نہیں تھے۔ اگر ۱۹۴۲ء میں، جب شورش اور بدامنی پوری طرح پھیل چکی تھی، پورا ملک خون میں نہا چکا تھا اور مشرقی بندرگاہیں جاپانیوں کے قبضے میں جانے والی تھیں، وہ آہنی ہاتھ کا استعمال نہ کرتا ...... تو ...... لیکن شاید ہی کسی شخص نے لن لتھ گاؤ کا شکریہ ادا کیا ہو ...... اس کی حقیقت پسندی کے سبب کانگرس اس سے نفرت کرتی تھی اور جس طرح کی لن ترانی کے بل پر وہ انگلستان کے آزاد خیال طبقات میں مقبولیت حاصل کر سکتا تھا، اسے اس نے اپنی سطح سے کمتر جانا۔

وائسرائے کی مقبولِ عام تصویر ...... جو ہمیشہ ہمارے ملاحظے کے لیے پیش کی جاتی رہی، کس قدر مضحکہ خیز تھی ...... تختِ طاؤس پر ایک شہنشاہ ...... جو مورچھل سے ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھا رہا ہے جبکہ عوام فاقوں سے مر رہے ہیں۔

۶

ہم شاک نمبر چار سے دوچار ہوتے ہیں۔

آدھی رات کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا لکھنے میں مصروف تھا۔ باہر گیدڑ ایسی آوازوں میں چیخ چلا رہے تھے جو انسانی آوازوں سے پُراسرار مشابہت رکھتی تھیں۔ اگر کوئی فلم پروڈیوسر دانستہ کی

''انفرنو'' کوفلمانے کی کوشش کرے اور اس سلسلے میں نائسس کی بھٹکی ہوئی روح کی تلاش میں ہو، تو وہ گیدڑوں کے غول کی خدمات حاصل کر کے اس مقصد میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ پوری رات مکمل جوش وخروش کے ساتھ اپنی روحوں کو بھٹکانے میں مصروف رہتے ہیں۔ میں اپنی ڈائری مکمل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

''یہ ایک اذیت ناک الجھن تھی، جس میں غیر حقیقت پسند وحشی پن دکھائی دیتا تھا۔ علاوہ ازیں ٹیلی فون کے تاروں پر بیٹھے ہوئے ہرے طوطے، اس مضحک احساس سے نجات نہیں پاسکے کہ وہ پنجروں سے فرار ہوئے ہیں.......... ریلوے سٹیشن پر مور کے پروں کے پنکھے.......... ایک نوجوان ہندوستانی نے مجھے بتایا تھا کہ خدا نے مور کو خوبصورت دُم اس لیے عطا کی ہے تاکہ وہ اپنے بدصورت پاؤں کو چھپا سکے.......... پاؤں کے بارے میں بات کرتے ہوئے، وائسرائے کے ملازموں کے ننگے پاؤں کا ذکر فضول ہے.......... جو ہمیشہ اس خیال سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ وہ بکھرے ہوئے کانٹوں پر پاؤں رکھ دیں گے اور اس سے سماجی انتشار پیدا ہو جائے گا.......... آج رات ڈنر پر آنے والا مہاراجا کون تھا.......... اور کیا وہ موتی اصلی تھے؟.......... کوئی بہت حساس چیز شہنشاہ سلطان کی صحت کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے .... یہ یقیناً سننے میں بہت اچھا لگتا ہے۔ ''شہنشاہ سلطان'' شمع کے شعلے کی چمک .... گلاسوں پر بکھرتی اور گلِ شبو پر حسین نقرئی عکس چھوڑتی ہوئی.......... بلاشبہ پھول بہت حسین ہیں لیکن لگتا ہے۔ ہندوستان میں کسی کو انھیں آراستہ کرنے کا کوئی ذوق نہیں اور میں پھولوں کی زنجیروں کو کسی کی گردن میں لٹکانے کے خیال سے بالکل متفق نہیں ہوں.......... پشت پر رینگتے ہوئے کیڑوں سے قطع نظر، پھولوں کو رسّی پر مرتے ہوئے دیکھنے کے خیال سے مجھے نفرت ہے۔ میں ان سب کو دھاگے کی قید سے آزاد کر کے پانی میں بہا دینا چاہتا ہوں.......... میں ہندی زبان توقع سے زیادہ جلد سیکھ چکا ہوں.......... اور پان سپاری بیچنے والی عورتوں کے ساتھ نسبتاً طویل گفتگو فرما چکا ہوں۔ ایک عورت نے مجھے بتایا کہ آنے والے دن کو ہندی میں ''کل'' کہتے ہیں۔ یہ دریافت کرنے پر کہ گزرے ہوئے دن کے لیے ہندی میں کیا لفظ ہے، اس

نے بتایا کہ وہ بھی ''کل'' ہے۔ بے شک یہ ناقابل یقین لگتا ہو مگر واضح حقیقت ہے۔ ممکن ہے اس کے پیچھے کوئی گہرے نفسیاتی معانی ہوں لیکن اس لمحے میں ان معانی کو تلاش کرنے کی کوشش کر کے تھک چکا ہوں۔''

بہرحال.......... اس دہرے لفظی گورکھ دھندے سے قطع نظر، اس رات کوئی اور چیز بھی تھی، جسے میں احاطۂ تحریر میں لایا تھا۔ مثلاً ایک بے لاگ صحافتی تحریر، جس سے وائسرائے کے خدم وحشم کے تصویری مرقع کی وضاحت ہوتی تھی۔ یہ ماہرانہ رپورٹ کا ایک عام ٹکڑا تھا، جس کی اہمیت محض اتنی تھی (میرے خیال میں) کہ اس کا مطالعہ آسان تھا اور یہ اچھی طرح سے بیان کیا گیا تھا۔ میری رپورٹ کا یہی عام سا ٹکڑا، شاک نمبر چار کا سبب بنا۔

انگریزی میں شائع ہونے کے بعد، یہ جونہی ہندوستان میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس نے ایک زبردست ہنگامہ برپا کر دیا۔ اخبارات کے پہلے صفحات پر، زہریلی سرخیوں کے ساتھ گمراہ کن بیانات شائع ہونے لگے۔ معروف اخبارنویسوں نے اپنے قلم تلخ ترین تیزاب میں ڈبو لیے۔ بعد میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ یہاں پر کسی عمومی نتیجے کے اظہار کا یہ شائستہ ترین انداز تھا۔ کسی نے ایک چھوٹی سی پھلجھڑی چھوڑی جو بڑے دھماکے کا سبب بن گئی۔ اُس وقت بہرحال میرے لیے یہ ہنگامہ ششدر کر دینے والا تھا۔

سارے فساد کی جڑ آخر کیا تھی؟ یہ صرف دو پیراگراف تھے، جن میں، میں نے لکھا تھا کہ وائسرائے سے متعلق شان وشوکت، درست اور ضرورت کے عین مطابق ہے۔ یہ ہندوستان کی تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے اور اس میں کسی طرح کی کمی نہ صرف ناقابل عمل بلکہ مصنوعی ہوگی۔

بہرحال.......... ہندوستانی تاریخ، انگریز کی آمد تک.......... ایک بے لگام مطلق العنانی کا شکار تھی۔ ہندوستان ہمیشہ سے انسانی جھونپڑوں کے ہجوم میں گھرے ہوئے چمکتے دمکتے محلات کی سرزمین تھی۔ جہاں کسی متوسط طبقے کا کبھی وجود نہیں رہا تھا اور نہ ہماری آمد تک جمہوریت کا کوئی جھونکا اس کی خاک کو چھو کر گزرا تھا۔ ہم اس سب کچھ کو تبدیل کر رہے تھے اور یہ تبدیلی ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ زور پکڑ رہی تھی۔ اس اثنا میں اس کا کچھ حصہ ابھی تک پیٹر دی گریٹ کے زمانے سے مراسلہ نگاری میں مصروف تھا۔ کچھ حصہ الزبتھ کے زمانے میں زندہ تھا۔ کچھ حصہ بے شرمی کی حد تک پتھر کے زمانے میں سانس لے رہا تھا۔ درحقیقت مجموعی طور پر یہ تاریخی غلط زمانی کا ایک مجموعہ تھا۔ اس عالم میں سوائے کسی نہایت کوتاہ بیں قوم پرست کے کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ ہندوستان مجموعی طور پر، ایک ''جدید'' ملک ہے۔

"وائٹ ہاؤس جیسی سادگی کی تقلید کی کوشش"............ آخری پیراگراف اس طرح سے تھا:

"ایک مضحکہ خیز تصنع کی مثال ہوگی۔ ہندو اس پر ہنسیں گے۔ مسلمان اسے حقارت سے دیکھیں گے......اور نوابین اسے ایک قسم کی دیوانگی سمجھیں گے۔"

یہ نوابین ہی کا ذکر تھا جو تلخ ترین طعن و تشنیع اور وسیع ترین الزام تراشی کا سبب بنا۔ .... یہ کہا گیا کہ ستاروں جڑے تخت پر رونق افروز لن لتھ گاؤ کے مقابلے میں سادہ لکڑی کی کرسی پر بیٹھا ہوا صدر روز ولٹ، شدید ترین تضاد کا مظہر ثابت ہوتا ہے۔ یہ تمام نقاد اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے تھے کہ نوابین موجود تھے............ کہ وہ ہمیشہ موجود رہے تھے............اور ان کا وجود ہی وائسرائے سے وابستہ شان و شوکت کا کافی جواز فراہم کرتا تھا۔

میں اس نکتے کی وضاحت کرتا ہوں۔

ہندوستان کے بیشتر تبصرہ نگاروں نے اس طرح کا رویہ اختیار کیا کہ جیسے نوابین کا وجود تھا ہی نہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ، جیسے وہ بیکار لوگوں کا ایک ٹولہ تھا، جسے انگریزوں نے اپنے مذموم مقاصد کے لیے ایجاد کیا تھا۔

دراصل یہ حقائق کی تنسیخ تھی۔ نوابین کا وجود اس حد تک تھا کہ وہ ہندوستان کے دو چوتھائی حصے پر حکمران تھے اور ان کی رعایا کی تعداد آٹھ کروڑ سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس کے علاوہ ان کی ریاستیں جو پانچ سو کی تعداد میں تھیں۔ تاریخی اور ذاتی مفادات کے تار و پود میں اس سختی سے بُنی ہوئی تھیں کہ ان کو علیحدہ کرنے کا مطلب پورے تانے بانے کو بکھیر دینا تھا۔ بلاشبہ ان میں بعض ریاستیں بہت چھوٹی تھیں اور ہندوستان کے توشک پر محض سنہرے ذرات کی طرح جگمگا رہی تھیں لیکن باقیوں کا سائز فرانس کے برابر تھا۔ ان کے حکمران وسیع اختیارات اور حریصانہ خواہشات رکھتے تھے اور مرتے دم تک ان اختیارات اور خواہشات سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ بہت سے لکھنے والوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ گاندھی ان نوابوں کے جانی دشمن تھے۔ اگر یہ حضرات بنگال ریڈیکل کلب کی شائع کردہ، ایم این رائے کی تصنیف "Gandhism: nationalism: Socialism." کا صفحہ نمبر ۲۱ نکالیں تو انھیں گاندھی کے انٹرویو کا ایک حصہ ملے گا جس میں انھوں نے واضح طور پر نوابوں اور جاگیرداروں کی حمایت کا اعلان کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر ان کو ان کی جاگیروں سے بے دخل کرنے کی ذرہ برابر کوشش بھی کی گئی تو ہر طرح سے اُن کا دفاع کیا جائے گا۔ ہمارے ناقدین اس انداز سے بات کرتے ہیں جیسے نوابوں کے یہ دیومالائی کردار ہم

(انگریزوں) نے تخلیق کیے ہیں۔ جنھیں ان حیران کن جواہرات سے ہم نے انھیں لاد رکھا ہے۔ ان کے حرم عورتوں سے ہم نے بھرے ہیں اور ان کے لیے ہاتھیوں کی فوج بھی ہم نے تیار کی ہے۔

ہم پر یقیناً ایسی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ہمیں تو یہ تمام چیزیں جوں کی توں ملیں۔ اسی طرح سرگرم، جس طرح یہ صدیوں سے سرگرم عمل تھیں۔ ہندوستان کے تھیٹر میں انگریزوں کے داخلے سے پہلے ہی یہ سارا عمل پوری قوت سے جاری و ساری تھا۔ البتہ اس کے بعد ہم نے سٹیج کا انتظام قدرے دور اندیشی سے چلانے کا بیڑہ اُٹھایا۔ لیکن ہمیشہ سے ہمارا مقصد اسے حکمرانوں سے زیادہ عوام کا تھیٹر بنانا تھا۔ اگر کوئی نواب اپنے مخصوص کردار سے تجاوز کرتا اور اپنے ہمسایوں پر چڑھ دوڑنے کی کوشش کرتا تو ہم ڈرامے میں اس کا رول مختصر کر دیتے اور جب کھیل میں ناشائستگی کا عنصر بڑھ جاتا تو، جیسا کہ کئی مرتبہ ضرورت پیش بھی آئی، تب ہم سنسر آفس کا استعمال کرتے تھے۔ مکالموں کی برجستہ ادائی کے لیے نوابوں کو قاعدے اور ضابطے میں رکھنا ضروری تھا۔ انصاف اور متانت کے چند خاص اور ضروری اصولوں کو وضع کر کے ہم نے ان کو اپنی حدود میں رہنے اور جارحیت سے اجتناب کرنے کا پابند بنایا۔

لیکن ان حدود کے باوجود، وہ ابھی تک اپنے قدیم مفادات سے چمٹے ہوئے تھے۔ ابھی تک وہ وسیع و عریض علاقوں پر حکمرانی کر رہے تھے اور زیادہ تر اپنی ریاستوں کو ٹھیک ٹھاک ہی چلا رہے تھے۔

اب اگر کوئی ناقد ہمیں یہ بتاتا ہے کہ برٹش وائسرائے کو، جو ان تمام چمکتی دمکتی شخصیات پر حکمران ہے، ایک چھوٹے سے مکان میں رہنا زیادہ زیب دیتا ہے، تو ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ طریقہ حتمی طور پر غیر ہندوستانی ہوگا۔

بہر حال یہ بحث پہلے ہی کافی طول کھینچ چکی ہے اور اگر قارئین اس سے متفق نہیں تو مجھے ہر طرح کے اختلاف کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ لائٹ آف کرنے سے پہلے اپنی تشفی کے لیے، میں آنے والے کل کی مصروفیات کی فہرست دیکھتا ہوں۔ اس پر سرِ فہرست ڈاکٹر امبید کر کا نام ہے۔

اور ڈاکٹر امبید کر............ بہر حال ان تمام حالات اور واقعات میں، یقیناً بے حد مختلف تجربہ ثابت ہوگا۔

☆☆☆

تیسرا باب

زیریں سطح کے نیچے

تقریباً پچاس سالہ ایک شخص اپنے گھر کے برآمدے میں بید کی کرسی پر میرا منتظر تھا۔ جسم فربہی کی طرف مائل مگر متحرک .... بہت دلکش اطوار مگر اعصاب زدہ .... اپنے جوتوں کے تسموں سے چھیڑ چھاڑ کی عادت .... بظاہر اپنی طرف نگراں لیکن ہر طرف سے طعن و تشنیع سننے کے لیے تیار ...... خیر اس کی توقع تو رہتی ہی تھی۔

میری یادداشتوں کا ماحصل!

یہ شخص ڈاکٹر امبید کر ہے اور آئندہ لمحے میں ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ کیوں ''اس کی توقع تو رہتی ہی تھی۔''

امبید کر، ہندوستانی سرکار میں لیبر ممبر ہے اور ہندوستان کے چھ بہترین اذہان میں سے ایک ہے۔ وہ سرکاری عہدہ داروں کے لیے Cavour سکول ہے۔ ایک ناقابلِ تغیر حقیقت پسند۔ جب وہ عوامی جلسوں میں بولتا ہے تو ہیجان انگیز تخلیقی صلاحیتوں کا حامل اور شرمندہ کرنے کی حد تک دوٹوک ہوتا ہے۔ کانگریس کے کسی اوسط درجے کے سیاست دان کے بیانیے کا ڈاکٹر امبید کر کی تقریر سے مقابلہ...... ایسا ہی ہے جیسا ہندوؤں کے بھجن کا گولیوں کی بوچھاڑ سے مقابلہ۔

اور کیوں یہ ''توقع کے مطابق تھا'' .... یہ اعصابیت .... یہ اشاریت .... کہ وہ ہر قسم کی جارحیت کو برداشت کرنے کے لیے تیار تھا؟ کیونکہ ڈاکٹر امبید کر ایک سو اسّی ملین کا سٹ ہندوؤں کی نگاہوں میں ''اچھوت'' تھا۔ ایک ایسا شخص جس کی *Mayfair* کی ڈنر جیکٹ اگر ان کی دھوتی سے چھو جاتی تو دھوتی کی پوترتا کو بھرشٹ کر سکتی تھی۔

ایک ایسی مخلوق جس کے سائے سے رجعت پسندوں کو اس طرح بچنا چاہیے، جیسے کسی کوڑھی سے بچا جاتا ہے۔ ایک راکشس، جس کے چھو جانے کے نتیجے میں انھیں قریبی تالاب کی طرف اشنان کے لیے دوڑ لگانی پڑتی ہے۔ صابن مَل مَل کر نہانا پڑتا ہے اور اس دوران بھگوان سے مسلسل پرارتھنا کرنی پڑتی ہے کہ وہ، ڈاکٹر امبید کر (ایم اے - انگلینڈ) کی غلاظت - ڈاکٹر امبید کر (ہائی آنرز، کولمبیا یونیورسٹی) کی رزالت - ڈاکٹر

امبید کر (بائیڈل برگ کی ممتاز شخصیت) کے طاعون اور تعفن کو ان کی پوتر اور امر روحوں سے دھو کر صاف کر دے۔

یہ ماضی کے کسی دور کی نہیں بلکہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ یہ کوئی دیو مالا، یا پریوں کی کہانی، یا خانہ بدوشوں کا گیت، یا خبروں کا کالم نہیں ہے۔

اچھوت تا، تاریخ انسانی میں، انسان کے ہاتھوں انسان کی تذلیل کی شرمناک ترین مثال ہے۔ جس کی جڑیں ہندو سماج میں ابھی تک بہت گہری ہیں اور اسے اکھاڑ پھینکنے کی اب تک کی گئی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ اگر گزشتہ پچاس برس کے دوران کہیں دس فی صد بہتری پیدا ہوتی ہے تو یہ تخمینہ بھی سراسر خوش فہمی پر مبنی ہے۔ انگلینڈ اور امریکہ میں لوگوں کی بہت بڑی تعداد گاندھی کے پروپیگنڈے کے نتیجے میں یہ گمراہ کن تاثر رکھتی ہے کہ یہ بیماری .... کیونکہ ہم اسے اور کیا کہہ سکتے ہیں؟ .... اب ختم ہونے کو ہے۔ وہ اس کی مذمت میں مہاتما کے بیانات پڑھ چکے ہیں اور ایسی تصاویر دیکھ چکے ہیں جس میں انھوں نے اچھوتوں کی گردن میں بانہیں ڈال رکھی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ گاندھی نے اپنے اخبار میں، جو ملک کے اعلیٰ اور متمدن طبقے میں پڑھا جاتا ہے، اچھوتوں کو "ہریجن"(1) کا نام دیا ہے۔ "یقیناً" .... وہ اپنے آپ سے کہتے ہیں "کتنی شاندار مثال ہے اور اس ترقی یافتہ زمانے پر ضرور اس کے مثبت اثرات مرتب ہونے چاہئیں۔"

لیکن ایسا نہیں ہے۔ جہاں تک گاندھی کے اچھوتوں سے دوستانہ رویے کا تعلق ہے۔ آیئے ڈاکٹر امبید کر کا مؤقف سنیں جو ان کا غیر متنازعہ لیڈر ہے۔ وہ مجھ سے کہتا ہے:

"ہندوستان کی تاریخ میں اچھوتوں کا سب سے بڑا دشمن ہی گاندھی ہے۔"

اس قضیے کو سمجھنے کے لیے موجودہ تاریخ کا تھوڑا سا علم ہونا ضروری ہے۔ لیکن اس سے قبل اچھوت پن کے قضیے کے متعلق اپنی یادداشتوں کو قدرے تازہ کرنا چاہیے۔

۲

اور اس کے بعد چند حقائق کی تصویر کشی کی جائے۔ جیسا کہ میکالے کا کوئی طالب علم بتا سکتا ہے کہ ہندو دھرم میں چار بنیادی طبقات ہیں۔

(1) ہریجن کے اصل معنی ہیں "خدا کے بچے" اب یہ لفظ اچھوتوں سے منسوب ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی حکومت کا اچھوتوں کے لیے مخصوص لفظ "Scheduled Classes" ہے۔

ان میں سرفہرست برہمن ہیں جو نسلاً لیکن عبادت گاہ کے بغیر مقدس لوگ ہیں۔ نہرو: ایک طوفان خیز اور زیرک ہندو۔ جس کی خود نوشت سوانح حیات اٹلانٹک کے دونوں طرف سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب ہے، ایک برہمن ہے۔ ...... اور دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس بات کو کبھی فراموش نہ کیا جائے۔ یہ چیز اس کی قدر و قیمت اور وزن میں اس کی نسبت زیادہ اضافے کا باعث بنتی ہے کہ وہ ہارورڈ اور کیمبرج سے تعلیم یافتہ ہے۔

سی آر راجا گوپال اچاری .... کانگریس کا سابق صدر، ہندو انتہا پسندوں اور انگریزوں کے درمیان سب سے بڑا رابطہ، بھی ایک برہمن ہے۔ .... اور ہندو ازم کے انتہا پسند دائیں بازو کا رہنما پنڈت مالویہ بھی۔ اس طرح کانگریس کے بیشتر کرتا دھرتا برہمن ہیں۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ برہمن، ہندوستان کی تاریخ میں وہی کردار ادا کر رہے ہیں جو قدیم ایتھنز کا انگلستان کی تاریخ میں تھا۔ بنیادی فرق یہ ہے کہ برہمنوں کے پاس وہ منظم کارکن نہیں ہیں جو انھیں ضابطے میں رکھ سکیں اور جب تک یہ اپنا رخ مسلمانوں کی طرف نہیں موڑتے، اپنے گوشواروں کے خود ہی مالک ہیں۔ (1)

دیگر تین طبقات کھشتری (سپاہی)، ویش (تاجر پیشہ) (گاندھی ویش ہیں) اور شودر (دہقان اور خدمت گار)۔ لیکن اس طبقاتی نظام کا تاریک ترین پہلو جو ذہن کو گہرائی تک متاثر کرتا ہے، وہ بے ذاتوں (Casteless) کا طبقہ ہے۔ اچھوت ...... تقریباً چھ کروڑ انسان ...... ہم نے اس طبقاتی حد بندی کو زبردستی سہل بنا دیا ہے، کیونکہ درحقیقت ان طبقات کی تعداد ڈھائی ہزار ہے۔ اپنے تمام ٹیبوز (taboos) .... سماجی روک ٹوک اور زندگی کے سادہ عمل کو دشوار ترین بنانے کی اختراع پسندی کے ساتھ، ذات پات کا یہ نظام ہندو سماج کے اُدھڑے ہوئے دھاگوں جیسا ہے .... کسی طرح کی ہم آہنگی کے بغیر .... آپس میں صرف خوف کے تاروں سے جُڑے ہوئے .... ایک دوسرے کا خوف .... مسلمانوں کا خوف۔ انگریزی قانون کا خوف .... اس بات پر بار بار زور دیا جاتا ہے کہ ذات پات کا یہ نظام قدیم تاریخ کا

(1) برہمن اپنے پُرشوکت مقام کے باوجود ہندوستان کی طویل ترین تاریخ میں کبھی اپنے آپ کو لوگوں کی محبتوں کے قابل ثابت نہیں کر سکے۔ ایک قدیم کہاوت جو آج بھی نئی ہے "اگر سانپ اور برہمن ایک ساتھ تمھارے سامنے آ جائیں تو پہلے برہمن کو ختم کرو"۔ یہ ردعمل غالباً ان کے حد سے بڑھے ہوئے مطالبات کے سبب ہے۔ مثال کے طور پر منو (Manu)، جس نے برہمنوں کے قوانین وضع کیے، کہتا ہے کہ کسی برہمن کو مورد الزام ٹھہرانا جرم ہے، خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہو۔

نہیں بلکہ دورِ جدید کا معاملہ ہے۔

بعض اوقات بہت سارے اعداد و شمار کے مقابلے میں ایک چھوٹی سی گھریلو مثال سے، کسی نکتے کی وضاحت زیادہ بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ یہ مثال۔

بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا، میں ایک فلیٹ میں مقیم تھا۔ ایک دن آیوڈین کی بوتل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ میرے پاس اُسے صاف کرنے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ چنانچہ میں نے ایک ملازم کو بلایا اور اس سے درخواست کی کہ کوئی پُرانا کپڑا لے کر اس داغ کو صاف کر دے۔ فلیٹ میں اس وقت پانچ ملازم تھے اور سب بالکل فارغ تھے۔ سو یہ کوئی غیر مناسب درخواست نہیں تھی۔ لیکن اس پر عمل نہیں کیا گیا۔ یکے بعد دیگرے وہ اندر آئے۔ اس داغ کو دیکھا اور ناگواری کے تاثرات کے ساتھ غائب ہو گئے۔ جب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو میں کچن میں گیا اور ایک چیتھڑا تلاش کر کے خود ہی وہ داغ صاف کر دیا۔

''مسئلہ کیا ہے تم سب کے ساتھ؟'' میں نے کپڑا واپس کرتے ہوئے ان سے پوچھا۔ انھوں نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈیڈو۔ (بھنگی-اچھوت) کھانا کھانے کے لیے باہر گیا ہوا ہے اور صرف وہی اس نشان کو صاف کر سکتا ہے۔ اگر وہ خود اسے صاف کریں گے تو یہ ان کی شان کے خلاف ہوگا اور اگر کہیں ڈیڈو کو اس بات کا پتہ چل گیا تو اس کی نظروں میں ان کی عزت کم ہو جائے گی۔

خدا جانے...... شاید بادی النظر میں یہ ایک فضول مثال معلوم ہو۔ مگر جب آپ اسے ہزاروں سے ضرب دیں تو یہ ''فضول'' ایک بنیادی مسئلہ بن جاتا ہے۔ نہ صرف ہندوستان کے لیے بلکہ پوری جمہوریت پسند دنیا کے لیے۔

۳

آیئے اب بہت اختصار کے ساتھ اچھوتوں کی زندگی پر غور کرتے ہیں جو منفیت کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔

یہ لوگ عوامی کنویں اور نلکے استعمال نہیں کر سکتے، سو ہر طرح کا گندا پانی پینا ان کا مقدر ہے۔ ان کے بچے سکولوں کے اندر داخل نہیں ہو سکتے۔ خواہ کیسا ہی موسم ہو، یہاں تک کہ برساتوں میں بھی، وہ سکولوں کے باہر بیٹھتے ہیں۔ وہ نہانے کے لیے مخصوص مقامات پر قدم نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ کسی ایسے گناہ کی پاداش میں، جو انھوں نے نہیں کیا، وہ نسلی طور پر غلیظ ہیں۔ مندروں تک کے دروازے ان پر بند ہیں اور ساری سزاؤں میں

یہ سزا سب سے کڑی ہے۔ کیونکہ ذلّت کی انتہاؤں پر جینے والے انسانوں سے اگر آپ ان کا مذہب بھی چھین لیں گے تو گویا آپ نے ان کی واحد تسکین اور تسلی بھی چھین لی۔

مجھے اعتراف ہے کہ گزشتہ چند برس کے دوران حکمرانوں اور سرکاری نمائندوں کی طرف سے اس سلسلے میں دو ایک ڈرامائی کوششیں کی گئی ہیں اور تمام لوگوں کو ذات پات کی تمیز کے بغیر مندروں میں داخلے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ لیکن عملی طور پر ہوتا کیا ہے؟ جونہی اچھوت مندر کے اندر داخل ہوتے ہیں، انتہا پسند باہر آ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مندر ''اچھوت مندر'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ وہ ناپاک اور نامقدس بن جاتا ہے۔ بلکہ کسی تعظیم سے اُسی طرح محروم ہو جاتا ہے، جیسے خود اچھوت محروم ہیں۔ [1]

ان پر لاگو تمام بندشوں میں یہ شامل ہے کہ نہ حجام ان کے بال تراشیں گے، نہ دھوبی ان کے کپڑے دھوئیں گے۔ وہ خود ایک ہی کام کر سکتے ہیں کہ گندگی کے ڈھیروں کو اُٹھا کر شہروں اور بستیوں سے باہر لے جائیں۔ یہ بوجھ وہ بید کی بڑی بڑی نوکریوں میں اپنے سر پر ڈھوتے ہیں۔ ان نوکریوں سے غلاظت مسلسل بہتی رہتی ہے اور ایک اچھوت مرد یا عورت کے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد آپ اس پر ایک نظر نہیں ڈال سکتے۔

آج بھی ہندوؤں کا یہ کہنا ہے کہ اچھوتوں کی اس زندگی میں ان کا اپنا قصور ہے۔ کیونکہ وہ اپنے پچھلے جنموں کے کرموں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ہم ان پر کیوں رحم کھائیں؟ اور اگر آپ ایک بہتر بستر پر پیدا ہوئے ہیں تو خود کو درست ثابت کرنے کے لیے یہ ایک سہل ترین اصول یا رویہ ہے۔

آپ کہیں گے ''اوہ- یہ تو ایک پُرانا قصہ ہے۔''

''واقعی یہ ایک پُرانا قصہ ہے۔'' ہم جواب دیتے ہیں ''لیکن یہ بہت نیا بھی ہے۔ یہ اتنا ہی پُرانا ہے جتنے یہ پہاڑ اور اتنا ہی نیا ہے جتنی ان پر پڑی ہوئی صبح کی شبنم۔ قبل مسیح سے چلتا ہوا طویل راستہ جو ۱۹۴۴ء تک آتا ہے۔''

چلیے۔ ہم ذاتی تجربات سے کچھ اور مثالیں جمع کرتے ہیں۔ ہر چند یہ معمولی مثالیں ہیں لیکن شاید یہ اُس پُر سوز مشقت کو سمجھنے میں ہماری کچھ مدد کر سکیں، جو یہ چھ کروڑ انسان زندگی کے بنیادی حقوق کو حاصل

---

(۱) اس رجحان کی بہترین مثال مدراس سے تین سو میل جنوب کی طرف میڈورا کے عظیم مندر کی ہے۔ ایک مرتبہ وزیرِ اعلیٰ راجا گوپال اچاری اس حد تک چلے گئے کہ انھوں نے سرکاری افسروں کے ایک گروپ کی رہنمائی میں اچھوتوں کو اس مندر میں داخل کر دیا۔ تب سے برہمنوں کی بہت بڑی اکثریت نے اس مندر میں قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔

کرنے میں اٹھاتے ہیں۔ جب آپ یہ الفاظ پڑھ رہے ہیں اس وقت بھی یہ مشقت جاری ہے۔

۴

پہلا سین۔ مغربی ساحل سے چند میل کے فاصلے پر ایک جزیرے پر ایک بنگلہ۔ برآمدے میں ہم ابھی ابھی کھانے سے فارغ ہوئے ہیں۔ ایک برٹش آرمی آفیسر کوڈرنک میں ہمارے ساتھ شریک ہونا ہے۔ اُسے ساحل سے جہاں وہ نوجوان ہندوستانی انجینئرز کے ٹریننگ کیمپ کا انچارج ہے پہاڑ کی چوٹی تک پیدل چل کر آنا پڑا ہے۔

''کافی مصروف دن گزرا؟''

''کافی پریشان کُن!'' وہ اپنے آپ کو کرسی پر گرا دیتا ہے۔ ''ریکروٹنگ میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔''

''کیا وہ ٹھیک نہیں چل رہے ہیں؟''

''اوہ۔ وہ ٹھیک چل رہے ہیں لیکن ہمیں ان کو پھر سے واپس بھیجنا ہے۔ ذرا اُدھر دیکھو۔'' وہ انگوٹھے سے اپنے کندھے کے اوپر اشارہ کرتا ہے۔ ہم دو ہندوستانی نوجوانوں کو یوکلپٹس کے سائے میں کھڑا دیکھتے ہیں۔ وہ زمین پر نظریں گاڑے ہوئے ہیں۔ یہ اچھی جسامت کے نوجوان ہیں اور اس طرح بنے ٹھنے ہوئے ہیں جیسے کسی پارٹی کے لیے تیار ہوئے ہوں۔

''ان لڑکوں کو دیکھا؟ یہ مجھے ملنے والے لڑکوں میں ذہنی اور جسمانی طور پر سب سے بہتر ہیں...... ہمارے معیار سے بھی بہتر .... یہ میری ٹیم میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ میں بھی انھیں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن کر نہیں سکتا۔''

''کیوں اس میں کیا مشکل ہے؟''

''وہ اچھوت ہیں......... بھنگی.........۔''

''لیکن یہ تو سخت بیہودہ بات ہے۔''

''بلاشبہ۔ لیکن یہ ہندوستان ہے! اگر میں نے انھیں شامل کر لیا تو باقی لوگ کام سے انکار کر دیں گے۔''

''لیکن......... یقینی طور پر.........'' میں نے تقاضا کیا۔ ''تم ان کے کمانڈنگ آفیسر کی حیثیت سے کچھ اختیارات رکھتے ہو؟''

''نہیں......... مجھے کوئی اختیار نہیں ہے......... کم از کم اس طرح کے معاملات میں.........

نہیں ...... کیونکہ......... ان کے آنے کی محض افواہ ہی سے وہاں سارا دن قیامت برپا رہی۔ کام سے رُوگردانی......... گستاخانہ رویہ......... اور احکامات کی بجا آوری سے انکار شروع ہو گیا۔ مجھے اپنے مؤقف سے دست بردار ہونا ہی پڑے گا۔ میں ایک اور انڈین میوٹنی کا آغاز کرنا نہیں چاہتا۔'' اس نے ایک ہی سانس میں اپنا ڈرنک ختم کر دیا اور ٹھنڈی آہ بھری۔ ''حماقت لگتی ہے۔ مجھے معلوم ہے۔'' اس نے کہا ''لیکن اس میں بدترین بات یہ ہے کہ ان لڑکوں میں ایک......... یہ سُن کر رونے لگا۔ بولا: ''آپ نے میرا دل توڑ دیا ہے.........'' میں نے؟ کتنا ہولناک لگتا ہے جب اس طرح کا مضبوط نوجوان تمھارے سامنے رونے لگے''...... وہ بے چینی سے ہنسا۔ ''ہو سکتا ہے میں ہی زیادہ محسوس کر رہا ہوں......... ہو سکتا ہے، وہ ہی کمزور دل ہو...... اوہ......... کیا مصیبت ہے......... بہرحال۔''[1]

دوسرا سین۔ جنوب مغرب کے دُور افتادہ علاقے میں ایک گاؤں۔ میں یہاں ایک مندر دیکھنے آیا تھا، جس کی خوبصورتی کا بہت چرچا تھا۔ میری مہم کامیاب ثابت نہیں ہوئی کیونکہ فنِ تعمیر کے اعتبار سے اس مندر کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور محض اس لیے مشہور تھا کہ اس کے نچلے حصے پر گولائی میں، انسانی اعضائے تناسل کے حیران کن فحش مناظر کندہ تھے۔

ایک امریکن خاتون بھی اس کے گرد تجسس کے تاثرات کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ اس اصول کے عین مطابق کہ حُسن کی طرح بُرائی بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ اُس نے جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، مجھے عمارت کی طرف کھینچا اور خالص حُسن پرستی کے نقطۂ نظر سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے سب سے نمایاں نقوش کی طرف اپنی چھتری کی نوک سے اشارہ کیا۔ اس سین میں ہر شخص اس طرح اُلٹ پلٹ اور درہم برہم تھا کہ اس پر، میرے خیال میں، ''سیکس ان جمنازیم'' کا لیبل ہونا چاہیے تھا۔ وہ اُسے سرد اور بے تاثر انداز سے گھورتی رہی......... ''یقینی طور پر جین اثرات'' اُس نے چیلنج کے انداز سے اعلان کیا۔ میں نے اس سے قبل اس موضوع پر ایسا تبصرہ کبھی نہیں سُنا تھا۔

میں اس فحش گشی سے مایوسی کی حد تک دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ چونکہ گرمی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا اس لیے خاتون نے اجازت چاہی......... اور بلاشبہ وہ بھی ''ریڈ لائٹ دھرم'' میں اپنی خلافِ عادت

---

(۱) اس کہانی کو مریضانہ حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کیا جا سکتا ہے۔ بہرکیف یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ جب فوج اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتی ہے تو ذات پات کے نظام کو ختم کرنے میں ایک مؤثر ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔ موجودہ جنگ میں تنظیم، رفاقت اور خاص طور پر خطرے کا سامنا کرنے کے مشترک احساس نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ جب یہ جوان واپس گھر کی طرف مارچ کرتے ہیں تو ہمیں باہر نکل کر یہ ولولہ انگیز منظر ضرور دیکھنا چاہیے۔

شمولیت سے تھک چکی تھی۔ لیکن میں گاؤں کو کھوجنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے اُسے مندر کے سائے میں کسی بوزنے جیسی سرخوشی کے پس منظر میں اور شاندار تنہائی میں ایک ہیولے کی طرح بیٹھا ہوا چھوڑا.......... اور کچی مٹی سے بنے ہوئے ایک جھونپڑے کی طرف چل دیا۔

وہ گاؤں کا سکول تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ ایک سو کے قریب ننھے منے بچے زمین پر بیٹھے، بلیک بورڈ کی طرف دیکھ رہے تھے، جہاں ایک نوجوان اُستاد کینیری زبان کے حروف لکھ رہا تھا۔ قطاروں میں بیٹھے وہ بچے کسی خوبصورت ترین تصویر کی طرح لگ رہے تھے۔ مٹیالے چہروں پر برف جیسی سفید آنکھیں، جو اُستاد کے ہاتھ کے ساتھ دائیں بائیں گھوم رہی تھیں.......... جیسے سیاہ کپڑے پر سنگِ مرمر کے کنچے.......... میں نے کھڑکی سے اپنا سر کھینچ لیا اور عمارت کے کونے کی طرف ایک چکر لگایا اور یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہاں بارہ چھوٹے چھوٹے بچے ایک بنچ پر بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے چپکے ہوئے، جیسے کسی چیز سے خوف زدہ ہوں۔

"وہ چھوٹے چھوٹے بچے وہاں کیا کر رہے تھے؟ کیا اُن کو سزا دی گئی تھی، یا کوئی اور معاملہ تھا؟"

مجھے اس کا جواب نوجوان ہندو گائیڈ سے ملا۔ "یہ اچھوت بچے ہیں۔" اُس نے رُکھائی سے کہا۔ میں نے ننھے بچوں کی طرف دیکھا، جو ایک دوسرے میں پیوست ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بے حد لاغر اور تقریباً ننگے تھے اور بہت صاف ستھرے بھی نہیں تھے۔ لیکن بہر حال وہ تھے تو معصوم بچے ہی! اُن میں سے ہر ایک "ایک دماغ" تھا۔ جیسا کہ اس معاملے میں کوئی جذباتی شخص کہے گا۔ غالباً کسی کو اس معاملے پر شور مچانا اور احتجاج کرنا چاہیے تھا۔ غالباً ان بچوں کو سکولوں میں داخلے کی اجازت ہونی چاہیے تھی.......... جو اس ملک میں اپنی حفاظت کے لیے قانون کے تمام تقاضوں کے مستحق تھے.......... لیکن کوئی کیا کر سکتا تھا؟ اگر کوئی اس واقعے کی رپورٹ کرتا تو نتیجے کے طور پر اس ٹیچر کی شامت آتی اور غالباً ٹیچر کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ اس معاملے کے ذمہ دار اندر بیٹھے ہوئے بچوں کے ماں باپ تھے!

سو میں ان ننھے اچھوتوں کو ان کی قسمت پر چھوڑ کر وہاں سے ہٹ گیا.......... جو اپنے کانوں کو ٹیچر کی کھڑکی سے اُمڈتی ہوئی آواز پر لگائے بیٹھے تھے.......... کبھی کبھی ان میں سے کوئی، اپنی پھٹی ہوئی کاپی پر کچھ لکھ لیتا تھا۔

ننھا ہندوستان.......... تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

تیسرا سین- پشاور میں ایک ڈنر ٹیبل۔ ڈرامائی شخصیات.......... پنڈت مالویہ اور بی".... قانون ساز کونسل میں حزبِ اختلاف کا ایک رہنما۔ سال ہے ۱۹۳۳ء کا...... اور پشاور جوش اور ہنگامے سے بھرا ہوا ہے۔ کیونکہ ایک عظیم کانفرنس ہو رہی ہے، جس میں ہندو سکھ اقلیت کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ عالی مرتبت بزرگ پنڈت کی خاطر تواضع کی ذمہ داری "بی" پر ہے.......... اور دونوں حضرات ایک دوسرے کی خوشنودی حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔

لیکن ڈنر پارٹی کامیاب ثابت نہیں ہوتی.......... کیونکہ...... پنڈت کچھ کھا پی نہیں سکتا۔ کیوں...... یہ ہم آگے دیکھیں گے۔

"بی" اس ڈنر کے سلسلے میں کافی مشکلات کا سامنا کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پنڈت گوشت نہیں کھاتا۔ اس لیے اس نے صرف پھلوں کا انتظام کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے صرف انھیں پھلوں کا انتخاب کیا تھا.......... جنھیں فطرت نے بیرونی آلودگی سے محفوظ رکھنے کا انتظام کر رکھا ہو...... مالٹے اور کیلے وغیرہ۔ اس نے اس سے بھی زیادہ احتیاط پسندی کا مظاہرہ کیا اور اس موقع کے لیے ایک بالکل نیا ڈنر سیٹ خریدا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر پنڈت کو ذرہ برابر بھی شبہ ہو گیا کہ اس پلیٹ میں کبھی گوشت کھایا جا چکا ہے تو بہت بُرا ہوگا، وہ حد سے زیادہ خوف زدہ ہو جائے گا اور آئندہ زندگی میں کبھی خود کو پوتر محسوس نہیں کرے گا۔

لہٰذا اب صورتِ حال یہ ہے.......... تازہ پھل.......... موٹے چھلکوں سے ڈھکے ہوئے.......... غیر استعمال شدہ نئی پلیٹیں...... بزرگ مہمان.......... میزبان کی خوشنودی کا خواہش مند...... کیلے یا کسی اور پھل کو ٹکٹکی لگا کر دیکھتے ہوئے..........

لیکن سب بے سُود...... وہ کیلا نہیں کھا سکتا...... کیونکہ...... کسی وقت...... کسی جگہ...... کسی طرح...... کسی شخص نے...... کسی چیز کو...... ہو سکتا ہے کہ چُھو لیا ہو اور اُسے اشدھ کر دیا ہو۔ وہ یہ خطرہ مول لینے کی جرأت نہیں کر سکتا...... وہ کافی بہادر ہے۔ لیکن اس حد تک نہیں۔ لہٰذا تمام اخلاقی تقاضوں کو بالائے طاق رکھنا ضروری ہے...... اور ڈنر...... ہم دہراتے ہیں.......... کامیاب ثابت نہیں ہوتا!

یہ کہانی غیر سنجیدگی سے سنائی گئی ہے کیونکہ پہلی نظر میں یہ مزاحیہ ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا یہ واقعی محض ایک مزاحیہ ہے؟

اُس وقت مالویہ کانگریس کا لیڈر تھا۔ وہ ہندوستان کی طاقت ور ترین شخصیات میں سے تھا...... اور

ہے...... وہ اس طرح کا آدمی ہے کہ...... اگر...... ہندوستان آزادی حاصل کرلیتا ہے تو انٹرنیشنل کانفرنسز میں، اپنے دیس کی نمائندگی کرنے میں معاون ثابت ہوگا۔ لہٰذا اس شدید رجعت پسند روّیے کو...... غیر سنجیدگی سے لینا...... موجودہ حالات میں بہتری کے امکان کو کم کرسکتا ہے۔

فرض کیجیے کہ ہم اس صورت حال کو مغربی تناظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ اس انتہا پسند ہندو مزاج کے ساتھ، ایک ایسی کانفرنس کا تصور کیجیے، جس میں چرچل، روزولٹ، سٹالن اور چیانگ کائی شیک شریک ہیں۔ نتیجہ کیا ہوگا؟

اجلاس کے دوران زیادہ تر وقت، ان میں زیادہ تر حضرات باتھ روم آتے جاتے رہیں گے۔ جس قلم سے روزولٹ نے دستخط کیے ہیں، اُسی سے دستاویز پہ دستخط کرنے کے بعد چرچل غسل کے لیے دوڑ لگائے گا۔ سٹالن، مجبوراً چیانگ کائی شیک کے ہاتھ سے چائے کا کپ لے گا اور پینے کے بعد غرارے کرنے کے لیے بھاگے گا۔ روزولٹ، مسلسل جراثیم کش سپرے کا تقاضا کرتا رہے گا۔ اور اس کانفرنس سے کسی بھی طرح کے تسلی بخش نتائج کا حصول کسی معجزے سے کم نہیں ہوگا...... کیونکہ آدھی سے زیادہ جنگی شرائط کرشن کے چرنوں میں بھینٹ کی جاچکی ہوں گی۔

ان تمام تر فروگزاشتوں کے باوجود۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مالویہ کسی حد تک ہمارے احترام کا مستحق ہے۔ انتہا پسند ہندو ہونے کے باوجود۔ اس نے اچھوتوں کے لیے جنگ لڑی ہے اور انھیں سینکڑوں کی تعداد میں ہندو سماج کا حصہ بنایا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُس کا دل بالکل صحیح راستے پر ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کے لیے سچی ہمدردی کے سبب وہ اپنے پُرکھوں کے دھرم کو چیلنج کرنے پر آمادہ ہوا ہے۔ وہ اپنے دھرم کے لیے برت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود ان لوگوں کی حمایت کرتا ہے جنھیں اس کے دھرم نے نیچ قرار دیا ہے۔ اس امر سے انکار، ظلم ہوگا کہ اس کہانی میں مالویہ کافی اچھے کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔

۵

ہم نے چھ کروڑ اچھوتوں کے رہنما ڈاکٹر امبیدکر کو یہ دعویٰ کرتے ہوئے چھوڑا تھا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اچھوتوں کا سب سے بڑا دشمن ہی گاندھی ہے۔ یہ بیان لوگوں کی اکثریت کے لیے کسی وحشت ناک جھٹکے سے کم نہیں ہوگا۔ کیونکہ گاندھی اچھوت تا کے نظریے کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا لگاتار دعویٰ کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے آشرم میں اچھوتوں کو جگہ دی ہے۔ انھوں نے ایک اچھوت بچے کو گود لیا ہے اور

واضح کرچکے ہیں: "میں اس کو ترجیح دوں گا کہ ہندو دھرم مرجائے بجائے اس کے کہ اچھوت تا زندہ رہے۔"

اس فقرے کی اکثر مثال دی جاتی ہے لیکن اتفاق سے یہ ایک بے تکی بات ہے کیونکہ اچھوت تا، ہندومت کا اسی طرح ناگزیر حصہ ہے جس طرح یہود دشمنی، نازیت کا۔ اگر اچھوت تا کے نظریے کو تباہ کرنے کی کوشش ہوئی تو یہ پورے اچھوت طبقے کی تباہی پر منتج ہوگی۔ کیونکہ ذات پات کا نظام ہی وہ سیمنٹ ہے جو ہندو دھرم کے حیرت انگیز پیچیدہ ڈھانچے کو بکھرنے سے بچائے ہوئے ہے۔

لیکن کم از کم گاندھی جی وہ بیان دیتے وقت ضرور مخلص تھے۔ پھر امبیدکر کا کیا مطلب تھا؟ ہم اس کی وضاحت ایک متوازی مثال سے کرتے ہیں۔ امبیدکر کے فقرے کو لیجیے اور "اچھوت" کی جگہ "امن" کا لفظ رکھ دیجیے۔ اب امن کے عظیم داعی لارڈ سیسل کو تصور میں لائیے جو کہہ رہا ہے۔ "دنیا کی تاریخ میں امن کا سب سے بڑا دشمن ہی گاندھی ہے۔"

عہد جدید کے شاندار امن پسند کے بارے میں ان الفاظ کے استعمال سے اس کا کیا مطلب ہوگا؟ ....اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مفعولی قسم کی مزاحمت...... جو گاندھی کی امن پسندی کی صورت ہے...... صرف انتشار، اور جارح قوت کی وقتی فتح کی طرف لے جاسکتی ہے۔ گویا نیچے گر جاؤ اور لوگوں کو اپنے اوپر سے پھلانگنے دو (جو جاپانیوں کے معاملے میں گاندھی کا نسخہ تھا) جو مجروح کے لیے مثال بننے کے بجائے جارح کے لیے مہمیز بنتا ہے۔

دراصل امن حاصل کرنے کے لیے آپ کو منظم، مضبوط اور طاقت کے استعمال کے لیے پوری طرح تیار ہونا چاہیے۔ "Mutatis Mutandis" درحقیقت اچھوتوں کے بارے میں امبیدکر کا خیال یہ تھا۔ وہ انھیں منظم اور مضبوط بنانا چاہتا تھا۔ وہ درست طور پر اس امر کو اہمیت دیتا تھا کہ اس مقصد کے حصول کے لیے انھیں علیحدہ انتخاب کنندگان فراہم کیے جائیں۔ اس طرح چھ کروڑ رائے دہندگان کی بھاری اکثریت اس پوزیشن میں ہوگی کہ جابروں سے اپنی شرائط منوا سکے۔

گاندھی نے شدت سے اس تجویز کی مخالفت کی "اچھوتوں کو علیحدہ انتخاب کنندگان فراہم کرکے" اُنھوں نے چیخ کر کہا "تم محض یہ کرسکتے ہو کہ ان کے موجودہ مقام کو ہمیشہ کے لیے قائم کردو۔" یہ ایک بے تکی دلیل تھی اور جو لوگ مہاتما کے افسوں میں مبتلا نہیں تھے۔ انھوں نے اسے بالکل جعلی قرار دیا۔ انھیں شبہ تھا کہ گاندھی اس خیال سے تھوڑے سے خوفزدہ تھے کہ چھ کروڑ اچھوت کہیں دس کروڑ مسلمانوں کے ساتھ نہ مل

جائیں (جو وہ تقریباً کر ہی چکے تھے) اور اٹھارہ کروڑ انتہا پسند ہندوؤں کو چیلنج نہ کر دیں۔ جب اس نوعیت کی
گستاخانہ تنقید ہوتی تو گاندھی پرانے ہتھکنڈوں پر اُتر آتے اور مرن برت رکھ لیتے۔ (ان کی بے ہوشی سے
صورت حال میں تبدیلی تو کیا ہوتی البتہ ان کی ڈھٹائی ثابت ہو جاتی)۔ اس سے ایک ہیجان کی کیفیت پیدا
ہوتی جو ان کے فاقے کے ساتویں دن کسی سمجھوتے پر ختم ہوتی۔ آج بھی اچھوت ان ہی انتخابی حلقوں میں
ووٹ ڈالنے جاتے ہیں، جس میں کاسٹ ہندو ووٹ ڈالتے ہیں لیکن اب صوبائی اسمبلیوں میں ان کے لیے
خاطر خواہ تعداد میں نشستیں مخصوص کر دی گئی ہیں۔ یہ نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔ لیکن اگر گاندھی مداخلت نہ کرتے
تو صورتِ حال اس سے کہیں بہتر ہوتی۔

یہی مطلب تھا ڈاکٹر امبید کر کا..........اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مؤقف درست تھا۔

٦

اور مستقبل؟

اس کا زیادہ تر انحصار انگریزوں پر ہے۔ اگر ہم کانگریس کے مطالبات کے مطابق عمل پیرا ہوں تو اچھوتوں کی حالت جوں کی توں رہے گی، بلکہ مزید خراب ہو جائے گی اور اگر یہ جوں کی توں رہتی ہے تب بھی ناقابلِ برداشت ہے۔

اس "نئے اندازِ نظر" کے بارے میں لاف وگزاف کے باوجود اور گاندھی کے روح پرور دعوؤں کے باوجود کتنے اچھوت یونیورسٹی ڈگری حاصل کرنے کے قابل ہو سکے؟ پانچ سو! پورے ہندوستان میں علم کی پوری تاریخ میں......چالیس کروڑ آبادی والے ملک میں.......... محض پانچ سو!

کانگریس.......... جو برہمنوں کے زیرِ اثر ہے، اس صورت حال میں تبدیلی کی کوئی خواہش نہیں رکھتی۔ یہ امر انتہائی توجہ کا حامل ہے کہ اچھوتوں کے معاملے میں اگر کہیں کوئی معمولی سی بہتری رونما ہوتی ہے تو ایسی ریاستوں میں جہاں کانگریس کا اختیار اور عمل دخل محدود ہے۔ مثال کے طور پر اس سلسلے میں میسور نے پورے ہندوستان میں ایک مثال قائم کی ہے۔[1] اگر ہم کانگریس کو آگے بڑھنے کا راستہ دے دیں تو تمام اچھوت نزدیک ترین گاؤں کی طرف بھاگیں گے اور ایک ساتھ کسی کنویں میں چھلانگ لگا دیں گے۔ اس

(۱) اگر کوئی طالب علم یہ جاننا چاہتا ہے کہ ایک باشعور اور تعلیم یافتہ حکمران اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہے تو اسے گورنمنٹ پریس بنگلور کی شائع کردہ کتاب "Harijan Uplift in Mysore" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

کنویں کا استعمال زندگی میں ان پر ممنوع ہے لیکن ممکن ہے کہ موت کے لیے وہ اسے استعمال کر سکیں۔

امبید کر نے مجھ سے کہا تھا کہ کرپس کی تجاویز ہمارے لیے موت کا پیغام ثابت ہوں گی۔ کچھ لوگ امبید کر کے رہنمائی کے حقوق کو چیلنج کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر وہ اس کے جلسوں میں شرکت کریں تو ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ جیسے مثلاً ناگپور کا شاندار جلوس، جہاں پچھتر ہزار اچھوتوں نے اس کا اس گرمجوشی سے استقبال کیا، جس پر گاندھی کو بھی رشک آ گیا۔

علاوہ ازیں اگر امبید کر کے کچھ مدِ مقابل تھے بھی...... جو نہیں تھے ...... تو ان میں سے شعور اور متانت کے حامل بہت سے افراد اس کے واضح اور تخلیقی نظریات کے حامی بن گئے۔ ہم اس سرسری جائزے کو میری ڈائری میں درج کچھ فقروں پر ختم کریں گے۔ جن سے اُس کے نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔ امبید کر نے مجھ سے کہا:

> "میری پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کا ذیلی حصہ نہیں ہیں بلکہ قومی زندگی کا علیحدہ اور خود مختار عنصر ہیں۔"

گاندھی کہتا ہے:

> "ہم پر اعتماد کرو...... کاسٹ ہندوؤں پر اعتماد کرو...... میں جواب دیتا ہوں...... ہم تم پر اعتماد نہیں کریں گے۔ کیونکہ تم ہمارے موروثی دشمن ہو۔"

"ہر گاؤں میں اچھوتوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت ہوتی ہے.......... میں ان تمام اقلیتوں کو جمع کر کے ایک بھاری اکثریت میں تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے تنظیم کا ایک زبردست عمل.......... آبادیوں کی منتقلی...... نئی بستیوں کی تعمیر...... لیکن اگر کرنے دیا جائے تو ہم یہ کر کے دکھا سکتے ہیں۔"

"ہم بھی اتنے ہی بڑے محبِ وطن ہیں جتنی کانگریس۔ لیکن ہم اس وقت تک انگریز کے ہندوستان چھوڑنے کے حامی نہیں جب تک ہمارے مفادات محفوظ نہیں ہو جاتے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ہماری بدقسمتی یورپ کی کسی مجبور و لاچار قوم کی بدقسمتی سے بڑھ کر ہوگی۔"

اب ایک ہوش مند آدمی کو یہ سوچنا ہے کہ ہمارا اخلاقی تعاون کس کے لیے ہونا چاہیے؟ گاندھی کے لیے؟ ایک کاسٹ ہندو کے لیے؟ جو مرن برت رکھنے کو اس پر ترجیح دیتا ہے کہ چھ کروڑ انسانوں کو متحد ہو کر علیحدہ تنظیم بنانے کا حق دیا جائے۔ کیونکہ ممکن ہے وہ کبھی اس کے لیے چیلنج بن جائیں؟ یا ہماری سپورٹ

ڈاکٹر امید کر کے لیے ہوگی؟ جس نے خود کو پستیوں سے نکالا اور عوام کے فتح مند نمائندے کی حیثیت سے اُبھرنے کے لیے توہین اور توہمات کی لامختتم سرنگ میں اپنا راستہ خود تلاش کیا؟

برطانیہ کی تاریخ کی تو یہ روایت نہیں رہی کہ عزت کا راستہ، ذاتی مفادات کے راستے سے مشابہ ہو...... لیکن ہندوستان کی موجودہ صورتِ حال یہی ہے۔ یہاں صرف ایک ہی راستہ ہے جس پر چل کر ہم اپنے ساتھ ساتھ پسماندہ طبقات کی مدد بھی کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ ہم اسی راستے پر پیش قدمی کریں گے۔

☆☆☆

چوتھا باب

طوفانی شمال

''اب یہ زیادہ دیر نہیں رہے گا۔''

''مجھے امید نہیں'' درد بتدریج ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

''ممکن ہے وہ بھلا آدمی ہو...... یہ دیہاتی ڈاکٹر ہمیشہ اچھے ہی ہوتے ہیں۔''

ایک ملازم لالٹین اُٹھائے ہوئے آیا اور اسے کیمپ بیڈ کے ساتھ میز پر ٹکا دیا۔

''کیا یہ لوگ روشنی کا اسی قدر انتظام کر سکتے ہیں؟''

''بدقسمتی سے!''

''فرض کرو...... آپریشن کرنا پڑے...... پھر؟''

''مایوسی کی باتیں مت کرو۔''

''اچھا...... اس لعنتی چیز کو دیکھو تو......''

وہ لعنتی چیز میرا پاؤں تھا، جس کی طرف دیکھنا کوئی خوشگوار عمل ہرگز نہیں تھا۔ میری ایڑی پر ایک جامنی رنگ کا پھوڑا تھا، جس میں بُری طرح پیپ پڑی ہوئی تھی۔ اور اس کا زہر ٹخنے تک پھیل چکا تھا۔ اگر کوئی گوشت پر انگلی سے دباتا تو وہاں ایسا نشان پڑ جاتا جیسے کسی نے لئی میں انگلی ڈبو دی ہو۔ اس کے باوجود ہسپتال والوں نے مجھے صحت مند قرار دے کر ایک ہفتہ پہلے چھٹی دے دی تھی...... ایک قلم کار...... اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہو تو اپنے درد و غم فروخت کے لیے عوام کے سامنے نہ رکھتا۔ یہ ہماری اپنی ذات تک محدود ہوتے ہیں۔ بہرحال۔ چونکہ یہ کتاب زیادہ تر ذاتی مشاہدات اور واردات کا مجموعہ ہے، اس لیے اس علالت کی تفصیل سے گریز ممکن ہی نہیں۔ جس نے مجھے پورے چار ماہ تک مختلف قسم کے آپریشنوں اور دردناک صورتِ حالات سے دوچار رکھا۔

اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ اس عرصے میں مجھے اس ملک اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی۔ ''مدر انڈیا'' سے شہرت یافتہ، کیتھرین میو نے ہندوستان کے ہسپتالوں کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔ لیکن اگر اس کا واسطہ ان ہسپتالوں سے اس حد تک پڑتا، جس حد تک اندرونی طور پر مجھے

ان سے واسطہ پڑا تو شاید وہ اپنی چند آرا کو تبدیل کرنے پر مجبور ہو جاتی۔ اس کے پاس میڈیکل کے پیشے کے بارے میں لکھنے کو کچھ سمجھداری کی باتیں تھیں۔ مگر اس کے بیانات زیادہ اثر انگیز ہوتے .... اگر وہ میری طرح خون کی تھیلی کے ساتھ، سٹریچر پر اوپر سے نیچے دھکیلی جاتی یا بمبئی کی ایمبولنس میں مذہبی رسومات کے جلوسوں کے درمیان سے گزاری جاتی اور ان مذاہب کے ماننے والے اُسے محض ''بھینٹ'' گردانتے۔

ہم ان صفحات میں سِک روم سے باہر رہنے کی مقدور بھر کوشش کریں گے۔ لیکن ہمیں کبھی کبھی حادثاتی طور پر اس میں اس لیے داخل ہونا پڑے گا کہ ہم وہاں سے کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

۲

اچانک ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سِک روم میں کوئی قابلِ دید منظر نہیں ہے۔ کچھ بھی ایسا نہیں ہے جسے ڈاکٹر کے انتظار کے دوران بیان کیا جا سکے۔

ہم شمال مغربی سرحدی علاقے میں پتھر سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے قلعے میں ہیں۔ دہلی (جسے ہم نے دو ہفتے پہلے پشاور کے ہسپتال تک پہنچنے کے لیے چھوڑا تھا) چھ سو میل دور جنوب میں، گرمی سے نڈھال میدانوں میں رہ گئی ہے۔ یہاں ٹھنڈک ہے، دھند لکا چھا رہا ہے اور پوری وادی پر ایک قرمزی دھند پھیلی ہوئی ہے۔ سارا منظر رومانوی ڈرامے جیسا ہے۔ ستر میل دُور مغرب میں افغانستان کی وحشی بیرونی چوکیاں ہیں۔ سیدھے یکساں میدانوں سے آگے، شمال میں، نوکیلے پہاڑوں کا سلسلہ اُبھرتا ہے۔ دن میں خاکستری۔ رات میں اودا۔ پرت کے اوپر پرت۔ کسی تھیٹر کے فلیٹس کے سلسلے کی طرح۔ یہ اُس وسیع زینے کی ابتدائی سیڑھیاں ہیں، جو ہمالیہ سے ہوتے ہوئے دنیا کی چھت تک پہنچتا ہے۔ بہت نشیب میں دریائے سوات کی دھمک مسلسل گونج رہی ہے جو عظیم دریائے سندھ سے جا ملنے کی جلدی میں ہے۔ سندھ۔ جس کی وادیاں کبھی قبل از تاریخ زمانوں میں حملہ آوروں کی پیش قدمیوں کے سبب جھنجھنا اُٹھی تھیں۔ اگر ہم مسیح کی پیدائش سے تین سو ستائیس سال قبل اس قلعے کے سامنے کھڑے ہوتے تو نیچے وادی میں ایک فوج کو جمع ہوتے ہوئے دیکھ سکتے تھے .... فخر سے آگے بڑھتے ہوئے .... لاتعداد فتوحات کے غرور میں .... کلغیاں سجائے .... آہنی خود پہنے .... ''وحشی قوموں'' کے لیے ایک سنسناتا ہوا خوف۔ سکندرِ اعظم کی فوج۔ لیکن شمال کی طرف سے آنے والے بھوکے گروہوں میں، جو پہاڑی راہداریوں سے نکل کر زہریلی آندھیوں کی طرح، جنوب کی نرم و ملائم ثقافت کو جلانے اور ریزہ ریزہ کرنے کے لیے پھیلے .... سکندر پہلا نہیں تھا

.... نہ کسی حساب سے آخری ہو سکتا تھا۔ کیونکہ صرف کل تک .... کیونکہ ہندوستان کی تاریخ میں سو برس کا عرصہ کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ راہداریاں حملہ آوروں کی دائمی اشتہا کے لیے کھلی پڑی تھیں۔

لیکن اب یہ ایک مختلف کہانی ہے۔ فرض کیجیے آج ہم اس کہانی کا کچھ حصہ سناتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوگا کہ اپنی گھڑیوں کو کچھ روز پیچھے لے جایا جائے۔ لیکن ہماری دسترس میں کافی وقت ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر کو یہاں پہنچنے کے لیے ایک طویل راستہ طے کرنا ہے اور سڑکیں ناہموار ہیں۔

۳

میں شمال مغربی سرحدی علاقے میں دو وجوہات کی بنا پر آیا تھا۔ پہلی وجہ، جذباتی طور پر یہ تھی کہ یہ ہندوستان کا سب سے آتش فشاں علاقہ تھا۔ یعنی جب سرحدی لوگوں کے جذبات آخری حد تک اُبلنے اور پھٹ پڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے .... تب بھی بغاوت کی دبی دبی بھنبھناہٹ اور گونج سنائی دیتی رہتی تھی .... کیوں؟ .... میں جاننا چاہتا تھا کہ اس میں کس کا قصور تھا۔ ہمارا؟ .... یا یہاں کے مخصوص مزاج کا .... یا معاشیات کا؟ .... یا پھر مذہب کا؟

دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے دہلی میں بتایا گیا تھا کہ سرحدی علاقہ بیس برس قبل کے مقابلے میں اب نسبتاً پُرسکون ہے۔ میرے لیے اس لحاظ سے بھی جاننا سود مند تھا کہ وہ اب کیوں پُرسکون ہے؟ اور اس کا کریڈٹ کسے جاتا ہے؟ ہم نے اپنا رویہ تبدیل کیا یا انھوں نے؟ معاشی حالات بہتر ہو گئے کہ مذہبی تعصب ختم ہو گیا؟ یہ فرض کرنا عقل مندی کا تقاضا تھا کہ اگر کوئی ہندوستان کے سب سے بیمار حصے میں جا کر مقامی سطح پر سوزش کا احتیاط سے جائزہ لے تو یقینی طور پر پورے جسم کے مرض کی صحیح تشخیص ممکن ہے۔

سو میں نے سیاحوں کی سب سے یقینی جائے اجتماع، یعنی درۂ خیبر سے آغاز کیا۔ ہم ایک ساتھ اس کی اونچائی تک ایک چھوٹا سا سفر کریں گے اور ممکن ہے کہ واپسی تک کچھ اہم باتیں جان چکے ہوں۔

خیبر جا کر بڑی شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں تمدن کی اوپری سطح بے حد باریک ہے۔ آپ پشاور کے کنٹری کلب میں لنچ کر رہے ہیں۔ ارد گرد شوخ ملبوسات میں خوبصورت عورتیں ہیں۔ ایک مختصر لیکن چُست آرکسٹرا قبل از جنگ کے زمانے کا جاز بجا رہا ہے۔ محض ایک گھنٹے کے بعد آپ بہت دُور پہاڑوں میں ہیں۔ دنیا کے سب سے سنگ دل علاقے میں .... نوکیلا اور دغا باز۔

جس سڑک پر آپ تیز رفتاری سے جا رہے ہیں وہ خطرے اور موت کے خون آلود دھاگوں سے بُنا

ہوا حفاظت کا ایک باریک سافیتہ ہے اور شام کی چائے سے پہلے آپ ہندوستان کے اختتام پر ہیں۔ اس گیٹ کے سامنے جو افغانستان کی طرف جانے والی سڑکوں پر رکاوٹ بنا کھڑا ہے۔

ہندوستان کا اختتام .... یہاں یہ اعتراف ضروری ہے کہ .... اینٹی کلائمکس جیسا ہے۔
لوہے کی نالی دار چادروں سے بنے ہوئے چھپروں کا ایک جوڑا .... بیرونی عمارتوں کا ایک سلسلہ
.... کسٹم اور پاسپورٹ کے دفاتر .... اور پانچ سلاخوں والا ایک گیٹ۔
جب گیٹ کھلتا ہے تو ایک کتا نیم دلی سے بھونکتا ہے .... اور بس .... آدمی سوچتا ہے
کہ ایسے دیو مالائی دیس کے داخلی راستے کو ذرا سا زیادہ متاثر کن ہونا چاہیے۔

درہ خیبر تک میرا گائیڈ ایک نوجوان افسر تھا جو قبائلی علاقے میں اپنی ملازمت کے چار برس پورے کر چکا تھا۔ کپلنگ اور ہالی ووڈ کا شکر گزار ہونا چاہیے، جن کی وجہ سے درہ خیبر پہلی نظر میں حیران کن حد تک مانوس معلوم ہوا۔ معروف سائن پوسٹ نے ہمیں پُرانے دوستوں کی طرح خوش آمدید کہا۔ خیبر کی دہلیز پر جو سائن پوسٹ قائم کی گئی تھی۔ اس پر اَن پڑھ لوگوں کی سہولت کے لیے، ہائی وے کی طرف موٹر کار کی اور اونٹوں کے لیے مخصوص ٹریک پر اونٹ کی تصویر لگی تھی۔ کوئی لفظ نہیں .... صرف تصویریں .... کیونکہ الفاظ کا کیا مصرف ہے۔ اُن کے لیے بھی جو پڑھنا جانتے ہیں؟ .... خیبر زبانوں کا بابل ہے (جہاں ساری زبانیں خلط ملط ہوگئی ہیں) ان کی ترتیب کے لیے ایک میل کی بلندی پر ایک اور چیک پوسٹ ہونی چاہیے۔ یہ وہ نکتہ ہے جس پر ہندوستان کے "اتحاد" کی بات کرنے والوں کو ایک لمحے کے لیے ضرور غور کرنا چاہیے۔

میں ہمیشہ سوچتا تھا کہ دنیا کا وہ حصہ جس پر خدا نے یقینی طور پر لعنت بھیجی ہے، بحیرۂ مردار کے طاس کا علاقہ ہے .... جہاں کی زمین حنوط شدہ لاش کے چہرے کی کھال سے مشابہ ہے اور ہوا دہانۂ جہنم سے کھینچی ہوئی سانس کی طرح بوجھل ہے۔ لیکن خیبر کا لعنتی پن اس سے کہیں زیادہ عذاب ناک ہے۔ بحرِ مردار کو تو خدا نے فراموش کر دیا لیکن خیبر وہ جگہ ہے جس کو اس نے یاد رکھا اور پورے قہر کے ساتھ یاد رکھا۔ یقیناً ان چٹانوں کو کبھی جنات نے طیش کے عالم میں مروڑ کر رکھ دیا ہوگا .... ان چٹانوں نے پہاڑی علاقے سے جو جھاڑیاں اور گھاس مستعار لی تھی وہ اس قدر ناکافی تھی کہ وہ تقریباً ننگی نظر آتی تھیں۔ یہاں تک کہ کچھ فاقہ زدہ بکریاں بھی اس گھاس سے اپنا پیٹ بھرنے سے قاصر تھیں۔

جوں جوں ہم بلندی پر پہنچے، گہرے ویرانے میں تہذیب کے جو آثار نظر آئے .... اگر یہ

زیادہ طنزیہ نہیں ہے تو .... خیبر کے وہ دفاعی حصار تھے جو انگریزوں نے تعمیر کرنا شروع کیے تھے اور ابھی تک تکمیلی مراحل میں تھے۔ چٹانوں میں اسلحہ اندوزی کے بہت سے مقامات تھے .... دام .... جو فقط ٹینکوں کے لیے ہی نہیں بچھائے گئے تھے بلکہ اس قسم کے تھے کہ بے حد متحرک پہاڑی فوجی دستوں کو روکنے کی اہلیت بھی رکھتے تھے اور اس معاملے میں کسی امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تھا۔ جیسے ہی ایک خطرناک موڑ مُڑے .... ہم ایک سیدھی چوٹی پر تھے جہاں سے دروازوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیتا تھا .... جو ایک زمین دوز ہسپتال کی طرف جاتا تھا۔ اس ہسپتال میں علاج کے جدید ترین آلات موجود تھے۔

جی ہاں .... خیبر پوری طرح تیار نظر آتا ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں۔ کس دشمن سے مقابلے کے لیے؟ لیکن ان دنوں جب بین الاقوامی رواداری ایک مرتبہ پھر اپنا وجود قائم کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اس طرح کے سوالات قطعی طور پر سُودمند نہیں ہیں۔

"جھلسا دینے والی خشک سالی اور غضب ناک سیلاب
گرد آلود مہینے اور کیچڑ بھرے دن
یکسانی اور خون کی آمیزش"

میرے گائیڈ نے یہ لائنیں سنائیں .... ہم تیز ہوا سے بچنے کے لیے ایک گھاٹی کے سائے میں ذرا دیر کے لیے رُکے تھے۔ یہ جگہ پُرانے وقتوں کی خاموش فلموں میں دکھائے جانے والے شیطانوں کے شہنشاہ کے دربار کی طرح تھی۔ "گرد اور کیچڑ۔ ٹھیک .... لیکن خون کیوں؟" یہ جگہ میری تفتیش کی شروعات کے لیے کسی بھی جگہ سے بہتر تھی۔ اس معاملے کی تفتیش کہ سرحد کی نہ ختم ہونے والی بے چینی کا سبب کیا تھا؟ .... یہ تمام خون خرابہ کیوں؟ .... کیا یہ قبائل اپنے لڑائی جھگڑے کبھی ختم نہیں کریں گے؟ .... جب ان کی فائرنگ کا رُخ ہماری طرف نہیں ہوتا تو خود اپنی طرف ہوتا ہے اور عموماً دونوں کی طرف .... اگر ہم انھیں نہیں روک سکتے تو کیا کسی اور طاقت کو اس کے بہتر مواقع حاصل ہیں؟ .... کیا گاندھی یہ کر سکتا ہے؟ .... وہ بے ساختہ ہنسا۔ "میرا خیال ہے اگر آپ ان علاقوں میں پہلی بار آئے ہیں تو یہ پوچھنا بے کار ہے۔ کیا آپ واقعی جاننا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ہمیشہ کیوں برسرِ پیکار رہتے ہیں؟ تو اس کی دو وجوہ ہیں۔" اس نے کچھ توقف کیا اور ایک سگریٹ سلگائی۔ "دوسری وجہ" اس نے کہا "معاشی ہے .... لیکن پہلی قدرے زیادہ اہم ہے .... اور وہ ہے .... کھیل تماشا۔"

''کھیل تماشا'' .... کون جان سکتا ہے کہ اس کا مطلب دراصل کیا تھا؟ وہ جنگ برائے جنگ کے لیے ان کی ہیجان انگیز محبت کی طرف اشارہ کر رہا تھا........ قدیم انسان کے وحشیانہ جذبات کی طرف .... بلاشبہ یہ فقرہ کسی دھچکے سے کم نہیں تھا........کھیل تماشا ....

یہ ایسے کسی بھی خانے میں پورا نہیں آتا جن میں ماہرین، جنگ کے مبدیات کے بارے میں اپنے پسندیدہ نظریات رکھتے ہیں۔ اس میں توقیر کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ اس کے بارے میں کسی طرح کے اعداد و شمار جمع کرنا ناممکن ہے۔ وہ طے شدہ اعداد و شمار، جو طے شدہ نظریات کی تصویر کشی کے وقت جب صفحۂ قرطاس پر درج کیے جائیں تو بے حد مدلل ہوں۔ نظریۂ معاش........نظریۂ آزادی........نظریۂ اقوام........ اور خدا جانے کیا کیا۔ جو شخص ان قابلِ احترام عنوانات میں حصہ بٹانے کا ارادہ رکھتا ہو وہ اس میں ''کھیل تماشا نظریے'' کا اضافہ کر سکتا ہے۔

یہ بظاہر تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی بچہ کلاس میں لغو باتیں کر رہا ہو لیکن اگر وہ اسے طویل الفاظ کا لبادہ پہنا دے تو ماہرین ضرور اس پر کان دھریں گے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ اسے ''نفسیاتی نظریہ'' کہنے لگیں گے اور اس کے ساتھ مشینی عہد کی یکسانیت کے خلاف قیدی انا کی بغاوت کا ایک طویل ضمیمہ ہوگا۔ بہر حال......کھیل تماشا .... مختصر ہے اور درحقیقت زیادہ بامعنی بھی۔ خاص طور پر شمال مغربی سرحدی علاقے میں۔ کیونکہ سرحدی آدمی کا واسطہ کبھی مشینی عہد سے نہیں پڑا، جس کے خلاف وہ ردِعمل کا اظہار کر سکے........ جو واحد مشین اس کے لیے شدید اہمیت کی حامل ہے .... وہ اس کی رائفل ہے۔ وہ اُسی میں شان و شوکت کے آثار دیکھتا ہے۔ اس کی ساخت کی خوبصورتی کے باعث نہیں بلکہ اس لیے کہ یہ ایک جادو کی چھڑی ہے جس کے ذریعے وہ ذاتی تاثرات کا اظہار کر سکتا ہے۔ ان تاثرات کا، جن سے وہ آشنا ہے .... اور انسانوں کو اپنا اظہار ضرور کرنا چاہیے۔ ایک طرح سے یا دوسری طرح سے۔ قلم سے، ہل سے، یا بندوق سے۔ ورنہ وہ مٹ جائیں گے۔

''سر! کیا مجھے ایک مہینے کی چھٹی مل سکتی ہے تاکہ میں جا کر اپنے کزن کو قتل کر سکوں؟'' ہو سکتا ہے کہ یہ سوال اتنے صاف الفاظ میں نہ ہو لیکن ان علاقوں میں انگریز افسروں کے سامنے ان کے پٹھان فوجیوں کی طرف سے پیش کی جانے والی بہت سی مہذبانہ درخواستوں کی بنیاد اسی پر ہوتی ہے۔

''پٹھانوں کی زبان میں ''کزن'' کا مطلب ہے دشمن'' .... میرے دوست نے کہا ''اس

طرح کے سوال پر کوئی افسر کیا کرے؟ عام طور پر بہترین فوجی ہی بدترین خاندانی رقابتوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ''فرض کیجیے میں کہتا ہوں ''نہیں تمھیں کسی صورت بھی چھٹی نہیں مل سکتی۔ تم یہاں ٹھہرو گے اور ان شیطانی خیالات کی پاداش میں فالتو ڈرل کرو گے۔'' تو کیا ہوتا ہے؟ وہ آدمی غائب ہو جاتا ہے اور اپنی رائفل ساتھ لے جاتا ہے اور اس کا مطلب ہے کہ ایک اور اچھا آدمی ہاتھ سے جاتا رہا اور آپ کے لیے گہری شاموں میں پریشانی کا ایک اور سبب پیدا ہو گیا۔''

''کیا پٹھان کسی بھی طرح کے ضابطۂ اخلاق کو نہیں مانتے؟''

''میرے خدا! کیوں نہیں مانتے؟ اگرچہ میرے خیال میں آپ اسے ضابطۂ اخلاق کے بجائے ضابطۂ عزت کہیں گے۔ اس ضابطے کو تین الفاظ میں بہتر طور پر بیان کر سکتے ہیں۔ نانا وتی........ مل ماتی .... بدرگ........ پناہ دینے والا........مہمان نواز........ قابل اعتماد .... اگر کوئی شخص ان ضابطوں کے کسی ایک حصے کو توڑ دیتا ہے تو وہ سچا پٹھان نہیں ہے۔ جہاں تک ان کی عورتوں کا تعلق ہے .... ان کی زندگیاں غالباً دنیا میں سب سے زیادہ محتاط اور پاک صاف ہیں۔ ایک پٹھان اپنی بیوی کو بدچلنی کے شبے میں موت کے گھاٹ اُتار سکتا ہے اور ایسا اکثر ہوتا ہے۔''

''لیکن کیا ہمیں اس طرح کی چیزوں کی روک تھام نہیں کرنی چاہیے؟''

''روک تھام؟'' وہ ہنسا۔ کسی قدر تلخی کے ساتھ۔ ''روک تھام؟ کیسے؟ کس چیز سے؟ دس لاکھ کی فوج کے ساتھ؟ پانچ لاکھ گستاپو کے ساتھ؟ کیا آپ کی یہ تجویز ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ جیتے گا کون؟ اور یہ فوج اور گستاپو ہرگز نہیں ہوں گے۔''

جب اس نے یہ کہا تو مجھے ان چار قاتلوں کے چہرے یاد آئے جو اُس ہسپتال میں جس سے مجھے خوش قسمتی سے جلد نجات مل گئی تھی، میرے ہمسائے رہے تھے (شاید آپ کو یاد ہو کہ ہم ان سے اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں مل چکے ہیں)۔ ان کے بارے میں مجھے سب سے پہلے نائٹ نرس نے بتایا اور پوچھا کہ کیا میں ان سے متعارف ہونا پسند کروں گا۔ ''انھیں پھانسی نہیں ہوگی۔'' اس نے کہا ''اس لیے تم ان کے بارے میں بُرا محسوس نہ کرو۔'' دوسرے روز میں وہیل چیئر پر ان کے وارڈ میں گیا۔ جہاں وہ اپنے اپنے بیڈز پر پڑے تھے اور ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی تھیں۔ وہ ان محافظوں سے گپ شپ میں مصروف تھے جو ان پر سنگین تانے کھڑے تھے۔ وہ تمام جوان آدمی تھے اور سب کے سب بہت خوش شکل تھے

.... دونوں اعتبار سے خوش شکل .... کیونکہ وہ دلکش نقوش کے حامل تھے اور ان نقوش سے ان کی روحوں کی نیکی جھلکتی تھی .... اور وہ سب کے سب محبت یا عزت کی خاطر اس حال کو پہنچے تھے۔

ایک کے چچا نے اس کے ایسے دوست کا مال چوری کر لیا جو اس کی چھت کے نیچے پناہ گزیں تھا .... ایسے چچا کے ساتھ کیا کیا جا سکتا تھا، سوائے قتل کرنے کے؟

دوسرے کی بیوی ایک ہندو طائر فروش کے ساتھ بغل گیر تھی۔ فاختاؤں کے شکاری کو آخر سانس لینے کی اجازت کیسے دی جا سکتی تھی؟

باقی دونوں کے جرائم کا تعلق جنسی کجروی سے تھا۔ اگرچہ ان علاقوں میں ہم جنس پرستی اس قدر عام ہے کہ اسے کجروی قرار دینا، زیادتی کے مترادف ہوگا۔

"جب بھی ہماری رجمنٹ میں کوئی قتل ہوتا ہے۔" ایک عمر رسیدہ تجربہ کار کرنل نے مجھ سے کہا "ہم قاتل کی تلاش کا آغاز ہمیشہ کسی لڑکے سے کرتے ہیں۔" "یہ Cherchez la famme کا پٹھان نقطۂ نظر ہے۔"

ان چار جوشیلے نوجوانوں کے چہروں کے ساتھ مجھے ان وارڈز میں طرح طرح کے چہرے نظر آئے .... مسکراتے ہوئے، فکرمند یا روتے بسورتے ہوئے .... اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی بیماری میں ان کا اپنا کوئی قصور نہیں تھا .... پھر بھی وہاں زیادہ تعداد گولیوں سے چھلنی، یا چاقوؤں سے کٹے ہوئے لوگوں کی تھی۔ نو نو سال کے بچے جو وقت سے پہلے بڑے ہو چکے تھے اور خاندانی رقابت میں گھسیٹ لیے گئے تھے۔ بارہ بارہ برس کے نوجوان جن کے نزدیک طعنے کا جواب فقط چاقو کا وار تھا۔

روک تھام؟ اس سے کہیں زیادہ مناسب ہوگا کہ آپ دریائے سندھ کو سمندر کی طرف بہنے سے روکنے کی کوشش کریں۔

زیادہ سے زیادہ جو آپ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس وحشی انسانی طوفان کو مناسب حدود میں رکھیں اور اس طرح یہ لامختتم جدوجہد چل رہی ہے۔ سال آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ قوانین بننے چاہئیں۔ گشتی پولیس کو متحرک رہنا چاہیے۔ سر سے پاؤں تک مسلح سکاؤٹس اور ملٹری۔ سرحدی کانسٹیبلری اور قبائل۔ ملک، خضدر اور بدرگ[1] شخصیت کی طاقت کو نرم رو بنانا دنیا کی عظیم ترین تحریکوں کو، کسی فرد کی ذاتی جدوجہد کے بجائے معاشی معاملات سے منسوب کرنا تاریخ نویسی کا جدید ترین طریقہ کار ہے۔

(۱) "North-West Forntier" نامی کتاب کے مصنف J.M. Ewart تھے جسے لندن بک کمپنی پشاور نے شائع کیا۔

اس طریقہ کار کو انتہائی حد تک لے جایا جا سکتا ہے .... جب تک ہم سے یہ سوال نہ کیا جائے کہ کیا نپولین کے بغیر کسی آسٹرلٹز کا یا سٹالن کے بغیر سٹالن گراڈ کا وجود ممکن ہے؟

یقینی طور پر، کوئی شخص خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، انسانیت کے بہائے ہوئے دھاروں کو مخالف سمت میں نہیں موڑ سکتا .... لیکن وہ ان کی روانی میں حیرت انگیز کمی یا اضافہ کر سکتا ہے .... تعصبات کے ڈیم کھڑے کر کے یا ایسی نہریں کھود کر جن سے عظیم انسانی صحراؤں کو سیراب کیا جا سکتا ہے۔ یہ غیر صحیح بھی ہوگا اور غیر فنکارانہ بھی کہ محض اجتماعی طاقتوں کا تجسیم کردہ گردان کر .... تاریخ کے نپولینوں کو چھوٹا کیا جائے .... کیونکہ یہ لوگ ان طاقتوں کی خود تخلیق کر سکتے ہیں۔ .... جس بگولے کو یہ آزاد کرتے ہیں ان کے اپنے دلوں میں اس کا طوفان برپا ہوتا ہے۔

ہندوستان میں بار بار یہ سبق ملتا ہے۔ گاندھی یقیناً ایک روایتی ہندو ہے اور یہاں کھیتوں، بازاروں اور مندروں میں ہزاروں، لاکھوں گاندھی ملتے ہیں .... اس معمولی سے فرق کے ساتھ کہ گاندھی ایک تخلیقی فنکار ہونے کے خبط میں مبتلا ہے۔ "کھیل تماشا نظریہ" جس کی ہم نے ابھی تشریح کی ہے، ان لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا، جن کا مقصد انسانی داستان میں سے خون نچوڑ کر تاریخ کے اوراق رقم کرنا ہے .... یوں جیسے وہ کوئی بھی کھانا تیار کر رہے ہوں۔ کیونکہ اس طرح مزاجوں کے بجائے حقائق حاصل ہوتے ہیں۔ اور .... ہمیں اعتراف ہے .... ایک فرد کا مزاج نہیں بلکہ ہجوم کی مکمل شخصیت کا مزاج۔ لیکن .... کیا ہجوم کی یہ شخصیت کوئی حقیقت ہے؟ یقیناً .... یہ چارٹ بنانے کے لیے جتنا آسان ہے، اپنے اثرات میں اتنا ہی ناکام ہے۔ جیسے .... ہمیں کہنے دیجیے .... ڈوور کی سیڑھیاں۔ وہ شخص حیرت انگیز طور پر کور چشم ہوگا جو اس سے انکار کرے کہ "ہجوم کی شخصیت" کم از کم انگریز کی لڑائی یا فرانس کے سقوط کے قابلِ توجہ اسباب میں شامل نہیں تھی۔

جب ہم دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں جو ہم نے صوبہ سرحد کے اس سفر کے لیے اپنے طور پر تیار کیا ہے تو ہم ایک مرتبہ پھر شخصیت کی طاقت سے متصادم ہیں۔

کیوں .... اب یہ صوبہ بیس برس قبل کے مقابلے میں پُرسکون ہے؟ میرے نوجوان دوست کا بیان تھا کہ مسلسل انتشار کی وجوہات میں سے ایک وجہ معاشی ہے۔ جب ہم یہاں موجود تھے تو ہم نے بہت نیچے وادی میں طویل فاصلوں پر روانہ ہونے کے لیے .... اونٹوں اور قافلوں کی نقل و حرکت سے اُٹھنے

والی گرد دیکھی۔

''نیچے دیکھیے'' اس نے کہا'' وہاں آپ کے لیے ایک خزانہ موجود ہے۔ تھیلے کے تھیلے .... ایک ہی ہلّے میں حاصل ہو جانے والے۔ ان قافلوں میں بخارا کا ریشم، ترکمانستان کے قالین اور پشاور کے جوہریوں کی قیمتی دھاتوں کی کثیر مقدار ہوگی۔ اس میں ایشیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے مرد و زن ہوں گے۔ چین کی سرحدوں سے سمرقند، مرو اور ہرات تک کے .... تاجک، قبلائی، قزلباش اور خلجی مکہ سے آئے ہوئے، یہودیوں، آفریدیوں اور ازبکوں کے ساتھ ملے جلے ہوئے اور اب اپنے ارد گرد دیکھیے۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔'' یہاں بلندی پر کیا ہے؟ چٹانیں اور مٹی .... کانٹے اور جھاڑ جھنکار .... پانی کا نام و نشان تک نہیں .... چند بکریاں اور آشیانے کے طور پر چٹانوں میں ایک سوراخ .... آپ کو یہ جان کر ہرگز حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ جب وہ اس طرح کے شکار کو دیکھتے ہیں .... تو ان کا لالچ ایک بھوک سے تڑپتے ہوئے آدمی جیسا ہوتا ہے۔''

''لیکن تم نے کہا تھا کہ اب صورتِ حال قدرے بہتر ہے؟''

''ہاں بہتر ہے۔ اُجرت پہلے سے زیادہ ہے .... جلانے کی لکڑی کی فروخت کے بہتر امکانات ہیں۔ جو ان چند چیزوں میں سے ہے جنھیں ان علاقوں میں فروخت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ فقط معاشیات کا سادہ سا معاملہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں کوئی بھی معاملہ سادہ نہیں ہے۔ یہ شخصیت کا سوال ہے!''

''کس کی شخصیت کا؟''

''سب سے پہلے تو سر جارج کننگھم کا .... وہ گورنر ہے اور وہ .... خیر .... وہ سب سے مقتدر ہستیوں میں سے ہے .... وہ ہر طرف جاتا ہے .... سب کو جانتا ہے .... کئی زبانوں پر عبور رکھتا ہے .... بے حد نڈر ہے .... گولی کا نشانہ بننے سے نہیں ڈرتا .... اور دھما کا خیز حسِ مزاح رکھتا ہے۔ لیکن پھر .... بلاشبہ آپ یہ سب بہتر جانتے ہیں۔ کچھ اور بھی لوگ ہوتے ہیں جن سے آپ کو ملنا ہوتا ہے .... مثلاً والیِ سوات!''

''وہ .... جس کے بارے میں لیئر نے ایک لغو نظم لکھی تھی .... یعنی واقعی اس کا وجود ہے؟ کیسا لگتا ہے وہ؟''

''جا کر خود ہی کیوں نہیں دیکھ لیتے؟''

اور میں نے جا کر دیکھا۔

۵

''وہ جگہ جہاں گنگا دین نے اپنا کردار ادا کیا تھا۔''

دو دن بعد ہم وادیِ سوات سے گزر رہے تھے۔ میرے لیے وہ سب بہت وحشیانہ اور عجیب و غریب تھا۔ کسی حد تک اس لیے بھی کہ مجھے اس کو بلندی سے دیکھنے کے مواقع ملے تھے اور اب میں وہاں سے سڑک پر گزارا جا رہا تھا اور چٹانیں بے حد عمودی تھیں۔

بہر حال۔ اس وقت ہم ایک آرام دہ کار میں پختہ سڑک پر رواں دواں تھے اور اس وقت گنگا دین کے ڈرامے کو دہرانا ممکن تھا۔ ایک تیکھی چٹان کا تصور کیجیے .... جس کے کنارے پر ایک زرد دریا کے چابک کی ضرب پڑ رہی ہو اور دریا کے اُس پار ایک لاابالی گھنا جنگل .... یہ چک درّہ کا علاقہ ہے، جو لشکروں سے پُر رہتا تھا۔ گنگا دین اس دستے سے وابستہ تھا جو چٹان کے اوپر تعینات تھا .... اور کس طرح ایک آدمی .... خواہ وہ کپلنگ کے گیتوں کا ہیرو ہی کیوں نہ ہو .... گولیوں کی بارش میں رینگ کر نیچے پہنچ سکتا تھا؟ یہ ابھی تک ایک راز تھا۔ وہاں ابھی تک ایک قلعہ، دریا اور پانی کا گڑھا موجود تھا اور ہم وقفے وقفے سے گنگا دین کے ہم شکلوں کے پاس سے گزرتے .... دہکتی ہوئی آنکھوں اور تیکھے نقوش کے ساتھ، شاندار قسم کے آدمی، سڑک کو روندتے ہوئے۔

اپنی موجودہ حالت میں .... میں نے محسوس کیا کہ ان جنگجوؤں سے کوئی ذاتی تصادم اس فقرے سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو سکتا ہے ''گنگا دین! تم مجھ سے بہتر آدمی ہو۔''

''پچیس سال پہلے'' میرے ساتھی نے جو ایک تجربہ کار انگریز ریذیڈنٹ آفیسر تھا، کہا'' ہم مسلح گارڈز کے بغیر اس سڑک تک آنے کے قابل نہیں تھے .... آدھا وقت ہم اپنے سروں کو چھپائے رکھتے .... آج کل آپ دن کی روشنی میں کسی بھی حالت میں ان سڑکوں پر چل سکتے ہیں اور آپ کو اپنے سر پر سوائے چھتری کے کسی چیز کی ضرورت نہیں اور آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ پچیس برس پہلے یہاں سوائے مصیبتوں اور فاقوں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا .... آج کل ...... خیر .... ان کی طرف دیکھیے۔ اس ریاست میں ان کی تعداد پانچ لاکھ ہے۔ ٹھوس .... متحد اور خوشحال .... کیوں؟ ایک مکمل شخصیت کی بدولت۔ بوڑھا والی ایک جینیئس ہے۔ وہ سینٹ فرانسس اور میکیاولی کا مجموعہ ہے۔ اس کا آغاز ہی بے حد

زبردست تھا......... کیونکہ وہ سوات کی عظیم مذہبی شخصیت اخوند کا پوتا ہے......... اس نے اس حیثیت کا جی
بھر کے استعمال کیا۔

''یہ سب کچھ کس قدر بے قاعدہ لگتا ہے'' میں نے رائے ظاہر کی۔

''کیا ملک کا یہ حصہ بجائے خود ناممکن حد تک بے قاعدہ نہیں ہے؟''

وہ اس تخمی میں حق بجانب تھا......... بلاشبہ......... میں نے خود کو یہ سوچتے ہوئے پایا کہ اس
صورت حال میں کیوں اور کیسے کی وضاحت، انگلینڈ میں تعلیم یافتہ اور ترقی پسند سامعین کے سامنے کتنی دشوار
ہوگی......... جو پورا یقین رکھتے ہیں کہ ہم ہندوستان سے جا رہے ہیں تا کہ پورا ملک جمہوریت کے اندرونی
اداروں کے ذریعے راتوں رات ترقی کر سکے۔ جبکہ یہاں سابقہ لٹیروں کی ایک سرزمین تھی جو مذہبی جنیئس
کے قبضے میں تھی اور بلقان کی وحشی اور دشمن اتحادی ریاستوں میں گھری ہوئی تھی جو انگریزوں کی مسلسل نگرانی
میں مقابلتاً قانون کی حدود میں تھیں۔ یہ انگریز حاکم اپنے قانونی طریق کار کو قبائلی لوگوں کی فطرت کے مطابق
تشکیل دینے پر مجبور تھے۔ یہ سب انگلینڈ میں، پُرسکون آتش دان کے پاس بیٹھ کر جتنا سادہ لگتا تھا.........
اتنا سادہ تھا نہیں!

مثال کے طور پر قانون نافذ کرنے والے اداروں پر غور کریں تو حکومت میں وہ لوگ جو انگریز سے
کم دانش مند ہیں، والی کے لیے پوری قلمرو پر برٹش لیگل کوڈ لاگو کرنے کی کوشش کرتے رہے.........
نظریے کے طور پر یقیناً ہمیں ایسا کرنا چاہیے۔

اگر ہندوستان ایک قوم ہے تو اس قوم کا ہر فرد اس قانون کا پابند ہے۔ اس کے علاوہ انگریز.........
جو ہمیشہ .... جب نظریات کو فراموش کر دیں تو بہترین عمل کرتے ہیں اور جب درست اور قابلِ عمل کے
معاملے میں اپنی حسیات پر بھروسا کرتے ہیں تو قوانین کو وہیں چھوڑ جاتے ہیں جہاں انھیں پایا تھا۔

''اور یہی مناسب بھی ہے۔'' میرے دوست نے کہا ''یہاں پر قوانین محض قبائلی رسوم و رواج کا
نام ہے۔ ان کی شقیں طے نہیں ہیں اور اس سلسلے میں انگریزوں کا کوئی حکم نہیں چلتا لیکن یہ یہاں کے تمام لوگوں
کو دستانوں کی طرح پورے آتے ہیں۔ یہ لوگ دیوانگی کی حد تک مذہبی ہیں.........اور جب کسی جرم کے
معاملے میں حلف اُٹھاتے ہیں تو آپ اپنی زندگی کی شرط لگا سکتے ہیں کہ وہ سچ ہی بولیں گے...... میں ایسے
آدمیوں کو جانتا ہوں جنھوں نے جھوٹی قسم کھانے پر، چودہ سال قید بامشقت کو ترجیح دی.........سوائے

.... بلاشبہ.........وزیروں کے .... جو ہر معاملے میں جھوٹ بول سکتے ہیں۔

ایک اور وجہ ہے کہ ان علاقوں میں قبائلی رسوم، انگریزی قانون سے کیوں بہتر ہیں......... یہ
ملاؤں کے سبب ہے۔ مذہبی رہنما .... جو حقیقی رہنما ہیں۔ ایک ملا کسی ایسے شخص کو تو معاف کر سکتا ہے جو
انگریز حکومت کے خلاف حلف اُٹھاتا ہے مگر قبائلی نظام کے خلاف حلف اُٹھانے پر معاف نہیں کر سکتا.........
جھوٹے کو ہر صورت میں جہنم رسید ہونا ہوگا اور اس سلسلے میں مولوی صاحب اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔''

شاید اس مسئلے پر مزید گفتگو سودمند ہوتی لیکن اب ہم سوات کے ایک چھوٹے سے قصبے کے نواح
میں پہنچ چکے تھے۔ یہاں کچھ صاف ستھری عمارتیں نظر آئیں، ہسپتال، سکول، مسجد اور پھر ایک خوبصورت
دیہاتی مکان۔ جو بعد میں محل ثابت ہوا۔ اگر ہمارے اردگرد جامنی کھردرے پہاڑ نہ ہوتے اور سفید اور گلابی
دھاریوں والے ٹیولپس، جوان وادیوں میں خودرو طریقے سے اُگتے ہیں تو ہمیں لگتا ہم سیوسکس میں ہیں۔

٦

''والی داخل ہوتا ہے.........سنسناہٹ.........اضافہ.........کلائمکس.........اینٹی کلائمکس۔''

میری ڈائری کا یہ نوٹ۔ جو ہماری آمد کے اولین چند لمحات کے دوران کی ڈرامائی صورت حال کا
ایک مکمل بیان ہے۔ یہاں تھوڑی سی وضاحت کی ضرورت ہے۔ والی داخل ہوتا ہے۔......... سنسناہٹ
.... اس حقیقت کے ادراک کا فوری ذریعہ تھا کہ وہ معمر آدمی خوف زدہ کرنے کی حد تک ''شخصیت'' سے
مزین تھا۔ یہ نہیں کہ اس کے رویے میں جارحیت تھی .... بلکہ بالکل نہیں تھی۔ وہ اپنی سفید داڑھی اور
سرایت کر جانے والی آنکھوں کے ساتھ، شاہ سے زیادہ صوفی معلوم ہوتا تھا۔ یہ محض اس وجہ سے تھا کہ آپ کو
محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی آنکھیں آپ کے آر پار دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ ہاتھ ملاتا تو آپ اس کی آہنی گرفت
میں بلبلا اُٹھتے۔ اور وہ انگریزی سے بالکل نابلد تھا۔ لیکن اس نے ہمیں اپنے اثر میں لے لیا۔ اس شدت کے
ساتھ جیسے وہ ہٹلر تھا اور میونخ کے بیئر ہال میں کسی اجلاس سے خطاب کر رہا تھا۔ یہ لفظ ......''اضافہ'' کی
وضاحت تھی۔

ہم اس کی طرف متوجہ تھے......... جب باہر بینڈ سے اچانک "God Save The King" پھوٹ
پڑا۔ جب ہم محل کے دروازوں سے کار میں گزر رہے تھے تو میں نے ناگواری سے اس بینڈ پر تبصرہ کیا تھا۔ اسے
ایک بہت بوڑھا آدمی بجا رہا تھا جس کی خطرناک فوجی مونچھیں مہندی کے شوخ رنگ سے رنگی ہوئی تھیں۔ ان

کے آلاتِ موسیقی پانچ تھے۔ تین ارغنون۔ ایک ترنا اور ایک بڑا ڈھول۔ یہ قدیم انسان ہمیں محظوظ کرنے کے لیے کس طرح کی موسیقی تجویز کرنے والے تھے؟ اس کا سراغ لگانے میں ہمارا زیادہ وقت صرف نہیں ہوا۔ یہ "God Save The King" تھی۔ جسے وہ نصف چوتھی اور آخری Bars کے ذریعے بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ انھوں نے اسے بجایا اور ہم چہروں پر پھیکی مسکراہٹیں سجائے جو عام طور پر غیر متوقع موقعوں پر قومی ترانہ بجائے جانے پر اُبھرتی ہیں .... اٹن شن ہو گئے .... بینڈ خاموش ہوا اور ہم تقریباً بیٹھنے ہی کو تھے کہ .... دوبارہ...... اور ہم جلدی سے دوبارہ اٹن شن ہو گئے۔ ایک بار پھر انھوں نے چوتھی اور آخری دُھن آدھی بجائی۔ اختتام پر ڈھول کی ایک اور تھاپ کا اضافہ کیا گیا .... اور اب .... یقیناً ہم اطمینان سے بیٹھ سکتے تھے؟ نرم مسکراہٹیں ہمارے چہروں پر پھیلنے لگیں .... لیکن نہیں .... سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ سچ مچ، اب تو حد ہی ہو گئی تھی...... میں ایک کرسی سے ٹیک لیے، ایک ٹانگ پر کھڑا تھا اور مجھے شبہ تھا کہ اس حالت میں زیادہ دیر برقرار رہ سکوں گا۔ غالباً والی نے میری صورتِ حال کی ہولناکی کا اندازہ لگا لیا تھا۔ کیونکہ تیسرے راؤنڈ کے خاتمے پر اس نے دیوار کے آر پار دیکھا .... کم از کم مجھے ایسا ہی لگا .... جیسے اس کی نگاہ اینٹوں کی دیوار میں سرایت کر گئی ہو...... اور بینڈ خاموشی میں ڈوب گیا۔

اور اب اینٹی کلائمکس ....

کیونکہ یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ والی ہفتے میں صرف چار بار کھانا کھاتا ہے، اور آج اس کا کھانے کا ناغہ تھا۔ چنانچہ میزبانی کے چند روایتی کلمات کے ساتھ وہ رخصت ہو گیا اور ہم .... اس کے بیٹوں اور وزیرِ اعلیٰ کے ساتھ لنچ کے لیے چلے گئے۔

باقی دن میرے لیے "درد کی دھیمی لَے کی طرح تھا۔ ہمیں میلوں کا سفر کروایا گیا .... ہمیں محل دکھائے گئے .... واٹر ورکس .... ہسپتال .... وہ سب بے حد دھندلا اور غیر یقینی نظر آتا تھا۔ یہ سوات کے بارے میں حقیقت سے آشنا کرتا تھا۔ کیونکہ جس دھند کے پیچھے سے میں نے اُسے دیکھا، اس کے باوجود میں تنظیم، معقولیت اور مسرت کا گہرا احساس لے کر جا رہا تھا۔

سو جہاں سے ہم نے شروع کیا تھا .... وہاں واپس .... ڈاکٹر کا انتظار کرتے ہوئے، چھوٹے سے قلعے میں .... جو تاریک پہاڑوں میں کہیں اٹکا ہوا ہے۔

میرا پہلا ہندوستانی ڈاکٹر .... بس آنے ہی والا ہے .... کیا آپ وہ تین ٹمٹماتی ہوئی

روشنیاں پہاڑی پر آتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں؟ یہ بھڑکتی ہوئی انگیٹھیاں ہیں، جن میں وہ اپنے آلات کو دہکا کر جراثیم سے پاک کرے گا۔ روشنیاں نزدیک سے نزدیک تر آ رہی ہیں اور جونہی اُن کو اُٹھانے والے مزدور ٹیرس پر قدم رکھتے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں۔ جیسے وہ لیونؔ کیویلو کی ایک ابتدائی کاوش "I zingari" سے سیدھے نکل کر آ رہے ہوں۔ وہ مکمل طور پر کسی چھوٹی انالین اوپرینک کمپنی کے قزاقوں کے کرداروں کی طرح ہیں .... لیکن ہندوستانی ڈاکٹر میں قزاقوں یا تھیٹر کے اداکاروں والی کوئی بات نہیں .... وہ مستعد اور اپنے کام میں ماہر ہے .... ایک نفاست کے ساتھ، جو اسے بارلے سٹریٹ کی جان بنا سکتی ہے .... وہ مقدور بھر کوشش کرتا ہے اور مجھے مطلع کرتا ہے کہ اگر میں آئندہ دو پایہ رہنا چاہتا ہوں تو مجھے صبح سویرے ہسپتال واپس جانا چاہیے۔

جہاں ہم اب جا رہے ہیں۔

☆☆☆

پانچواں باب

بستر میں سبق

اپنے اوّلین ہندوستانی ہسپتال میں مجھے سب سے پہلے جس بات کا پتہ چلا وہ یہ تھی کہ پورے ہندوستان میں پینسٹھ ہزار مریضوں کے لیے فقط ایک تربیت یافتہ نرس تھی۔ آبادی کی بنیاد پر سرسری طور پر یہ تناسب بنتا تھا کہ پورے کینیڈا کے لیے دو سو نرسیں۔ اور یہ اگر سمجھ سے ذرا سا بالا ہے تو یوں سمجھ لیجیے کہ برائٹن کے پورے شہر کے لیے کُل دو نرسیں۔

دوسری چیز مجھے یہ معلوم ہوئی کہ صرف پشاور شہر میں تپ دق کے ساٹھ ہزار مریض تھے۔ ٹائپسٹ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ اعداد و شمار اپنی جگہ بالکل درست تھے۔ ساٹھ ہزار! چنانچہ اگر ہم ان بدنصیبوں میں سے دس کے لیے ایک نرس مقرر کریں تو ہمیں پورے ہندوستان کی نرسوں کو فقط پشاور شہر میں تعینات کرنا ہوگا جو کوئی بڑا شہر ہرگز نہیں ہے۔ جب میں رات کو چت لیٹا ہوا چھت پر سایوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوتا تو یہ اعداد و شمار میرے ذہن میں رقصاں رہتے۔ ایک نرس............ پینسٹھ ہزار مریضوں کے لیے............ پینسٹھ ہزار مریض ایک نرس کے لیے چلّاتے ہوئے۔ ''نرس............ نرس............'' یہ خیال بہت بھیانک تھا اور کسی حد تک توہین آمیز بھی۔ اگر پینسٹھ ہزار مریضوں کو ایک نرس درکار تھی تو مجھ جیسے مریض کو دو نرسوں کی خصوصی توجہ کا کیا حق تھا؟ کس قدر باعثِ شرم تھا............ ایک بیڈ پر لیٹے رہنا............ سرہانے لگی بیل کے ساتھ جو اسی نرس کو بلانے کے لیے لگائی گئی تھی............ جس کی درد سے تڑپتے ہوئے پینسٹھ ہزار انسانوں کو ضرورت تھی۔

''درد............ ہر فلسفہ............'' ان تنہا راتوں میں............ کانپتے ہوئے سایوں کے نیچے۔ لیٹے ہوئے میں نے سوچا............ ''لفظ ''درد'' کی تشریح کے ساتھ شروع ہونا چاہیے۔'' درد............ آخری منصف تھا............ زہر بھرا امتحان............ وائلڈ یہ لکھنے میں بالکل حق بجانب تھا کہ

''ہر بچے اور ستارے کی پیدائش کے ساتھ درد ہوتا ہے۔''

درد............ جو کسی سیاست دان کے شب و روز کے انہاک میں ہوتا ہے............ یہ ہر راستے کے آغاز اور انجام پر ہوتا ہے............ کسی سپاہی کا درد............ جس کا ادراک ہمیں جنگ اور امن کے فیصلوں

پر ہونا چاہیے۔ اور فاقہ زدوں کا درد .... جسے ہمیں اپنا بجٹ بناتے وقت یاد رکھنا چاہیے۔ جبکہ سیاست کا رجحان زیادہ سے زیادہ غیر ذاتی رویوں کی طرف ہے۔ ہم کتابیں جمع کرنے کے نظام میں اتنے محو ہیں کہ فراموش کر چکے ہیں کہ اعداد و شمار کے پیچھے کچھ چہرے بھی ہوتے ہیں اور یہ کہ ولبرفورس سے کینز تک اور ڈکنز سے بیورج تک ایک طویل سفر ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے معاملے میں یہ ایک حقیقت ہے۔ ہندوستان کے ہر مربع میل میں دنیا کے کسی بھی حصے سے زیادہ شدید درد ہے۔ لیکن اس کا احساس بہت کم لوگوں کو رات بھر جگاتا ہے۔ غالباً ایسی بے حسی کا بظاہر سبب ہندو فلسفے کے مطابق ''کرموں'' کا تصور ہے۔ اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر بچہ جو تکلیف اُٹھا رہا ہے وہ اس کے پچھلے جنموں کی بدمعاشیوں کی سزا ہے تو آپ کو اس پر کیوں رحم آئے گا؟

ہندو فلسفے میں رحم کی گنجائش بہت کم ہے۔ ہندوستان میں قیام کے دوران میں نے بار بار لوگوں کی توجہ یہاں کے مختلف النوع آلام کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ کبھی محض اس سوال کے ذریعے کہ گلی میں بچہ کیوں رو رہا ہے اور کبھی وسیع طور پر پھیلی ہوئی سماجی ناانصافیوں کی نشاندہی کر کے۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں کی دلچسپی اس میں معروضی طور پر کم ہی تھی۔ ان کے ردِعمل براہِ راست نہیں تھے۔ درد........ ان کے نزدیک محض سیاسی نمونے میں شامل کوئی چیز تھی۔ خواہ کسی بھی شکل میں ظاہر ہو .... یہ بہرحال ہر صورت میں برٹش راج کی ذمہ داری تھی: ''جب ہم آزادی حاصل کر لیں گے۔'' وہ کہتے ''تو یہ تمام چیزیں ختم ہو جائیں گی۔'' مجھے ہمیشہ ان کو یہ بتانے کی حسرت رہتی کہ آزاد ملکوں میں بھی تو انسان داڑھ کے درد میں مبتلا ہوتے ہیں۔

۲

دہلا دینے والی اُن دونوں مثالوں کو یاد کیجیے، جن سے ہم نے اس باب کا آغاز کیا تھا۔ نرسوں کا انحطاط اور تپ دق کی افراط۔ بلاشبہ کانگریس کا کوئی نقیب ان دونوں لرزہ خیز حقائق کے لیے انگریزوں کو الزام دے گا۔ وہ کہے گا ''تم ڈیڑھ صدی سے اس ملک پر قابض ہو۔ تم نے اس سلسلے میں کیا کیا؟''

خیر...... ہم کیا کر سکتے تھے؟ ...... اور اب بھی کیا کر سکتے ہیں؟

ہندوستانی عورتوں کی اکثریت آج بھی نرسنگ کو کوئی قابلِ عزت پیشہ نہیں گردانتی۔ وہ زخمیوں اور بیماروں کی تیمارداری کو اپنی توہین سمجھتی ہے۔ وکٹورین انگلینڈ کے وہ تعصبات جن کے خلاف فلورنس نائٹ انگیل

نے جنگ کی تھی، ذات پات کی پوشیدہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہندوستانی عورت کے اعتقادات کے مقابلے میں محض وہم و گمان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان آج تک مسز گیمپ کے عہد میں ہے۔

یہی سبب ہے کہ نرسوں کی چھوٹی سی فوج کا بڑا حصہ اینگلو انڈین لڑکیوں پر مشتمل ہے، جن میں زیادہ تر عیسائی ہیں .... جو توہین یہ لڑکیاں برداشت کرتی ہیں ان کا سبب قدیم عقائد ہیں۔ خاص طور پر جب وہ پرائیویٹ کیسوں پر جاتی ہیں۔ ایک بے حد سلجھی ہوئی اور ذہین لڑکی نے مجھے بتایا کہ اُس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ خاکروبوں کے ساتھ کھانا کھائے اور یہ کہ جب وہ اپنے مریض کو جراثیم کش دواؤں سے غسل دے لیتی ہے تو مریض ہمیشہ دوبارہ نہانے پر اصرار کرتا ہے تاکہ اس کے چھونے سے جو نجاست جسم پر لگی ہے اُسے صاف کیا جا سکے۔

یہ کس کا قصور ہے کہ پورے ہندوستان میں محض پینسٹھ ہزار نرسیں ہیں؟ کیا یہ انگریز عورتوں کا قصور ہے؟ جبکہ پورے ہندوستان میں انگریز عورتوں کی کل تعداد بھی پینسٹھ ہزار نہیں ہے۔

اور وہ ٹی بی کے ساٹھ ہزار کیس؟ جبکہ ان میں کم از کم پچاس فی صد اُس ادارے کی وجہ سے ہیں جن پر انگریز کا کوئی زور نہیں چلتا........ پردہ!

پشاور کی سڑکوں پر مٹرگشت کے دوران آپ کو اوّل تو کوئی زنانہ وجود نظر ہی نہیں آئے گا اور اگر قسمت سے کوئی ایک آدھ نظر آ بھی جائے تو وہ سر سے پاؤں تک ایک دبیز کپڑے میں لپٹا ہوتا ہے جس میں دو تنگ روزن آنکھوں کی جگہ اور ایک ننھا سوراخ منہ کے بجائے ہوتا ہے۔ بس........ اتنی ہی تازہ ہوا اُسے حاصل ہوتی ہے۔

''اگر کوئی شخص ایک ایسا نظام وضع کرنا چاہے جو جراثیم کی افزائش کے لیے آئیڈیل ہو۔'' میرے وارڈ کے ڈاکٹر نے بتایا ''تو وہ پردے سے بہتر نظام نہیں بنا سکتا۔ ہم برسوں سے اس کے خلاف لڑ رہے ہیں لیکن کھلم کھلا اس لیے نہیں لڑ سکتے کہ اس سے لوگوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔''

مذہب .... ہمیشہ مذہب .... ترقی کے خلاف صف آرا .... سرجری کی میز پر تاریکی پھیلانے والا۔ ڈسپنسری میں دواؤں کی بوتلوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے والا۔

جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے میں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ میں ایک جدید ہسپتال کے بجائے دیوانوں کے کسی مٹھ میں ہوں۔

''ساتھ والے ونگ کے ایک وارڈ میں بڑی پریشانی ہے۔''ایک پیر کی صبح میرے وارڈ کی نرس نے بتایا''ایک لڑکی پرانے اپنڈکس کی مریض ہے اور اس کا فوراً سے پہلے آپریشن ہونا چاہیے تھا مگر وہ بدھ تک آپریشن کروانا نہیں چاہتی۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ کل شبھ دن نہیں ہے اور بدھ تک وہ غالباً زندہ نہیں رہے گی۔''

''ایک اور مسئلہ'' کچھ روز بعد اس نے پھر بتایا۔

''اب کیا ہوا؟''

''ایک نوعمر لڑکے کو لایا گیا ہے، جس کے ساتھ اٹھارہ رشتہ دار ہیں اور سب کے سب اس کے بیڈ کے قریب سونا چاہتے ہیں۔''

''اٹھارہ کے اٹھارہ؟''

''ہاں۔ ماں باپ، بہن بھائی، دادا دادی، خالائیں، ماموں، چچا چچیاں، چچازاد اور خالہ زاد...... اور ان تین بچوں کے لیے کچھ نہیں کیا جا سکتا جو مسلسل رو رہے ہیں۔ جبکہ مریض لڑکے کو مکمل سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔''

''تم لوگ آخر ان سے پیچھا کیوں نہیں چھڑواتے؟''

''ہم ان سے پیچھا نہیں چھڑوا سکتے۔ کیونکہ اگر ہم نے ان میں سے ایک کو بھی کچھ کہا تو وہ مریض کو یہاں سے لے جائیں گے اور اس طرح وہ صبح سے پہلے مر جائے گا۔''

لیکن بیچارہ نوجوان اس صورتِ حال میں بھی یقیناً مر جائے گا!........... ان تمام مسائل سے نمٹنے کے لیے کیا مشورہ ہے؟

ہندوؤں کا مشترکہ خاندانی نظام ہم نے ایجاد نہیں کیا اور اگر انھیں ذرا سا بھی شبہ ہو گیا کہ ہم اسے ختم کرنا چاہتے ہیں تو آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ ہندوستان میں بیس افراد کے کنبے کا ایک چھت کے نیچے رہنا معمول کی بات ہے۔ یہ خاندانی نظام ایک پوری اکائی ہے جسے ہندو قانون کی مسلسل تائید حاصل ہے۔ باپ بیٹا اور پوتا، کھانے پینے میں، پوجا پاٹ میں، ملکیت میں، اور عورتوں سے اختلاط میں، ساتھ ساتھ[1] .... یہاں

(1) "INDIA" by T.A. Raman (Oxford University Press)

اس فقرے کا اضافہ ضروری ہے کہ ہسپتالوں کی جانب پیش قدمی میں بھی۔

جب میں وہیل چیئر پر چہل قدمی کے قابل تھا تو دیگر مریضوں کے کوارٹروں کی طرف معاملات کے کھوج میں نکلتا تھا۔ ان میں بہت سے کمرے چھوٹے چھوٹے پاگل خانے تھے۔ جن کے فرش کے چپے چپے پر مریضوں کے رشتہ داروں کا قبضہ تھا۔ بوڑھے ڈھڈوں سے لے کر چیختے چلاتے شیر خوار بچوں تک۔ کمرے کے ایک کونے میں کوئی چاول پکا رہا ہوتا۔ دوسرے کونے میں کوئی عورت ساڑھی دھو رہی ہوتی۔ درمیان میں بدنصیب مریض پڑا ہوتا۔ نڈھال .... بے بس .... جراثیم کے غول کے غول اپنے پھیپھڑوں میں اُتارتے ہوئے۔ نرس کے اندر آنے کا منظر کافی دلچسپ ہوتا .... ہجوم میں کسی نہ کسی طرح اپنا راستہ بناتے ہوئے اور تھرمامیٹر کو مریض کے منہ میں ڈالنے سے پہلے جراثیم کش (جراثیم زدہ؟) محلول میں ڈبوتے ہوئے۔

۳

کچھ لوگ میری عیادت کے لیے اندر داخل ہو رہے ہیں۔ مسلمان ...... ہندو...... سکھ۔ لیکن اب میں پلٹ کر ان پر نظر ڈالتا ہوں تو ان میں کوئی ''ہندوستانی'' نہیں ہے۔

شمال مغربی سرحدی علاقے میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ یہاں پہلی مرتبہ میں نے گروہی احساسات کی شدت کو محسوس کرنا شروع کیا۔ اب تک تو یہ ایک نصابی مسئلہ معلوم ہوتا تھا۔ کوئی ایسی چیز جسے کوئی صرف کتابوں میں پڑھتا ہے۔ یکا یک یہ بہت حقیقی بن گیا جب ایک کے بعد ایک مسلمان میرے بیڈ پر جھکا .... قابلِ نفرت ہندو کے لیے آگ اور خون اُگلتے ہوئے۔

''ہندوازم ایک غلاظت ہے۔'' دہلی میں ایک مشہور مسلمان نے مجھ سے کہا تھا۔ ''ہندوازم ایک غلاظت ہے'' اس نے یہ ثابت کرنے کے لیے بے شمار مثالیں دیں کہ یہ ایک سماجی بیماری ہے۔ وہ خصوصی طور پر ایک ممبر اسمبلی کے خلاف طیش میں تھا۔ مسٹر کرشنا چاری، جس نے یہ اعلان کیا تھا کہ گاندھی ہندوؤں کے لیے بھگوان کی جگہ ہے۔

اس نے کہا ''کسی انگریز کے لیے یہ سمجھنا بے حد محال ہے کہ اس اعلان سے مسلمانوں کو کس قدر تکلیف پہنچی ہے؟''

اگرچہ وہ اسمبلی کا ممتاز ممبر اور ایک ذمہ دار شخصیت تھا، پھر بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ تلخی انفرادی

ہے اور غالباً کسی ذاتی پرخاش کا نتیجہ ہے۔ اب معلوم ہوا کہ ایسا نہیں تھا۔ یہ مسلمان مجھے پورے جوش وخروش سے یہ باور کروانے کے لیے بے چین تھے کہ ان کے اور ہندوؤں کے درمیان واضح فرق ہے۔ کیونکہ.......... وہ کہتے ''تم عوام تک پہنچ سکتے ہو اور عوام تک کبھی مسلمانوں کا مؤقف نہیں پہنچتا.......... کیونکہ ہم پروپیگنڈے پر لاکھوں روپے خرچ نہیں کر سکتے۔''

ابتدا میں جو لوگ میری مزاج پُرسی کو آئے ان میں ایک صاحب، عزت مآب ملک خدا بخش تھے۔ ایڈووکیٹ جنرل اور قانون ساز کونسل میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء تک اپوزیشن لیڈر۔ (بخش نام کا بہر حال ایک خوبصورت مطلب ہے، خدا کا عطیہ) ''کبھی مت بھولو۔'' اس نے مجھے تنبیہ کی'' کہ مسلم اور ہندو محض الگ الگ مذہب نہیں بلکہ الگ الگ کلچرز ہیں۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے۔'' اس کا چہرہ ایک شفیق مسکراہٹ سے چمک اُٹھا۔ ''خدا ہر جگہ موجود ہے۔'' اس نے کہا ''ایک درخت کسی ایسے شخص کو بھی سایہ فراہم کرنے سے انکار نہیں کرتا، جو اس کے وجود کا انکار کرتا ہے۔''

وہ پاکستان کا حامی نہیں تھا۔ وہ اسلام کے سیاسی اتحاد کا حامی بھی نہیں تھا لیکن اس کا اصرار تھا کہ مسلمان الگ قوم ہیں.......... خصوصاً وہ زبان کے مسئلے پر بالکل واضح تھا۔ ''ہندو ہماری اُردو کو اپنی ہندوستانی میں تبدیل کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا اور دوبارہ مسکرایا مگر اس مرتبہ اتنی شفقت سے نہیں۔ ''مگر اُردو بہت سخت جان ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ لفظ ''اُردو'' کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے ''لشکر'' اور یہ وہ لشکر ہے جسے ہندوستانی سے شکست نہیں دی جا سکتی۔''

بے حد مختلف ایقیان کے ساتھ ایک اور ممتاز ملاقاتی ڈاکٹر خان صاحب تھا۔ وہ کانگریس وزارت کا وزیرِ اعلیٰ تھا، جس نے ۱۹۳۷ء میں اپنا عہدہ سنبھالا لیکن اس کی شہرت کا عظیم سبب عبدالغفار خان کا بھائی ہونا تھا۔ عبدالغفار خان ''سرحدی گاندھی'' کے طور پر مشہور تھا۔ اس بھائی کی تجاوزات قابلِ ذکر ہیں۔

یہ قومی الجثہ ہے۔ یہ ایک مسلمان اور ایک جنگجو ہے لیکن اس قدر شدت سے گاندھی کے اثر میں ہے کہ رضاکارانہ طور پر غیر تشدد پسند بن چکا ہے اور اپنے پیروکاروں (سرخ پوشوں) پر اپنے عقائد کو مسلط کرتا ہے۔ یہ پارٹی، جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے، بہت سے فسطائی رجحانات کی حامل ہے۔

سرحدی گاندھی جیل میں تھا جب اس کا بھائی مجھ سے ملنے آیا اور نتیجتاً میں نے قدرے شرمندگی محسوس کی۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب مروّت کا مکمل نمونہ تھا۔ بہر حال جب اس نے گفتگو کا آغاز کیا تو مجھے محسوس

ہوا کہ وہ یکایک الجھا دینے والے خیالات کے گرداب میں پھنس گیا ہے۔ ایک لمحے میں وہ غیر تشدد پسندی کی اُصول کی وضاحت کرتے ہوئے، جدید دنیا کی قابلِ عمل پالیسی کے طور پر گاندھی کے اینٹی انڈسٹریل ایکشن پروگرام کو سراہا رہا تھا اور اس تجویز کی حمایت کر رہا تھا کہ ہندو مسلم اختلافات تب تک ختم نہیں ہو سکتے جب تک ہندوستان سے انگریز نہیں چلا جاتا اور دوسرے ہی لمحے وہ یہ رونا روتا ہوا نظر آتا کہ ہندوستان پوری طرح سے مسلح نہیں ہے اور ہندو مسلم اختلافات کی مختلف کہانیاں زیادہ تیز روشنی میں مجھے سناتے ہوئے، نہرو کے انڈسٹریلائزیشن پروگرام کی تعریف کر رہا ہوتا۔ اس نے گفتگو کے اختتام پر یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستان کی تمام بیماریوں کا علاج اشتراکیت ہے۔

جب وہ جانے کے لیے اُٹھا تو میں نے عرض گزاری کہ وہ درحقیقت کیا سوچتا ہے اور کیا چاہتا ہے، میری ناچیز سمجھ میں یہ بات بالکل نہیں آئی۔ ''کوئی بات نہیں۔'' اس نے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کہا ''ہم اختلاف کے لیے تیار رہیں گے لیکن یہاں تو یہ بھی ناممکن ہے۔ آپ کسی دھندلی سکرین سے اختلاف نہیں کر سکتے، صرف اس میں گم ہو سکتے ہیں۔'' اس کے رخصت ہو جانے کے بعد جو ڈاکٹر میرے علاج پر مامور تھے، ان میں سے ایک میرے پاس آیا۔ ''ہیلو۔'' اس نے کہا ''تمھارا بخار تیز ہو گیا ہے، اس میں کس کا قصور ہے؟'' میں نے اسے بتایا کہ ''ڈاکٹر خان صاحب اگرچہ ایک خوش طبع آدمی ہے لیکن کسی حد تک تھکا دینے والی شخصیت ہے۔ خاص طور پر کیمونٹی کے معاملے میں۔'' میں نے اضافہ کیا۔ وہ ایک لمحے میں یہ رائے دیتا ہے کہ ''ہم نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور دوسری ہی سانس میں یہ ثابت کرنے کے لیے کہانیاں سناتا ہے کہ ہم نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔''

''میں آپ کو ایک اور کہانی سناتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا ''جب ڈاکٹر خان صاحب وزیرِ اعلیٰ بنا۔ اس وقت پشاور میں خطرناک قسم کے فسادات ہو رہے تھے۔ پہلی شام ہی کو چھ آدمی مارے گئے اور درجنوں شدید زخمی ہوئے۔ بلاشبہ سب کچھ بہت گھناؤنا تھا۔ جانتے ہیں ڈاکٹر خان صاحب نے زخمیوں کی مرہم پٹی کے لیے کسے بھیجا؟ ایک انگریز ڈاکٹر کو!...... کیوں؟ میں صرف یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں کہ وہ کسی ہندو یا مسلمان ڈاکٹر سے زیادہ انگریز ڈاکٹر پر اعتماد کرتا تھا۔ کیونکہ مسلمان زخمی یہ محسوس کرتا ہے کہ ہندو ڈاکٹر اُسے چُھرا گھونپنا چاہتا ہے اور اسی طرح ہندو زخمی، مسلمان ڈاکٹر کے لیے محسوس کرتا۔ لیکن وہ ایک انگریز ڈاکٹر پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں کیونکہ انگریز ڈاکٹر کو اس کی ذرّہ بھر بھی فکر نہ ہوتی کہ اس کے مریض کا مذہب کیا ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب مسائل کے بارے میں واضح طور پر سوچ سکتا ہے۔ اگر وہ اتنا باتونی نہ ہوتا تو ایک لایق لیڈر ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اپنی جسمانی حالت کی وجہ سے اس کے خیالات کے بارے میں، جو کانگریس کے تمام عذر خواہوں کو بے حد عزیز تھے، میرا پیمانۂ صبر ذرا جلدی لبریز ہوگیا تھا۔

۶

میری عیادت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ فطری طور پر ان میں زیادہ تر مسلمان تھے، اور تمام کے تمام ہندوؤں کے مخالف۔ ان کی نفرت سیاسی نہیں تھی اور اس میں معاشی پہلو بھی بہت کم تھا۔ اس نفرت کی جڑیں ان کی جبلّت میں زیادہ گہری تھیں۔ ان میں اکثریت پاکستان کی حامی تھی۔ گو وہ واضح طور پر نہیں جانتے تھے کہ پاکستان کا مطلب کیا ہے۔ جب میں اس رائے کا اظہار کرتا کہ اگر ہندوستان تقسیم ہوگیا تو مسلمان معاشی طور پر تکلیف اُٹھائیں گے تو وہ کہتے "کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم امیر ہوں یا غریب؟ یہ ہمارا اپنا مسئلہ ہے۔" جب ان سے سوال کیا جاتا کہ وہ اپنی سرحدوں کا دفاع کس طرح کریں گے تو وہ ہنستے "جنوبی سرحد کہنے کی بات ہے، ہندو سرحد ہے۔" وہ کہتے "اس سے ہم خود ہی نمٹ لیں گے اور شمالی سرحد شاہی ذمہ داری ہوگی۔"

وہ مجھ پر ہندو فلسفے کی قباحتوں کی وضاحت کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ ایک شخص نے مجھے لکشمی دیوی کے بارے میں بتایا جو ہندوؤں کی دولت کی دیوی ہے اور ایک مقامی تہوار کے بارے میں جہاں سال میں ایک بار روپے کی پوجا ہوتی ہے۔ ایک اور نے جو کشمیر سے آیا تھا بتایا کہ اس کے دوستوں میں سے ایک کو محض اس لیے جان سے ہاتھ دھونے پڑے کہ اس کے ہاتھ سے حادثاتاً ایک گائے کی ہتھیا ہوگئی تھی۔ (جو بلاشبہ ہندوؤں کے نزدیک بے حد تقدس کی علامت ہے)۔" کچھ برس پیشتر گو ہتھیا کی سزا موت تھی۔" وہ، گائے کا پیشاب پینے کی عادت سے لے کر، اس بے نیازی تک جو ہندو اپنے بچوں کے، مندروں پر کندہ فحش مناظر کے درمیان کھیلنے کے سلسلے میں برتتے تھے، بے شمار ہندو رسم ورواج کے بارے میں احتجاج کرتے۔

ایک سہ پہر یہ قصہ اپنے کلائمکس پر پہنچ گیا جب ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان بیرسٹر اور سیاست دان نے، جس کا نام یہاں لینا مناسب نہیں کیونکہ اس طرح اس کے کیریئر پر بُرا اثر پڑ سکتا ہے، ہندوؤں سے

منسوب ہر چیز کو اس گھن گرج کے ساتھ بُرا بھلا کہنا شروع کیا کہ مجھے تنگ آ کر اس سے خاموشی کی درخواست کرنا پڑی۔

"ٹھیک ہے"۔ وہ بولا "میں چُپ ہو جاتا ہوں لیکن اگر میں چُپ ہو جاؤں تو کیا تم ایک چیز پڑھو گے، جو میں تمھیں بھجواؤں گا؟ صرف ایک صفحہ...... پوری کتاب میں سے؟"

"کون سی کتاب میں سے؟"

"مارک ٹوئن کی "More Tramps Abroad"۔

"مگر ہندوازم سے مارک ٹوئن کا کیا لینا دینا؟"

"تم خود ہی دیکھ لینا...... بائی دی وے کیا تم بنارس جا رہے ہو؟"

"خیال تو ہے!"

"بہتر!............ جو پیراگراف میں تمھیں پڑھوانا چاہتا ہوں وہ بنارس کے بارے میں ہے جو ہندوؤں کا متبرک ترین مقام ہے۔ یہ اس عقیدے کے بارے میں ہے کہ ہندوؤں میں سے جو کوئی گنگا کی دوسری سمت میں مرے گا وہ اگلے جنم میں............ لیکن انتظار کرو اور اسے خود پڑھو۔"

اس رات وہ کتاب پہنچی۔ مارک ٹوئن کی صرف یہی کتاب میں اب تک نہیں پڑھ پایا تھا۔ اس کے ابتدائی چند فقرے مارک ٹوئن کے مخصوص انداز میں تھے۔

خشک۔ خستہ۔ چمک دار............ جیسے کہر آلود صبح میں سورج کی ابتدائی کرنیں۔ لیکن پہلے ہم ہندوازم کے بارے میں اقتباس پڑھ لیں...... یہ رہا...... لیکن اسے پڑھتے ہوئے خیال رہے کہ یہ ایک عظیم امریکی کی رائے ہے۔ ایک ایسے آدمی کی رائے، جو اپنے ہمسایوں سے محبت کرتا تھا اور دل میں خدا کا خوف رکھتا تھا۔

"بنارس میں آپ کو بتایا جاتا ہے کہ اگر کوئی یاتری گنگا کی دوسری جانب جانے کی کوشش کرے اور ناکام ہو کر وہیں مر جائے تو وہ فوراً دوبارہ گدھے کے روپ میں جنم لیتا ہے۔

غور فرمائیے۔ اس مصیبت پر اور اس کی قیمت پر۔

آپ جانتے ہیں کہ ہندوؤں کو گدھا بننے سے ایک بچگانہ اور غیر منطقی کراہت ہے۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ کیوں؟............ کیونکہ کوئی گدھے سے بھی باقاعدہ طور پر یہ توقع رکھ سکتا ہے کہ ایسے ہندو میں

تبدیل ہونے سے کراہت محسوس ہوگی۔ کیونکہ اس طرح وہ اپنے وقار، عزتِ نفس اور نوے فی صد ذہانت سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لیکن اگر کوئی ہندو، گدھے میں تبدیل ہو جائے تو اُسے کسی بھی شے سے ہاتھ نہیں دھونے پڑیں گے۔ جب تک .... آف کورس .... آپ اس کے دھرم کو نقصان میں شامل نہ کریں اور وہ اس طرح حاصل زیادہ کرے گا۔ وہ بیس لاکھ دیوی دیوتاؤں اور دو کروڑ اوتاروں، پرچارکوں، پنڈتوں، پروہتوں، سنیاسیوں اور دوسری پوتر ہستیوں سے نجات حاصل کر لے گا۔ اُسے ہندو نرکھ اور ہندو سورگ سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔ یہ سب فوائد ہیں جن پر ہر ہندو کو غور کرنا چاہیے اور اسے چاہیے کہ وہ گنگا کی دوسری طرف جانے کی کوشش میں جان دے دے۔"

کتنی عجیب بات تھی کہ اس قدیم امریکی کلاسیک کے زرد پڑتے ہوئے صفحات نے مجھے حیران کر دیا۔ کیونکہ ان میں بہرحال جدید ہندوستان کی کنجی موجود تھی۔ مارک ٹوئن .... کوئی سوچ سکتا ہے کہ مارک ٹوئن کسی حد تک ایک خاص عہد سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن یہ اقتباس کسی "خاص عہد" سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ یہ ابھی تک گرما گرم تھا اور ابتدا میں کسی قدر مزاحیہ انداز کے باوجود روح پر اثر انداز ہوتا تھا۔ جیسے ایک مہذب اور عمر رسیدہ ظریف کا کبھی راستے میں ماسک اُتر جائے اور اس کا اصل چہرہ نظر آ جائے۔ مسخ اور وحشت ناک۔

"اُسے ہندو نرکھ اور ہندو سورگ سے بھی چھٹکارا مل جائے گا۔"

ہندو نرکھا کیا تھا؟ اور ہندو سورگ کیا تھا؟ آنے والے درد بھرے دنوں میں یہ سوالات میرے پیشِ نظر ہیں۔ آپ کو دوسرے حصّے میں ان کا جواب ملے گا۔

☆☆☆

حصّہ دوم

پہلا باب

ہندوازم پر سرچ لائٹ

پیش لفظ کے انداز میں۔

اس باب سے اس قدر یقینی طور پر اشتعال انگیزی کا اندیشہ ہے کہ اس کی ابتدا میں چند لفظ کہنا ضروری ہے۔

یہ ہندو دھرم پر ایک تنقید ہے یا کسی حد تک ان تمام دھرموں، فلسفوں اور ثقافتوں پر، جو آج ہندو دھرم کے جھنڈے اُٹھائے چل رہے ہیں، اس قدر کہ اگر ان کا انکار کیا جائے تو یہ مضحکہ خیز امر ہوگا۔ لیکن یہ ہندوستانی کردار یا ہندوستانی لوگوں پر کوئی حملہ ہرگز نہیں ہے۔ اس کتاب میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں برتا گیا کیونکہ نفسیاتی، روحانی اور سماجی طور پر میں کلر بلائنڈ ہوں۔ میرے خیال میں بلندی کی کوئی انتہا ایسی نہیں ہے جسے ہندوستانی عوام نہیں چھو سکتے اور بلندی سے میری مراد لاطینی معنوں میں کردار اور اخلاق کی بلندی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عقل کی۔

ہندوستان چاہے تو ٹیگور اور جگدیش باس کے علاوہ اس کے اپنے ولبر فورس، اینی فلورنس، نائٹ انگیل، اپنے فادر ڈیمن پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ انفرادی طور پر اس قسم کے بےلوث کرداروں کے معاملے میں بے حد کمزور ہے، جس قسم کے کرداروں نے مغربی تاریخ کے اوراق کو روشن کیا۔ یہ ہندوستانی کردار کی کسی کمی کے سبب نہیں بلکہ ہندو دھرم کے حیات کُش اثرات کی وجہ سے ہے۔ ہندو دھرم، جیسا کہ یہ ہے۔ ایسا نہیں، جیسا اسے ہونا چاہیے تھا،...... یا کسی حد تک رہا ہوگا۔ کوئی ایسی چیز جس کا بنیادی مآخذ صاف شفاف تھا اور جس کا چشم روح کی بلندیوں سے ابل رہا تھا۔ لیکن گزری ہوئی صدیوں نے اسے کیچڑ اور کچرے سے بھر دیا اور آج یہ ایک بہت بڑی سست رُو ندی ہے جو نشیب کی بیمار وادیوں سے گزر رہی ہے۔

جن نفیس، راست باز اور بے غرض ہندوستانیوں سے میری ملاقات ہوئی، ان میں شاید ہی کوئی کوئی کٹر ہندو ہو۔ ان میں سے تقریباً سب اس نشے سے چھٹکارا پا چکے تھے اور دراصل یہ دھرم منشیات کی عادت کی طرح ہے اور اس کو ترک کر دینے والوں پر کسی طرح بھی انگریزوں کا اثر نہیں تھا۔ اگرچہ انفرادی طور پر ان کے انگریزوں سے اچھے تعلقات ہو سکتے تھے لیکن وہ سب کے سب شدید وطن پرست واقع ہوئے تھے۔ نہ لوگ

عیسائیت سے متاثر تھے، نہ ایک مذہب چھوڑ دینے کے بعد انھیں دوسرا مذہب اختیار کرنے کی جلدی تھی۔ یہ سب محض اس لیے تھا کہ وہ تمام جبلی طور پر اچھے انسان واقع ہوئے تھے۔ انسان...... جن کو خدا نے ...... جیسا کہ وہ بعض اوقات کرتا ہے۔ فطری نیکی عطا کی تھی۔

اسی طرح کے انسانوں سے دوستی کی وجہ سے میرے لیے اس باب کو تحریر کرنا اس حد تک تکلیف دہ بن گیا۔ ہو سکتا ہے اور غالباً ہوگا کہ اسے ہندوستانی لوگوں کے خلاف سمجھ لیا جائے۔ حقیقت میں یہ ان کی صورت حال کی ایک وضاحت ہے۔ اگر یہ جواب میں کسی ہندوستانی کو جدید عیسائیت کی خامیوں کی نشان دہی پر اکساتی ہو تو یہ بہت اچھا ہوگا۔ ہم اس سے سبق حاصل کر سکیں گے۔ (۱)

ہندوستان کے بارے میں لکھی جانے والی جس کتاب میں مذہب کا ذکر نہ ہو وہ کسی طرح بھی ہندوستان کے بارے میں نہیں ہو سکتی۔ اس سرسری تبصرے سے ان لوگوں کو دھچکا لگ سکتا ہے، جن کی اس ملک کے بارے میں رائے ہندوستانی دانشوروں کی اس نئی نسل سے متاثر ہے جو مغربی لیکچر پلیٹ فارم پر جگمگا رہے ہیں۔ یہ نوجوان اپنے عقائد کا کوئی شرمناک مظاہرہ نہیں کرتے...... ان کی گفتگو میں پُرکشش لاادریت کی ہلکی سی مہک ہوتی ہے اور ہر چند وہ ہندوستان کے روحانی رہنمائی کے دعوے کا انکار نہیں کرتے۔ (کیونکہ یہ ایک مقبول ترین پروپیگنڈہ ہے خصوصاً شکاگو کے ویمن کلبوں میں) وہ ہندوستان کی مذہب پرستی کے افسانوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ''یہ سب'' وہ کہتے ہیں ''ماضی کا قصہ ہے۔ اب دھند ہٹا دی گئی ہے اور مندر کے ساتھ میونسپلٹی کے غسل خانے تعمیر کیے جا رہے ہیں''۔

اپنے طور پر وہ غالباً سچ ہی بولتے ہیں۔ بہت سے بچونگڑے رپورٹروں کا، جو یہاں آنے والے

---

(۱) قارئین کو یہ جان لینا چاہیے کہ کتاب کے اس حصے میں لفظ ''انڈیا'' ہندو انڈیا کے لیے استعمال ہوا ہے کیونکہ ہندوستان کی آبادی کا بہت بڑا حصہ ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ یہاں دس کروڑ مسلمانوں اور محض چار کروڑ دیگر مذاہب کے لوگوں کے مقابلے میں چوبیس کروڑ ہندو ہیں اور اگرچہ ہندوؤں کا مسلک مسلمانوں کے مسلک سے اس قدر واضح طور پر مختلف ہے، جیسے دن اور رات۔ لیکن ہندوازم میں ہر اس عقیدے کو اپنے رنگ میں رنگ لینے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے جو اس سے رابطے میں آتا ہے۔ اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ جیسے ہندو جنگل کے عین درمیان مسلمان مینار...... آہستہ آہستہ جنگل پھیلتا جاتا ہے۔ متبرک ستونوں کے گرد انگور کی بیلیں لہرانے لگتی ہیں۔ اللہ کے حرم گھاس پھونس سے اَٹ جاتے ہیں۔ صرف مندر کے کسی پنڈت کی بے انتہا نگہداشت ہی اسے محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ ہے وہ عمل جو ہندوستان کے بہت سے علاقوں میں جاری ہے۔ جہاں مسلم عقیدے کی صاف اور سیدھی لکیریں، صدیوں کے ہندو اثر کی وجہ سے ٹیڑھی اور دھندلی ہو گئی ہیں۔

مصنفین کی بو سونگھتے پھرتے ہیں، کوئی دھرم ہی نہیں ہے اور حقیقت کی طرف متوجہ کرنے سے انھیں تکلیف ہوتی ہے۔ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ وہ گاندھی کے اس قدر غیر مشروط اطاعت گزار کیوں ہیں جس نے گو ماتا کی پوجا کے سلسلے میں خود کو انسانیت کے مقام سے گرا رکھا ہے تو وہ آپ کو ایک سادہ انسان گردانیں گے...... اور آپ درحقیقت سادہ ہی ہیں۔ کیونکہ آپ نے ہندوستانی سیاسی نظام کی ایک گہری دراڑ کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔ اس حقیقت کی طرف کہ نوجوان ہندوستان فیکٹری کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے جبکہ اس کے رہنما اسے مندر کی جانب گھسیٹ رہے ہیں۔ لیکن برصغیر میں ایسے لاادری نوجوان کتنی تعداد میں ہوں گے؟ چونتیس کروڑ ہندوستانی جہالت کے اندھیروں میں ہیں اور کسی شمار قطار ہی میں نہیں۔ پڑھے لکھوں کی قلیل تعداد میں سے، زیادہ احتیاط کے ساتھ یہ کہنا چاہیے کہ بڑے شہروں میں رہنے والے وہ لوگ جن کا مسلسل مغربی اثرات سے واسطہ پڑتا ہے، اپنے بزرگوں کے دھرم سے چھٹکارا پا سکے ہیں۔ بہت فراخدلانہ طور پر تخمینہ لگائیں تو ہمیں محض چند ہزار کی تعداد میں ایسے لوگ ملیں گے جو خود کو، اس لفظ کے حقیقی معانی کے اعتبار سے ''بت شکن'' کہہ سکیں اور باقی...... کروڑوں...... اسی طرح بتوں کے چرنوں میں جھکے رہیں گے۔

ہندوستان کو اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیجیے۔ یہاں لکھنؤ یونیورسٹی کے ممتاز سکالر، پروفیسر ڈی پی مکرجی کا تجزیہ پیش ہے:

''طلبہ اپنے امتحانات کی تیاری کا اور کلرک اور دکان دار اپنے اپنے کام کا آغاز، اپنے پسندیدہ دیوی دیوتاؤں سے پراتھنا کے ساتھ کرتے ہیں۔ امتحان میں اچھی ڈویژن، ملازمت میں فوری ترقی اور بازار یا سٹاک مارکیٹ میں سودمند کاروبار، ہر ایک چیز کا تحفظ بھگوان کی کرپا سے اور پنڈت کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔ کوئی اور لیڈر اس قدر کھلم کھلا گاندھی کی طرح بھگوان کی کرپا کا انتظار نہیں کرتا اور نہ اس عمل کے لیے اس قدر پسند کیا جاتا ہے۔ نہ اس تسلسل کے ساتھ مذہب اور سیاست کو آپس میں ملاتا ہے، یہاں تک کہ بے حد تاریخی معاملات میں بھی۔ ہندوستان میں کبھی کسی سوشل سائنٹیسٹ کو کسی پنڈت پروہت کے مقابلے میں اہمیت حاصل نہیں رہی اور کوئی ایسا تعلیمی ادارہ، جس میں مذہب کی تعلیم نہ دی جاتی ہو کبھی عزت

حاصل نہیں کر سکا''۔[1]

یہ ایک بہت پُرانا مضمون ہے لیکن بے حد نیا بھی۔ سینکڑوں لکھاری، جنھوں نے ہندوستان کی مذہب پرستی کی طرف توجہ مبذول کروائی، ان میں سے ایک بھی جدید دنیا میں اس کے خلاف عمل کروانے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ کوئی یہ ثابت نہیں کر سکا کہ کس طرح اس سال یعنی ۱۹۴۴ء میں مذہبی انتہاپسندی سرجری کی میبل پر، مووی کیمروں کے ہینڈل گھماتے ہوئے اور صنعتوں کے پہیوں کو چلاتے ہوئے اپنا راستہ بنا رہی ہے۔ ہندوازم بے انتہا حد تک اور تشدد طریقے سے ایک زندہ اور متحرک قوت ہے۔ اس کی آواز فیکٹریوں اور ورکشاپوں کے شور سے بلند اور طلبہ اور سیاست دانوں کی اسمبلیوں پر حاوی ہے۔

بے حد ضروری ہے کہ موجودہ دنیا اس حقیقت کو پہچانے اور معاشرے میں اس کے نفاذ پر غور کرے۔ آئندہ صفحات میں ایک حل کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔ کم از کم اُن چند ایک لوگوں کے لیے جو اس کے حل میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے دلائل کو تین بنیادی حصّوں میں تقسیم کریں۔

پہلا یہ کہ ہمیں یہ واضح تصور حاصل کرنا ہوگا کہ ہندوازم دراصل ہے کیا؟

دوسرے، ہمیں اس حد تک اس کی تصویر کشی کرنی ہوگی کہ یہ ۱۹۴۴ء میں ہندوستان کی ایک زندہ اور متحرک قوت ہے۔

تیسرے، ہمیں اس ردِعمل کا اندازہ لگانا ہوگا جو اس قوت کے جدید دنیا پر اس شدت سے اثر انداز ہونے کے نتیجے میں پیدا ہو رہا ہے۔ وہ جدید دنیا جو تیزی سے سکڑ رہی ہے۔

۲

ہندوازم کیا ہے؟

میں یہ تحریر پہاڑوں میں بیٹھ کر ڈکشنریوں اور مذہبی کتابوں سے دُور بیٹھ کر لکھ رہا ہوں۔ لیکن اگر یہ میرے پہلو میں بھی دھری ہوتیں تو میرے لیے مددگار ثابت نہیں ہو سکتی تھیں۔ ہندوازم تقریباً ناقابلِ تشریح ہے۔ کیونکہ یہ ہر اُس خوف، خواب اور غلط تصور کا ملغوبہ ہے جسے کبھی سایوں بھرے جنگل سے مشابہ انسانی ذہن نے تیار کیا تھا۔

---

(1) "Modren Indian Culture, A Sociological Study" by D.P. MukerJi (India Publishers, Allahabad, 1943)

ہندوازم کا کوئی چرچ نہیں ہے۔ کوئی پوپ نہیں ہے۔ اس کی کوئی بائبل بھی نہیں ہے۔ اس میں قدیم حکایات، روایات اور گیتوں کا انبار ہے جس نے کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی کتابوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ لیکن ان قدیم ترین شاہکاروں میں سے سچ کو تلاش کرنے کے لیے کوئی حتمی اور بااختیار ادارہ موجود نہیں ہے۔ ان روایات میں سے آپ اپنی سمجھ کے مطابق ایک پر اعتماد کر سکتے ہیں اور دوسری کو رد کر سکتے ہیں۔[1]

واحد چیز جس پر آپ کو دل و جان سے ایمان لانا چاہیے وہ ذات پات کا قانون ہے۔ آپ کو پورا یقین ہونا چاہیے کہ آپ کے ساٹھ لاکھ ہم وطن اچھوت ہیں۔ آپ کا عقیدہ ہونا چاہیے کہ اگر آپ نے ان کے

---

(1) ہندو بائبل تک رسائی کا صرف ایک ذریعہ ہے ''بھگوت گیتا''۔ یہ عظیم روحانی حسن کا شاہکار ہے جس کو روحانیت کا کوئی طالب علم نظرانداز نہیں کر سکتا۔ روایت کے مطابق یہ کرو کشیترا کے میدان میں کرشن کا بھاشن ہے۔ اس کے حقیقی مصنفین کے نام تاریخ کی گرد میں گم ہو چکے ہیں۔ اس کے مصنفین میں یقیناً بہت سے نام شامل ہوں گے۔ اس کی بنیادی تعلیم جو بیک وقت ہندوازم کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ یہ ہے کہ سچا علم صرف آدمی کے اندر رہتا ہے۔ براؤننگ نے اس نظریے کو "Paracelsus" میں اس طرح بیان کیا ہے:

''سچ ہمارے اندر ہے، یہ بلندی حاصل نہیں کرتا
بیرونی اشیا سے، جو بھی تمھارا عقیدہ ہو
ہمارے باطن میں ایک مرکز ہے
جہاں سچ مکمل طور پر موجود ہے اور اسے جاننے کے لیے
کسی حد تک، مسلسل راستہ تلاش کرنا پڑتا ہے
جس جگہ سے قیدی شان و شوکت ممکن ہے غائب ہو جائے،
تب ایک پُراثر داخلہ روشنی کے لیے
اُس کے بغیر ممکن ہو سکتا ہے''۔

یہ ہے گیتا کا پیغام...... اور کسی صوفی کے لیے یا کسی فطری روحانی رجحان رکھنے والے آدمی کے لیے، اس کا مطالعہ قدرے آسان ہے۔ لیکن ایک عام دنیادار کے لیے یہ خطرات سے پُر ہے۔ یہ انسانی زندگی میں عزت و وقار کی ضرورت کا انکار کرتی ہے اور اُسے گڑھوں سے بھرے ہوئے راستے پر انتہائی المناک طریقے سے دھکیلتی ہے۔ یہ ممکنہ مایوسی کی طرف لے جاتی ہے اور بدترین صورت میں تاریکیوں میں ڈوب جانے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک اوسط عقل کا آدمی ''قیدی شان و شوکت'' کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس کے پاس سوائے گھٹیا اور خود غرض جبلت کی پیروی کرنے کے کوئی چارہ نہیں...... بلاشبہ اگر ''گیتا'' کو اچھی نیت سے پڑھا جائے تو یہ ایک مستقل محرک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کا بہترین ترجمہ "Annie Besant's" نے کیا ہے اور اس کی تمام تشریحات میں جو میں نے پڑھی ہیں سب سے متاثر کن شری کرشنا پریم کی "The Yoga of the Bhagavat Gita" ہے جسے Watkins, Charing Cross Road, London W.C.A. نے شائع کیا ہے۔

ساتھ کچھ کھالیا تو بھرشٹ ہو جائیں گے اور اگر کچھ پی لیا تو پلید ہو جائیں گے۔ ذات پات کا نظام ہندو جہاز کا آخری بڑا لنگر ہے۔ اس کے بغیر یہ جہاز دیگر ٹھوس اور حقیقت پسند عقائد کی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو سکتا ہے۔ اس امر کا مشاہدہ چنداں دشوار نہیں کہ یہ جمہوریت کی مکمل نفی ہے۔ وہی جمہوریت، جس کا اعلان ہندو اتنے زور شور سے کرتے ہیں۔

اس کا کوئی چرچ نہیں......... کوئی پوپ نہیں......... کوئی بائیبل نہیں۔ لیکن اس سب سے اہم یہ ہے کہ اس کی کوئی تاریخ نہیں۔

ہندوازم دنیا کے بڑے مذاہب میں واحد مذہب ہے جس کی سرے سے کوئی تاریخی بنیادیں نہیں ہیں۔ بہت سے تاریخ دان یسوع مسیح کی الوہیت کے منکر ہو سکتے ہیں لیکن ان میں شاید ہی کوئی ان کے وجود کا منکر ہو...... اسی طرح حضرت محمد ﷺ کے وجود کے بارے میں مکمل تاریخی شواہد موجود ہیں اور نسبتاً کم سہی لیکن مہاتما بدھ کے بارے میں بھی۔ لیکن ہندوؤں کے تمام مندر محض تخیلاتی مخلوق سے بھرے پڑے ہیں۔ یہاں ایسے پیامبر کی تلاش بے سُود ہے جو عام انسان کی شکل میں اپنی تعلیمات پیش کرتا ہو۔[1]

یہاں تو گنیش ہے اپنے ہاتھی والے سر اور چوپا گاڑی کے ساتھ...... اور یہاں کرشن ہے، اپنے پانچ یا چھ ہاتھوں سے مُرلی بجاتے ہوئے...... اور یہاں تباہ کن شو ہے اور عجیب و غریب اور بل کھاتے ہوئے اندر اور ورون کے وجود، جو بارش اور پانی کے دیوتا ہیں۔ ایسے ہیں ہندوؤں کے خدا! ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ ہم ان کے قابلِ پرستش ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں گفتگو کریں بلکہ ہمارا مقصد تو اس حقیقت کی نشان دہی کرنا ہے کہ ان بھگوانوں کو کوئی تاریخی اختیار حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے کسی حقیقی پس منظر کا نہ ہونا ہندومت کے مبہم، غیر مادی اور ناقابلِ فہم ہونے کی دلیل ہے۔

۳

''منفیت......... منفیت کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں بتایئے کہ ہندوازم کیا ہے؟ سوائے اس کے، جو

(۱) اس سلسلے میں ہماری تلاش بیکار ہوگی۔ کیونکہ ہر تاریخی مذہبی شخصیت، کسی اصل عقیدے کی بنیادی ساخت میں مستقل تبدیلی کا سبب بنتی ہے۔ یا کم از کم کسی شخصیت کے لیے (مثلاً سینٹ پال) یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ آسمانی وحی کی وضاحت کر سکے۔ یہ کہنا بھی بیکار ہے کہ ہندومت میں ان گنت رشی منی رہے ہیں کیونکہ وہ تمام، ہندومت کی فطرت کے عین مطابق، انفرادی طور پر روحانیت کے متلاشی رہے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا رکھی تھی۔

یہ نہیں ہے''؟

قارئین اس طرح کی تشریحات کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ لیکن ہندوازم، جنگل میں ایستادہ اُس مندر کی طرح ہے جس کے واضح خدوخال اُبھرنے سے پہلے ہی غیر مرئی، خودرو جڑی بوٹیوں نے اسے ڈھانپ لیا ہے اور اب ہمیں اس کی سب سے عظیم منفیت کا سامنا کرنا ہے۔ یہ ایک ضروری موڑ ہے لیکن اگر ہم ہندوستان کے مذہبی منظرنامے کا حقیقی عکس حاصل کرنا چاہیں تو یہ ایک وسیع موڑ ہے۔

ہندوازم، عیسائیت نہیں ہے۔

جس میں قاری خود کو نسبتاً تیز رفتار ردّ و قدح کے قابل سمجھ سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ کہے: ''یقیناً یہ عیسائیت نہیں ہے۔ ہر شخص یہ بات جانتا ہے''!

لیکن ہر شخص یہ بات نہیں جانتا۔ لاکھوں کی تعداد میں ایسے خوش طبع، آزاد فکر، زن و مرد مغرب میں موجود ہیں جو آسانی سے ''مذہبی عالمگیریت'' کے تصور کو قبول کر لیتے ہیں جو ایک عظیم اکائی کی مختلف صورتوں کے طور پر مذہب کی عزت کرنا پسند کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر رومین رونلڈ جس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اس نظریے کی تبلیغ میں صرف کر دیا۔

ان لوگوں کے نزدیک، ہندومت اور عیسائیت ایک ہی ہیرے کے مختلف پہلوؤں سے پھوٹنے والی شعاعیں ہیں۔ یا یہ کائناتی سمندر کے شفاف پانی کے دو قطرے ہیں۔ ''عالمگیر مذہب'' کے ان حامیوں کے پاس سطحی تشبیہات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ متجسس روحوں کے لیے ایک آرام دہ اصول ہے..... نرم و گرم اور سُرور انگیز۔ اس میں فقط ایک کمزوری ہے۔ وہ یہ کہ اس پر یقین لانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ تاریخ اور الٰہیات سے مکمل طور پر نابلد ہوں۔ ایک طرف تو آپ کو یسوع مسیح کی زندگی کے بارے میں بالکل معلومات نہیں ہونی چاہئیں اور دوسری طرف آپ نے ہندو مندروں کی جھلک تک نہ دیکھی ہو۔ ان لوگوں کے لیے جو ان معاملات سے چشم پوشی پر تلے ہوتے ہوں۔ ''عالمگیر مذہب'' کا اصول بہت سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔

اس کے فوائد میں سے ایک کا ذکر ضروری ہے۔ یہ ہندوستانیوں کے اندر سے کسی بھی طرح ''مختلف'' ہونے کے احساس کی ناگواریت کو یکسر ختم کر دیتا ہے۔ نیک لوگ، مختلف ہونا پسند نہیں کرتے۔ وہ اس خیال سے خجالت محسوس کرتے ہیں کہ وہ لوگوں سے برتر ہیں اور اگر واقعی عیسائیت اور ہندومت ایک ہی بات کو کہنے کے دو مختلف انداز ہیں اور اگر واقعی ان کے دونوں کے درمیان کوئی بھی متضاد نہیں......... تو چلیے

یہی سہی ...... خدا ...... ہندو یا عیسائی ...... اپنے آسمانوں میں موجود ہے۔ چنانچہ ہمیں ان ناگوار سوالات کے بارے میں فکر کی چنداں ضرورت نہیں۔

لیکن فرض کیجیے کہ یہ سب لنچ کے لیے "Ye Mystic Vegetarian Taverne" جاتے ہیں جسے ایک پُرکشش بزرگ تھیوصوفی خاتون چلاتی ہے اور گاندھی کی یسوع مسیح سے مشابہت پر اس قدر شاندار تقریریں کرتی ہے؟

علاوہ ازیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو چشم پوشی کے لیے تیار نہیں اور میں انہی لوگوں کے لیے لکھ رہا ہوں۔ اس صورت میں کہ ان کو اپنی آنکھیں بہت زیادہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ انسان سوچ سکتا ہے کہ مذہب کی "عالمگیریت" کا بہت زیادہ پرچار کرنے والوں کے ذہنوں میں کسی قدر سنجیدہ شبہات کو اُبھارنے کے لیے دوسادہ مثالیں کافی ہوں گی۔ آیئے یہ دونوں مثالیں دیکھتے ہیں۔

عیسائیت کی علامت ہے، صلیب پر ہمارے پیغمبر کا وجود...... ایک مکمل انسان کا وجود...... جس نے ...... خواہ ہم اس کی الوہیت کا انکار بھی کریں، دنیا کو قربانی کی سب سے خوب صورت مثال اور اخلاقیات کا اعلیٰ ترین نظام دیا۔

ہندومت کی علامت۔ یا کم از کم اس کی بہت سی علامتوں میں سے دنیا کے سامنے سب سے زیادہ پیش کیا جانے والا نشان ہے۔ گنیش کا وجود۔ آدھا آدمی اور آدھا ہاتھی۔ آیئے گنیش کی ایک تفصیلی تصویر دیکھتے ہیں۔

میں گنیش مندر کے پہلے منظر کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ مندر بنگلور میں تھا۔ ہم جھٹپٹے کے وقت ایک کار میں مقدس پہاڑی کی طرف گئے۔ ہندوستان میں جھٹپٹے کا وقت ایک بھیانک منظر پیش کرتا ہے۔ سورج کی آخری کرنوں میں ایک ڈرامائی کیفیت ہوتی ہے جیسے کسی جناتی لیمپ سے نکل کر گردش کرتی اور رُکتی ہوئی روشنی اور پھر دھندلکے کے پردے تیزی سے آسمان کے اردگرد پھیل جاتے ہیں۔

خستہ اینٹ کی ایک چھوٹی سی عمارت پر سورج ڈوب رہا تھا اور عمارت کے اندر وہ عفریت آلتی پالتی مارے ہمارا منتظر تھا۔ وہ چمک دار سیاہ پتھر کے ایک ہی ٹکڑے سے تراشا گیا تھا اور اس کی سونڈ اور اس کے بدہیئت اعضا غضب ناک اژدھوں کی طرح بل کھاتے ہوئے تھے۔ وہ گمنام سنگ تراش جس نے صدیوں پہلے اس بلا کو چٹان میں سے نکالا، بلاشبہ ایک جینئس تھا۔ لیکن میرے خیال میں وہ ایک شیطانی نابغہ

(Evil Genius) تھا۔ ایک سایہ زدہ آدمی۔ کیونکہ یہ گنیش ایک نحس زندگی کا مظہر تھا۔ مدھم روشنی میں اس کے اعضا کسی قدیم شہوانیت کے تشنج میں مبتلا تھے۔ اگر وہ چاہتا تو وہاں سے فرار حاصل کر سکتا تھا ...... اُس گناہ گار سونڈ کی ایک جنبش ...... ان سرسراتے ہوئے بازوؤں کا ایک اشارہ ...... اور دیواریں ریزہ ریزہ ہو جاتیں اور وہ اندھیرے میں کہیں گم ہو جاتا۔

صلیب پر مسیح ...... دنیا کو جگمگاتا ہوا آخری پیغام دیتے ہوئے۔

"خدایا! انھیں معاف کر دے کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں"۔

گنیش اپنے غار میں ...... اپنی سونڈ لہراتے ہوئے۔ ایک گاڑی میں سوار ...... جس کے آگے ایک چوہا بندھا ہوا ہے۔

کیا ان دونوں شبیہوں کو "عالمگیر مذہب" کے ایوان میں کسی بھی طرح، یکساں احترام کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے؟

"یہ صرف علامتیں ہیں" آپ ان کو بتا سکتے ہیں اور دراصل کسی بھی اہمیت کی حامل نہیں۔ ان دونوں پر ایک ہی سورج چمکتا ہے اور یہ خدا کا سورج ہے اور بس، یہی بات اہم ہے"۔

یہ لغو باتیں ہیں اور بے حد زہریلی بھی۔ علامتیں، بے حد اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ اگر آپ کو اس پر شک ہے تو ہندوستان کے اہم ترین ہندو کی بات سُنیں۔ شری راجا گوپال اچاریہ ...... کانگریس کے سابق صدر اور گاندھی کے قریب ترین دوستوں میں سے ایک۔ دیکھیے کہ وہ گنیش، یعنی ہاتھی دیوتا کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ (۱)

> "مغرب کے لوگوں کو ممکن ہے گنیش میں کوئی حُسن نظر نہ آتا ہو اور ممکن ہے وہ کہیں کہ اس کا وجود مضحکہ خیز ہے یا تصوراتی ہے۔ لیکن ہندوؤں کے لیے گنیش عالمگیر اتحاد کی علامت ہے۔ خوبصورتی اور بدصورتی کا ایک ہی وجود میں اتصال، اس میں ایک حیرت انگیز حُسن پیدا کرتا ہے۔ اس کا جسم ایک فربہ آدمی کا ہے جبکہ سر ہاتھی کا ...... اور سواری کے طور پر چوہا گاڑی۔ وہ اچھی خوراک کا شوقین ہے لیکن احمق نہیں۔ جیسا کہ مغرب کے لوگ اسے خیال کرتے ہیں۔ بس ہم ایسے ہی لوگ ہیں اور میری دعا ہے

(۱) مہاراشٹرا منڈل کے ایک جلسے میں کی گئی تقریر سے اقتباس جو ۸۔ ستمبر ۱۹۴۳ء کے "دی ہندو" میں شائع ہوئی۔

کہ ہمیشہ ایسے ہی رہیں"!

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک انسان اپنے خدا کے لیے معذرت خواہانہ انداز اختیار کر رہا ہے۔ ہمیں تو یسوع مسیح کے کسی عمل کے لیے معذرت خواہ ہونے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ معذرت خواہ ہوتے ہوتے بھی وہ اس کی پرستش کو جاری رکھے۔...... اور راجا گوپال اچاریہ نے اپنی تقریر میں یہی تو کہا ہے۔"ہاں، بلاشبہ ہندو ایسے ہی لوگ ہیں"!

۴

ہم ابھی تک منفیوں پر بات کر رہے ہیں۔ ہم ابھی تک یہ دکھا رہے ہیں کہ ہندوازم کیا نہیں ہے، بجائے یہ دکھانے کے کہ یہ کیا ہے...... لیکن یہ روحانی جڑی بوٹیوں کو صاف کرنے کا تیز ترین طریقہ نظر آتا ہے تاکہ ہندو مندر کی دیواریں اپنے صحیح تناسب میں دکھائی جا سکیں۔

ہم نے مسیح اور گنیش، دو علامات کا موازنہ کیا۔ یہ موازنہ ڈرامائی تھا لیکن یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ یہ محض بازیگری کا ایک نمونہ تھا۔ ایک زبانی چابک دستی...... جس سے کچھ ثابت نہیں ہوا...... کوئی ناقد یہ کہہ سکتا ہے کہ اسی طرح کی بازیگری کا مظاہرہ دوسری طرف سے بھی کیا جا سکتا ہے...... مسیح کا کوئی سطحی رُخ دکھانے کے لیے...... دھندلا اور مبہم...... (جیسا نیپلز کی پچھلی گلیوں میں دکھائی دیتا ہے) اور اس کا موازنہ کنجیورام کے عظیم مندر کی کسی نفیس مورتی سے کیا جا سکتا ہے۔ ہم اپنے ناقد کو اظہار رائے کی اجازت دیتے ہیں کیونکہ اس کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے...... کیونکہ ہمارا اصل سروکار علامات سے نہیں، خیالات سے ہے۔

اب ان خیالات کو جانچنے کا صحیح وقت آ گیا ہے اور اب ہم اپنے آپ کو ان بنیادوں پر استوار کریں گے کہ کوئی بھی ناقد ہمیں ہلا نہیں سکے گا۔

"ہم انھیں ان کے پھل سے جانچیں گے"۔ یسوع مسیح نے کہا تھا۔ ہم مسیح کے اس قول پر عمل کریں گے۔ ہم عیسائیت اور ہندومت کے پھلوں کو ساتھ ساتھ رکھیں گے۔ یہ علامات کا نہیں بلکہ نظاموں کا ٹکراؤ ہوگا۔ دو دنیاؤں کی جنگ...... دو دنیائیں...... جو کبھی آپس میں نہیں مل سکتیں۔

ہم اپنے دلائل کو (خلاصے کے ساتھ) اور ایک چونکا دینے والے تجزیے کے ساتھ متعارف کروا سکتے ہیں۔ جسے ہر عیسائی مجلس قانون ساز کے داخلی دروازے کی پیشانی پر جلی حروف میں درج ہونا چاہیے۔

"آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے عیسائیت قانون کی کتاب میں گھس جاتی ہے"۔ میرا خیال ہے، یہ لارڈ مورلے نے لکھا تھا۔ خیر، جو بھی اس کا مصنف رہا ہو، عمومی نتیجہ سبق آموز ہے۔ یہ مہذب ممالک میں قوانین سازی کے اس رجحان کی، جو مقدار میں جتنا عیسائیت پسند ہے، اتنا ہی ترقی پسند، خصوصیت سے وضاحت کرتا ہے۔

ہم اسے اپنے عمومی نتیجے سے ملا کر دیکھتے ہیں۔

"آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے، ہندوازم قوانین کی کتاب سے باہر آ جاتا ہے"۔ یہ ہندوستان میں جدید قوانین کے رجحان کی ناقابل تبدیل وضاحت ہے۔ یہ جس قدر ہندوازم کی نفی کرتا ہے، اُسی قدر جدید اور ترقی پسند بنتا جاتا ہے۔

یہ تضاد اتنا اہم ہے اور اس کے نفاذ کے نتائج اتنے گھمبیر ہیں کہ ایک عام قاری کو اگر ایک لمحے کے لیے ان دونوں عمومی نتائج پر غور کرنے اور انھیں اپنے ذاتی تجربے کا لبادہ اوڑھانے کو کہا جائے تو وہ ایسا کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرے گا یہاں تک کہ اُسے اپنی مثالیں محض حالیہ تاریخ ہی سے مل جائیں گی۔

گزشتہ صدی کے دوران ہر برطانوی اور ہر امریکی نے ہر قدم روشنی کی طرف اور عیسائیت کے نفاذ کی طرف پیش قدمی کی ہے۔

یسوع مسیح نے بچوں کو یہ کہتے ہوئے اپنے گرد جمع کیا تھا "یہ آسمانوں کی سلطنت ہیں" اور نیکٹری ایکٹس نے انھیں جہنم سے باہر گھسیٹ لیا۔

یسوع مسیح نے سبق دیا کہ تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اب غلاموں کی تجارت پر پابندی کم از کم ان کے مقصد کو سمجھنے کی ایک کوشش ہے۔ یسوع مسیح نے ہمیں بیماروں اور بوڑھوں کا خیال رکھنے کی تلقین کی اور ان کی خواہش کی تکمیل میں...... حالانکہ ہم کھلم کھلا تسلیم نہیں کرتے...... لیکن ہم نے بے شمار خیراتی ہسپتال بنائے اور ریٹائرڈ لوگوں کے لیے پنشن کا نظام وضع کیا۔

یسوع مسیح نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ جو لوگ تلوار اٹھاتے ہیں، وہ تلوار ہی سے مارے جاتے ہیں۔ آج زمانہ ان کے الفاظ کی سچائی کو اپنے تلخ تجربات کے ذریعے جان چکا ہے۔ لیکن کم از کم ہم نے ان کے احکامات بجا لانے کی کوشش تو کی۔ ہم نے شیطان سے جنگ کی اور اُسے خود سے دُور رکھنے کے لیے اپنے گرد مضبوط قلعے تعمیر کیے۔ اُن قلعوں میں سے ایک کا نام جنیوا تھا۔ اگرچہ وہ تباہ ہو گیا، لیکن اس کے کھنڈرات میں

بھی عظمت رفتہ کی شان دکھائی دیتی ہے۔ یہ وہ کھنڈرات ہیں، جن سے مسیح کسی بھی قسم کی شرم یا ملال کے بغیر گزر سکتے ہیں۔

انسانیت، یسوع مسیح کی طرف رُخ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ روشنی کی طرف جانے والے ہر راستے کا اختتام ان کی ذات پر ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ آپ کی نظر میں خواہ کتنی ہی مختصر اور سرسری ہو، اس کا ہندوازم کی تاریخ سے موازنہ کر کے دیکھیے۔

اگر انسان کا بنایا ہوا کوئی قانون ایسا تھا جسے مسیح کی تعلیمات کا نتیجہ کہا جا سکتا ہو تو وہ "Child Marriage Restraint Act" تھا جو معصوم بچوں کی شادیوں کی روک تھام کے لیے بنایا گیا(1) اور ۱۹۳۰ء میں نافذ کیا گیا۔ یہ ایکٹ ہندوازم پر عیسائیت کی فتح کا ایک واضح ثبوت تھا۔ کیونکہ اس کے دنیا میں پھیلنے کی وجہ "مدر انڈیا" کی عالمگیر شہرت تھی، جس کا مصنف بہرحال ایک کرسچین تھا۔ جبکہ قدامت پرست ہندوؤں نے ہندو دھرم کے نام پر اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

جس مذہبی جنون کے ساتھ ہندوؤں نے بچپن کی شادیوں جیسے قبیح عمل کا دفاع، اور "چائلڈ میرج ایکٹ" کی مخالف کی، وہ مغرب کے ایک عام آدمی کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہوگا، جو بے حد لا پروائی سے یہ فرض کیے ہوئے ہے کہ اس رسم کی تنسیخ ہندو طرزِ حیات کے سب سے قابلِ احترام سفر کی وجہ سے ہے۔ حقیقتاً صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی یہ تنسیخ، ان عناصر کی شکست کی وجہ سے عمل میں آئی۔

مثال کے طور پر پورے ملک میں عوامی جلسوں کے بعد، اس قسم کا قانون پاس ہوا تھا۔ "علی ورتی نگر کے شہریوں کے اس جلسے میں "چلڈرن میرج بل" کے خلاف احتجاج کیا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ بل، ہندو سماج کی رہنمائی کرنے والی شاسترک اصولوں کی بنیادوں پر وار کرتا ہے۔ ہم ہندوؤں کی خالصتاً ذاتی زندگی سے تعلق رکھنے والے معاملے میں قانون کی بلاوجہ مخالفت کی مذمت کرتے ہیں"۔

علی ورتی نگر کے شہری ٹھیک کہتے تھے، اس بل نے ان کے دھرم کی بنیادوں پر وار کیا تھا۔ جو لوگ عیسائیت اور ہندوازم کو "عالمگیر مذہب" کی خرافات میں ملانا چاہتے ہیں، ان سے اس مسئلے پر سوال کیا جانا چاہیے۔

یہ تو اسی طرح ہے جس طرح انیسویں صدی کے اربابِ قانون "Witch Burning" (جادو

(1) جسے اس کے سب سے بڑے داعی دیوان بہادر ہربلاس سردا کے نام پر سردا ایکٹ کہا جاتا ہے۔

گرنیوں کو زندہ جلانا) کے خلاف بنائے گئے قانون کے خلاف تھے ☆۔ اس بنیاد پر کہ یہ مسیح کے الفاظ کی روشنی میں بنایا گیا، خدائی قانون ہے۔

"یہ تمام شیطانی چیزیں مدتوں پہلے وجود رکھتی تھیں"۔ ناقد یہ جواب دے سکتا ہے "اور بہرحال، اب یہ ماضی کا حصہ ہیں"۔ لیکن یہ ناقد صریح غلطی پر ہوگا۔ یہ شیطانی چیزیں بہت زیادہ پُرانی نہیں۔ "سردا ایکٹ" صرف ایک دہائی قبل پاس ہوا تھا۔ جہاں تک اس کے ماضی کا قصہ ہونے کا تعلق ہے، اس کے خلاف کئی ثبوت پیش کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک محترم دوست سر ایڈورڈ بلاٹ بیان کرتے ہیں:

"وہ مصلح، جنھوں نے شادیوں کے رواج کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہمیشہ قدامت پسند اکثریت سے شکست کھا گئے۔ سردا ایکٹ بھی اس سلسلے میں بیکار ثابت ہو چکا ہے"۔ (1)

میں بنارس کے ہنومان مندر میں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ننھی منی بچیوں کو جن کی عمر بارہ برس سے زیادہ نہیں تھی، ایک ہجوم کی صورت میں مورتیوں کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔ گربھ (حمل) کی آشیرباد حاصل کرنے کے لیے۔ ان بچیوں کے چہروں پر دہشت کے آثار نمایاں تھے اور ان کے جسم اس شرم سے نچڑے ہوئے تھے کہ وہ بھگوان کی طرف سے عائد کردہ، ماں بننے کے فرض کو ابھی تک ادا نہیں کر سکیں۔

میں اسی طرح کی بچیوں کو کلکتہ کے کالی مندر میں بھی دیکھ چکا ہوں۔ میرے سامنے ان کے لمبے سیاہ بالوں کی لٹیں کاٹ دی گئیں اور انھیں مقدس کیکٹس کی شاخوں کے گرد نچایا گیا۔ جبکہ برہمن پنڈت ان کے جلد گربھ وتی ہونے کے لیے اشلوک پڑھ رہا تھا۔

ماضی کا حصہ؟

لیکن اگر یہ عمل میں ماضی کا حصہ تھا...... جو کہ نہیں تھا...... تو یہ اُصولی طور پر اب بھی حال کا حصہ ہے۔ مقدس کتابیں...... قبل از تاریخ روایات۔ برہمنوں کی تقاریب کی قدیم دستاویزات۔ یہ تمام کی تمام...... نئے زمانے کے سامنے چٹان کی طرح جمی ہوئی ہیں۔ ہندوؤں کی اصلاح کے طور پر، کسی قسم کی کوئی کوشش تصور

☆ اس قانون کا سہارا لے کر بے شمار معصوم عورتوں کو جادوگری کا الزام لگا کر زندہ جلا دیا گیا۔ ہمارے ہاں بھی توہین قرآن، توہین رسالت کا الزام لگا کر لوگوں کے گھر جلا دیے جاتے ہیں اور ناجائز تعلقات کے شبے میں عورتوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ غیرت کے نام پر قتل اور کارو کاری اسی قدیم ذہنیت کی غماز ہیں۔ (مترجم)

(1) "Social Service in India" Edited by Sir Edward Blunt (H. M Stationery Office. 1938)

سے بھی ماورا ہے۔ کیونکہ جب آپ ہندوازم کی اصلاح کر کے فارغ ہوں گے تو دیکھیں گے پیچھے ہندوازم کے نام پر کچھ باقی نہیں بچا۔

اس کے باوجود ہمیں اعتراف کرنا چاہیے اور شکر ادا کرنا چاہیے کہ اب یہ معاملات کچھ بہتر ہو رہے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے۔ دس فی صد تک...... اب تاریکی چھٹ رہی ہے...... اگرچہ آہستہ آہستہ......

۵

''آہستہ آہستہ ہندوازم رینگ کر قانون کی کتاب سے باہر آ گیا''۔

ستی (۱) ٹھگی (۲)، نوزائیدہ بچوں کا قتل، بیواؤں پر جبر، یہ سب ہندو دھرم کے ناگزیر حصے تھے۔ ''عیسائی برطانیہ'' نے ان سب کو کم از کم کاغذات پر تو ختم کر دیا تھا...... اور سماج سے ان کو خارج کرنے پر ہندوؤں نے دھرم کے نام پر ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ یہ دھرم...... جس کے لیے ہم سے کہا جاتا ہے کہ اُسی سرچشمے سے پھوٹا ہے، جس سے عیسائیت پھوٹی ہے۔ یہی معاملہ دیوداسیوں کا ہے۔...... مندروں کی طوائفیں...... جنھیں بچپن ہی سے پروہتوں اور یاتریوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ اب یہ اتنی تعداد میں موجود نہیں ہیں، جتنی ماضی میں تھیں...... اور جنھیں جنگ کے زمانے میں جب ہندوستان میں امریکی فوجیوں کا سیلاب امڈ آیا تھا تو بڑے شہروں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ کیونکہ اگر ملواکی سے آئے ہوئے نوجوان، خالص ہندوازم کے بارے میں اپنے وطن میں کچھ لکھ دیتے تو یہ کانگریس کے حق میں مفید نہ ہوتا۔ یہ عظیم روحانی اقدار کا دعویٰ کرنے والی قوم کے تصور کے مطابق نہ ہوتا۔ جو اپنی ''روحانیت'' کو دنیا بھر میں پھیلانے سے اس لیے قاصر ہے کہ برطانوی حکومت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔

تاہم، آج بھی آپ عام راستوں سے ذرا ہٹ کر چلیں تو بہت سی دیوداسیاں مل جاتی ہیں۔ جب میں جنوب کی طرف گیا تو میں نے خود انھیں مندروں کے آس پاس، دھندلکے میں، چھوٹے چھوٹے گھروں کی ڈیوڑھیوں میں بیٹھے ہوئے دیکھا (۳)۔ ان کے گندھے ہوئے بالوں میں میٹھی خوشبو والے فرنگی پانی کی

(۱) شوہر کی موت کے بعد بیوی کو اس کے ساتھ چتا پر زندہ جلانا۔

(۲) ٹھگ، وہ مذہبی پیشہ ور تھے جو اپنے شکار کو گلا دبا کر مار دیتے تھے۔ وہ کالی کی پوجا کرتے تھے جو بربادی کی دیوی ہے اور اپنی کمائی کا ایک حصہ اسے بھینٹ کرتے تھے۔

(۳) جدید ہندوستان میں دیوداسی مت کی سب سے بڑی مثال سری رنگم (ترن چنو پولی کے نزدیک) اور تروپتی کے مندروں میں ملتی ہے۔

مہک ہے۔ ان کے ناخن سرخ پالش سے رنگے ہوتے ہیں...... یاتری ان کے پاس سے گزرتے ہیں...... غبار آلود پاؤں...... دہکتی ہوئی آنکھوں...... لہراتی ہوئی دھجیوں میں سے سکے ٹٹولتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ...... وہ اپنی پسندیدہ لڑکی کے سامنے رکتے ہیں۔ عام طور پر وہ محض چھوٹی سی بچی ہوتی ہے...... یاتری اس کے پیچھے پیچھے اندر جاتا ہے...... اور دروازہ بند ہو جاتا ہے...... اور بھگوان خوش ہو جاتے ہیں...... اور پروہت کو اس کا حصہ مل جاتا ہے۔

لیکن اگر اس سب کا انکار بھی کیا جائے، جیسا کہ یقیناً ہندو عذر خواہوں کی طرف سے کیا جائے گا، وہ خود اپنے معروف احتجاجیوں کی جانب سے شائع کردہ ثبوتوں کا انکار نہیں کر سکتے۔ ''مدر انڈیا'' کے بے شمار ضمیموں میں سے ایک، سی ایس رانگا لائر کا ''فادر انڈیا'' بھی تھا۔ جس میں ہندو ذہنیت کی چالاکی اور پیچ داری کے اس قدر سانس روک لینے والے واقعات ہیں کہ اس کتاب کو پڑھے بغیر کسی کو ہندوستان کے بارے میں کچھ لکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۵ پر رانگا لائر دیوداسیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''طوائفوں کی بچیوں کے مندروں میں پرورش پانے کے پیچھے یہ سوچ ہے کہ ان کے اندر دھرم کی سمجھ اور ایشور کا ڈر پیدا کیا جا سکے تاکہ جب وہ جوان ہوں تو جنسی بے راہ روی میں مبتلا نہ ہو سکیں۔ اسی لیے طوائفوں کے اس بدقسمت طبقے میں، ہندوستان کی طوائفیں سب سے زیادہ وفادار اور بھگوان سے ڈرنے والی ہوتی ہیں''۔

۶

سو...... ہندوازم کیا ہے؟

سادہ سی حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں۔ یہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں!

اگر ہم کچھ یقین سے کہہ سکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ اپنے ابتدائی آغاز میں یہ شدید مشکلات اور انتہائی تجریدیت کے ساتھ ایک روحانی طرزِ زندگی تھا، جو ''گیتا'' اور اپنشدوں جیسی عظیم کتابوں میں بیان کر کے امر کر دیا گیا تھا۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ اس میں کوئی تاریخی شواہد نہیں ہیں اور اس دھرم کی کوئی عبادت گاہ نہیں ہے...... اور جو کسی بھی صورت میں...... انسانوں کی اکثریت کی رسائی اور تفہیم سے باہر ہے...... اور ہر طرح کی پہچان سے عاری ہو چکا ہے۔ یہ یہاں وہاں اور ہر جگہ مستعار دے دیا گیا ہے اور اس نے

جبلت کے مطابق اور آسانی کے لیے اور انسانی جذبات کو خدائی طاقت بخشنے کے لیے اپنے اندر انسانی توہمات کا ایک ہجوم جمع کرلیا ہے اور اب اس میں کئی ہزار دیوتاؤں کی بھیڑ ہے۔ جن میں چند بے حد بدنام کردار ہیں۔ لالچ اور شہوت کے دیوتا۔

جیسا کہ ڈیڑھ سو سال قبل ایے ڈی بوس نے لکھا تھا ''ہندو بنیادی طور پر خدا کا جو تصور رکھتے ہیں، اگرچہ نامکمل ہے مگر ایک سچے خدا کا تصور ہے۔ لیکن یہ رفتہ رفتہ معدوم ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ گمراہی، لاعلمی اور بددیانتی کی مکمل تاریکی میں گم ہوگیا۔ خالق اور مخلوق کے اتصال سے انھوں نے ایسے دیوتا بنائے جو دیومالا اور جنوں، بھوتوں کی کہانیوں کی طرح تھے اور ان کی پوجاپاٹ شروع کردی۔ یہ پوجاپاٹ بھی اتنی ہی اچھوتی تھی جتنی وہ خصوصیات جو انھوں نے ان دیوتاؤں سے منسوب کی تھیں اور نتیجتاً ہندوؤں کے تمام مذہبی اداروں کی طرح جن کا کردار بددیانتی سے تشکیل پایا ہے، ان کی سماجی اخلاقیات پر بھی اس کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔ آخر ایک ایسے ملک میں اخلاقی اقدار کس طرح پنپ سکتی ہیں، جس میں تمام انسانی برائیوں کو خداؤں کی تائید حاصل ہو''؟

یہ الفاظ کافی سخت ہیں لیکن ان کو نرم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کچھ ایسے لوگ ہوں گے جو کہتے ہوں گے کہ عیسائیت میں بھی بہت کچھ اساطیری ہے۔ انھیں یہ یقین رکھنے کا حق ہے لیکن وہ مشکل ہی سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ عیسائیت بھی اتنی ہی کریہہ المنظر ہے۔ عیسائی بچوں کو لنگ کی مورتیوں کو پوجنا نہیں سکھایا جاتا۔ وہ فحاشی کے اندھیرے میں، جسے ڈھانپنے کی کوئی ہندو جرأت نہیں کرسکتا، پرستش نہیں کرتے۔ عیسائی بچوں کو اپنے ہی بھائیوں سے نفرت اور حقارت کا ایسا برتاؤ کرنے کی تعلیم نہیں دی جاتی کہ وہ ان کے سائے سے بھی بچیں۔

یہ علامات ۱۹۴۴ء کے اس سال میں بھی برقرار ہیں۔ ۱۹۴۴ء کے اس سال میں بھی اُچھوت اسی طرح زمین پر رینگ رہے ہیں۔ ہندوازم ۱۹۴۴ء کے اس سال میں بھی اسی طرح مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ اصل نکتہ ہے اور اسی لیے باقی دنیا کے لیے اس کا سامنا کرنا ضروری ہے۔ چاہے یہ سامنا کتنا ہی دہشت ناک کیوں نہ ہو۔ اگر ہندوازم ایک لازوال پذیر عقیدہ ہوتا تو ہم اس کے عملی اثرات کو نظرانداز کرسکتے تھے۔ لیکن یہ وحشیانہ توانائی سے اسی طرح بھرپور ہے، جس طرح وہ جنگل جس سے یہ اس قدر وسیع پیانے پر برآمد ہوا ہے۔

یہ کوئی خوشگوار باب ہرگز نہیں ہے کیونکہ اس پر ہندوؤں کی رنجش یقینی ہے۔ یہ بھی لازمی ہے کہ اس

پر برٹش حکومت بھی خفا ہوگی کیونکہ وقتی ضرورت کے تحت ہماری پالیسی رہی ہے کہ زیرنگیں ممالک میں لوگوں کے مذہبی جذبات میں مداخلت نہ کی جائے۔ اس پالیسی نے ہمیں زیادہ مشکلات میں پڑنے سے محفوظ رکھا۔ اس سادہ اصول کے تحت کہ مذہب ایک ایسا معاملہ ہے جسے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیے۔ عام برطانوی یا فوجی کو واضح ہدایات دی جاتی ہیں کہ مقامی لوگوں کو ان کے مخصوص عقائد پر عمل کرنے دینا چاہیے۔

علاوہ ازیں ہم میں سے جو لوگ یہ سوچ رکھتے ہیں کہ دنیا میں پیش آنے والے واقعات میں اہم ترین واقعہ یسوع مسیح کی پیدائش تھی اور یقین رکھتے ہیں کہ عیسائیت نہ صرف سچا مذہب ہے بلکہ مکمل طور پر جدید بھی...... اُسے ہمارے مسائل کے بارے میں گفتگو کے وقت سے باہر نہیں رکھ سکتے۔ صرف یہی معیار ہے جسے ہم قبول کرتے ہیں اور اگر یہ دوسروں کے معیاروں کو گھٹیا ثابت کرتا ہے تو ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتے۔ ہم ہوا کو صاف کرنا چاہتے ہیں تاکہ روشنی کو راستہ مل سکے خواہ وہ روشنی ایک بے رحم قطعیت کے ساتھ ہمارے پراگندہ جسموں ہی کو نمایاں کرتی ہو۔

پس نوشت

ایک مرتبہ پھر ہمیں اس پر زور دینا ہے کہ یہ باب کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ اگر یہ کوئی تنقید ہے تو سسٹم پر ہے۔ لوگوں پر نہیں۔ اس پر خصوصیت سے اصرار کی ضرورت پر میرے ایک مسلمان دوست نے زور دیا، جس نے حال ہی میں یہ صفحات پڑھے ہیں۔ اس نے کہا ''کیا تم یہ ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ہندوؤں میں کوئی اچھا آدمی ہی نہیں ہے''؟

ظاہر ہے اس کا جواب ایک پُرزور نفی میں ہے۔

یہاں اچھے مورمن[1] ہیں۔ اچھے ملحد ہیں اور قدم قدم پر اچھے ہندو ہیں، مرد بھی، عورتیں بھی...... جو صاف دلوں اور مہربان روحوں کے مالک ہیں۔ لیکن وہ سب اپنے عقائد سے ہٹ کر اچھے ہیں، عقائد کی وجہ سے نہیں۔ آخر میں ہمارے دو بنیادی نکات۔

۱۔ ''گیتا'' میں بیان کردہ خالص ہندوازم کو اختیار کرنا، ایک شدید مشکل اور استثنائی حالت ہے۔ ...... ذات پر مکمل توجہ مرکوز کرتے ہوئے جزو کو کل کے ساتھ جوڑنے کے حتمی فیصلے کے ساتھ...... لیکن سماجی قوت کے طور پر ہوسکتا ہے یہ تقریباً بالکل ناکام ہو۔

---

(۱) عیسائیوں کا ایک قدیم طبقہ۔

۴۔ روزمروزندگی میں جس ہندوازم کی کروڑوں لوگ تبلیغ کرتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ وہ بالکل غیر فطری ہے۔ کیونکہ اس کی کوئی تاریخی حیثیت ہے نہ اس پر کسی کو مکمل عبور حاصل ہے۔ مذاہب کے طور پر عیسائیت، اسلام اور بدھ مت کا ایسا انحطاط ناقابل تصور ہے۔ ہاں ان مذاہب کے پیروکاروں کا زوال ممکن ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ان مذاہب میں چند چیزیں ضرور ایسی ہیں، جن پر عیسائیوں، مسلمانوں اور بدھوں کے لیے ایمان لانا ضروری ہے۔ دوسری طرف ایک ہندو جس چیز پر چاہے، ایمان لاسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا دھرم گھٹیا جبلتوں کا ایسا ملغوبہ بن چکا ہے، جسے برہموں نے آسمانی بنانے کی کوشش کی، جبکہ دیوی دیوتاؤں کا گروہ اسے زمینی بنانے پر تلا رہا۔ وہ دیوی، دیوتا، جو اتنے ہی بھیانک ہیں، جتنی انھیں تخلیق کرنے والی جبلتیں۔ کبھی کسی ماہر نفسیات کو ہندو مندروں کے ان بھگوانوں کا تجزیہ کرنا چاہیے۔ انھیں اس میں انسانوں یا حیوانوں کی صورت میں واضح طور پر، ہر معلوم انسانی برائی کی پیش کش نظر آئے گی۔

یہ وہ طاقت ہے جو نسل انسان کے پانچویں حصے کو چلا رہی ہے اور یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو باقی دنیا کی فوری اور مسلسل توجہ کا مستحق ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب

سانس کے لیے وقفہ

ہندو جنگل میں ہماری سرگزشت نے واقعات کو کسی بھی زمانی ترتیب میں لانے کی ہماری کوششوں کو ناکام بنا دیا۔

ہم کہاں پر تھے؟ پشاور کے ایک ہسپتال میں .... اور اب ہم کہاں ہیں؟ بمبئی میں۔ اس اثنا میں گنگا سے بہت سا پانی گزر چکا ہے اور ہم کافی سمجھدار ہوچکے ہیں۔ اگرچہ تھوڑے کمزور ہیں .... ایک مصنف کے دردوغم، جیسا کہ ہم نے اس سے قبل ذکر کیا تھا، قابل فروخت نہیں ہونے چاہئیں۔ لہٰذا ہم خود کو یہ کہہ کر پابند کریں گے کہ ہندوستانی برسات کے زورشور کے زمانے میں دو میجر آپریشنز کے بعد کسی شخص میں بھی اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی طاقت نہیں ہوتی۔

ایک اور خود کلامی ....گزشتہ باب میں جو آرا بیان کی گئی تھیں اور جنھیں ہم اب ضبط تحریر میں لا رہے ہیں، کئی ماہ کے دوران قائم ہوئی تھیں۔ یہ پونڈیچری کے آشرموں سے بنارس کے مندروں تک، پورے ہندوستان کے مطالعے اور مشاہدے کے نتائج تھے ...... بمبئی میں، جہاں ہم نے خود کو اب موجود پایا ہے۔ ہمارے خیالات ابھی تک دھندلے اور سیال تھے۔ ہم عملی طور پر کچھ نہیں جانتے تھے اور حقیقت میں محظوظ ہو رہے تھے۔

ایک متجسس ذہن رکھنے والے شخص کی لاعلمی بھی ایک مسلسل اشتیاق اور مسرت کی حامل ہوتی ہے اور اس میں پہلی بار کوئی نقشہ کھینچنے جیسا جوش ہوتا ہے۔

وہ اپنے آپ سے کہہ سکتا ہے .... یہاں فلسفے کے سمندر ہیں، جنھیں میں نے کبھی عبور نہیں کیا اور شبہات کے پہاڑ ہیں، جنھیں میں نے کبھی سر نہیں کیا۔ سو وہ تجزیہ کرتا ہے اور ان وسیع ذہنی علاقوں تک رسائی کا شرف حاصل کرتا ہے، جو ابھی تک کھوجے جانے کے منتظر تھے۔

میں ہر چیز کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر تجربہ کرنا چاہتا تھا اور اس لمحہ موجود میں، میں جو کچھ کرسکتا تھا وہ ایک چھوٹی سی میز کے گرد آہستہ آہستہ گھومنا تھا۔ اس کے کناروں کو پکڑ کر۔ سہ پہر میں ایک آدھ منٹ کے لیے اور ہر روز چند ایک قدموں کا اضافہ کرتے ہوئے۔ دوبارہ دردوغم؟ لیکن کم از کم اس جبری تنہائی نے مجھے ہندوستانی

زندگی کے بعض پہلوؤں کے بارے میں غیر معمولی طور پر حساس بنا دیا تھا۔ وہ پہلو، جن پر فقط وہی لوگ غور کر سکتے ہیں جو ہفتوں بسترِ علالت پر پڑے رہیں۔ چنانچہ، اب...... جبکہ ہم صحت مند ہونے کا انتظار کر رہے ہیں، آیئے دیکھتے ہیں اور سُنتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہمیں کیا سیکھنا چاہیے۔ یہ میری اس دور کی ڈائری کے کچھ حصے ہیں۔ اگر ان سے کوئی بھی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو، تب بھی یہ اُس دور اور اُس جگہ کے ماحول کی دوبارہ تخلیق میں مدد دے سکتے ہیں۔

۲

آوازیں

میری زندگی عجیب آوازوں کے کورس سے گزر رہی ہے اور صرف انہی سے اسے ناپا جا سکتا ہے۔ سوائے نرس اور ڈاکٹر کی آمد کے وقفوں کے۔

پھیری والوں کی آوازیں گونجتی ہیں، جن میں سب سے اچھی آئس کریم والے کی ہے۔ اس کے پاس دھات کی دو پتریاں ہیں، جن پر وہ "سی شارپ" اور "ایف" بجاتا ہوا گلی کے آخری کونے تک جاتا ہے۔ سب سے اُداس آواز میٹھے کیک بیچنے والے کی ہے۔ وہ منہ سے آٹھ مرتبہ تقریباً دس بارز کی لمبی آواز لگاتا ہے۔ یہ ایک چوتھائی آواز میں اُبھرتی ہے اور درمیان میں دب جاتی ہے اور پھر ایک گہری سسکی کی صورت میں بالکل غیر متوقع طور پر مر جاتی ہے۔ اسے پہلی مرتبہ سُن کر میں نے سوچا تھا کہ یہ ایک بے اختیار لئے ہے اور اس کے چوتھائی سُر اور غیر متوقع تیز اور سیدھے سُر غلطی سے لگے ہیں۔ لیکن نہیں .... یہ پکار ہر مرتبہ بالکل ویسی ہی تھی اور اتنی پیچیدہ اور اختراعی تھی کہ الزبتھ سکمن اسے گانے کو تیار ہو جائے۔ سب سے پُراسرار آواز، مناسب طور پر سب سے پُراسرار پیشے کے لیے مخصوص ہے۔ یہ پنجارے کی آواز ہے جو روئی کے گدے بھرتا ہے اور ان گدوں کو کھٹملوں سے نجات بھی دلاتا ہے۔ اس کے پاس ایک بھدا سا ساز ہے جس سے ایک ضرب پڑنے پر بہت گہری آواز آتی ہے اور جب اسے تیزی سے چھیڑا جائے تو اس کی بازگشت زیادہ دُور تک پھیل کر گونجتی ہے۔ آواز کے طور پر یہ کافی منفرد ہے۔ اگر آرکسٹرا کے دونوں عظیم موجد واگنر اور چیسکووسکی اس کے بارے میں جانتے تو اسے ضرور استعمال کرتے۔ یہ بالکل بدقسمتی کی آواز کی طرح ہے۔

اور کوّے .... آف کورس .... ہر جگہ موجود اور دائمی ہیں۔ کوئی اور ان پر توجہ نہیں دیتا لیکن مجھے یہ تقریباً پاگل کر چکے ہیں۔ لیکن ان کی زندہ دلی کی تعریف کیے بغیر بھی رہا نہیں جا سکتا۔ قطار میں سے ایک

کوّا بالکل ناقابلِ یقین طور پر کائیں کائیں کرتا ہے اور ٹھونگیں مارتا ہے اور تمام کوّوں میں اپنا راستہ بنا کر آگے آتا ہے۔

علی الصبح ہی وہ میری کھڑکی کے باہر گہری کرخت آوازوں میں چلّانا شروع کر دیتے ہیں۔ تب میں بستر پر اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں اور دونوں ہاتھوں سے تالی بجاتا ہوں۔ جواب میں وہ چلّا کر کہتے ہیں "جہنم میں جاؤ" جب میں ٹھیک ہو جاؤں گا تو انھیں کاغذ کی گولیاں ماروں گا۔ تب وہ ناریل کے نزدیکی درخت کی بلند ترین شاخوں پر چلے جائیں گے اور وہاں سے چلّائیں گے۔

پارسی رواج

میں "اے" کے کچھ دلچسپ پارسی دوستوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا ہوں جو مجھ پر رحم کھاتے ہیں۔ حالانکہ اگر وہ جانتے کہ یہ سب کتنا طویل ہونے والا ہے، پریس اور افواہوں اور رپورٹروں اور نرسوں سمیت ...... تو مجھے مدعو کرنے سے پہلے ایک بار ضرور سوچتے۔

جب میرا اسٹریچر فلیٹ تک لے جایا گیا تو میں نے ایک بے حد دلچسپ اور مسرت انگیز چیز دیکھی۔ راستے کے دونوں طرف چمک دار فرش پر چاک سے بنائے ہوئے پھولوں کے ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔ جنھیں پہلی نظر میں دیکھ کر آپ سمجھتے کہ کسی نے ڈیزی کے گجرے پھیلا دیے ہیں۔ میرے استفسار پر انھوں نے بتایا کہ یہ بہت قدیم پارسی رواج ہے...... پُرانے وقتوں میں وہ اپنے گھروں کے دروازوں پر چاک پھیلایا کرتے تھے کیونکہ یہ کسی حد تک جراثیم کُش ہوتا ہے۔ کچھ حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے اور کچھ بُری روحوں کو دور رکھنے کے لیے۔

ہر روز کچھ چاک صفائی کے دوران صاف ہو جاتا ہے اور ڈیزائن تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ڈیزائن، ایک نفیس سوراخ دار ڈبے میں چاک بھر کر بکھیرنے سے بنائے جاتے ہیں۔ بس ڈبے کو فرش پر تھپتھپانے کی دیر ہے کہ ڈیزائن تیار۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ ڈیزائنوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے...... ایک دن یہ مچھلی کی صورت میں ہوتے ہیں، دوسرے دن پتوں یا پھلوں کی شکل میں۔ سب سے خوبصورت ڈیزائن جادوئی حروف کا ہے جس میں 'A' کا مطلب فارسی توجیہہ کے مطابق بیماروں کی مدد ہے۔ آیا ہر روز یہ ڈیزائن بنانے کی کوشش کرتی ہے کہ شاید اس سے مجھے کوئی فائدہ پہنچ سکے۔

مون سون

برسات شروع ہوچکی ہے ...... لائیسیم کا خالص میلوڈراما۔ اگر سرسٹ ماہم چھولداری میں بیٹھ کر "RAIN" کی ریہرسل دیکھ رہا ہوتا اور پروڈیوسر نلکے کو بہت تیز کھول دیتا اور لائٹس کو بھی نیلا کردیتا ...... تو وہ ریہرسل رکوادیتا اور ...... بالکل صحیح طور پر ...... پروڈیوسر سے کہتا کہ یہ فضول خرچی لوگوں کو ہنسنے پر مجبور کردے گی۔ برسات ایک گھٹیا اداکار کی طرح ہے۔ واقعی ...... اس کے علاوہ اس کے لیے کوئی اور لفظ نہیں ہے۔ بادل، قدیمی "PUNCH" کارٹون فلموں کے بادلوں کی طرح اُمڈ کرآتے ہیں ...... اور برینانیا ایک طوفان رسیدہ چٹان پر، ایک ہاتھ میں ترشول اور دوسرے میں انصاف کا ترازو لہراتے ہوئے اکیلی کھڑی ہے۔

کپتان عام طور پر اس قدیم یادگار کو سفر میں ساتھ لے جاتے ہیں۔ جب بادلوں کے جمع ہونے کا عمل طویل ہوجاتا ہے۔ تجسس کے ناقابل برداشت ہونے کی حد تک تو پہلا قطرہ گرتا ہے ...... تنہا ...... حیرت کی حد تک تنہا ...... قطرہ ...... قطرہ ...... جسے انگریزی میں بڑے "D" کے ساتھ "Drop" لکھا جانا چاہیے۔ قطرہ ...... جو "نقیب" ہے (نقیب کے علاوہ کوئی اور لفظ استعمال نہیں ہونا چاہیے)۔ شاندار موسلادھار بارش کا، زندگی بخش دھاروں کا، اُبلتے ہوئے چشموں کا، اور اسی طرح کی دیگر تمام چیزوں کا جن میں اناج کے موٹے ہندو ساہوکاروں کی بھری ہوئی تجوریاں بھی شامل ہیں جو اچھی فصلوں پر شرطیں لگاتے رہتے ہیں۔ میں بارش سے محبت کرتا ہوں لیکن یہ بارش حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ ناقابل برداشت۔ یہ ہلکے نیلے آسمانوں کی بجائے طوفانی آسمانوں سے گرتی ہے۔ گلیوں کو دریاؤں میں اور انسانوں کو پانی کے ڈرموں کے اندر چیونٹیوں میں بدلتے ہوئے۔

ملازم

میں فلیٹ میں (جس میں رہائش پذیر تھا) ملازموں کی بھرمار کا بالکل عادی نہیں ہو پایا۔ لائنل بٹلر اور اس کا نائب ...... جیکی خانساماں اور اس کا نائب ...... راما گھریلو ملازم ہے۔ آیا، ملازمہ اور میرا ذاتی خدمت گار حسین ...... سات، تین بیڈرومز کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں ...... اتنی بڑی جگہ جسے انگلینڈ میں ایک ایسی بوڑھی ملازمہ سنبھال سکتی ہے جو دن بھر میں صرف تین گھنٹے کے لیے آتی ہو۔

یہ ملازمین عجیب و غریب جگہوں پر سوتے ہیں جو شخص بھی رات کو دیر سے لوٹتا ہے اُسے ان میں سے تین چار کو پھلانگ کر گزرنا پڑتا ہے، جو لابی میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو کر سو رہے ہوتے ہیں۔ جیکی کچن

کی میز پر سوتا ہے اور آیا بعض اوقات کپڑوں کی ٹوکری پر آرام کرتی ہے۔ ایک دن صبح دیر تک راما نظر نہیں آیا۔ جب اس کی گمشدگی کا یقین کرکے تلاش ترک کردی گئی تو دوپہر کے کھانے سے ذرا پہلے "اے" کو صوفے کے نیچے ایک چھوٹا سا پاؤں نظر آیا۔ وہ پاؤں راما کا تھا جو گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے خود کو اتنی چھوٹی جگہ میں کس طرح رینگ کر داخل کیا ...... یہ ایک راز ہے!

گزشتہ کل ہم نے اُس روایتی طریقۂ کار کا مشاہدہ کیا جس میں مذہبی توہم پرستی ایک عام نوعمر ہندوستانی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کچن میں کام کرنے والا لڑکا کسی کام سے میرے کمرے میں آیا اس کی ٹانگ پر چوٹوں کے دہشت ناک نشانات تھے۔ رات کو جب ڈاکٹر آیا تو میں نے اس سے کہا "تمھیں اس لڑکے کی ٹانگ کے لیے ضرور کچھ کرنا چاہیے"۔

"میں نے کوشش کی تھی کہ وہ کچھ ہفتے کے لیے ہسپتال چلا جائے" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"لیکن وہ نہیں گیا"۔

"کیوں نہیں گیا؟"

"کیونکہ اسے وہ چوٹیں پیپل کے پیڑ سے گر کر لگی ہیں اور تم جانتے ہو کہ پیپل کا درخت ان کے نزدیک مقدس ہوتا ہے اور اُسے اس درخت پر بالکل نہیں چڑھنا چاہیے تھا۔ لہٰذا اس کا خیال ہے کہ وہ اس لیے گرا کیونکہ دیوتا اس سے ناراض ہوگئے اور ان کی سزا سے بچنے کی کوشش کرنا بھی جرم ہے"۔

حسین میرا ذاتی ملازم، جس کا تعارف بہت پہلے ہوجانا چاہیے تھا۔ میرے ساتھ ہر جگہ رہا تھا اور کئی مواقع پر مجھے اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر، جب میں چل پھر نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک تنومند پٹھان ہے۔ چھ فٹ سے بھی اونچا۔ لباس میں ایسا تنوع ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کو عجیب لگتا ہے۔ اُس نے اپنے پہلے ہی فقرے سے میرے دل میں اپنے لیے پسندیدگی پیدا کرلی تھی۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے سابق مالک کا پیشہ کیا تھا؟ تو اس نے جواب دیا "وہ بوت اچھا صاب وہ آرمی اور نیوی میں لیفٹیننٹ"۔

وہ میرے دوستوں سے بہت خار کھاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک دلکش نوجوان چینی لڑکی یہاں ٹھہری ہوئی ہے، جو بعض اوقات تھوڑی دیر گپ شپ کے لیے اندر آجاتی ہے۔ حسین اس کی طرف اس طرح دیکھتا ہے، جیسے کسی زہریلی شے کی طرف دیکھ رہا ہو ...... اور جب میں اس سے لڑکی کے بارے میں استفسار کرتا ہوں تو بہت تلخی سے جواب دیتا ہے۔ "کیا مس وانگ اندر ہے"؟ میں معصومیت سے

پوچھتا ہوں۔

''ہاں صاب'' وہ تملا کر کہتا ہے۔ ''وہ چائنا میم صاحب .... وہ اندر ہے۔ وہ ہمیشہ اندر ہوتا ہے۔ وہ کبھی باہر نہیں جاتا۔ وہ چائنا میم صاحب''۔

ہر صبح جب وہ میرے کمرے کے پردے ہٹانے کے لیے آتا ہے تو میری طرف دیکھ کر افسوس سے سر ہلاتا ہے۔ ''بوت تکلیف اُٹھایا صاب .... ہندوستان میں۔ بوت تکلیف''۔ پھر اضافہ کرتا ہے۔ ''لیکن اللہ ...... وہ ضرور ایک دن یہاں نیچے آئے گا''۔ میں حسین کو بہت زیادہ معاوضہ دیتا ہوں۔ اتنا زیادہ کہ اگر میرے انگریز دوست پوچھ لیں تو میں انھیں اس کا نصف بتاتا ہوں، پھر بھی وہ پھٹ پڑتے ہیں۔ یہ کثیر معاوضہ ...... جہاں تک میرا تعلق ہے .... سخاوت کی وجہ سے نہیں بلکہ کمزوری کی وجہ سے ہے .... کیا؟ .... کمزوری اس وجہ سے کہ ہاں، مجھ میں ہمت نہیں کہ اپنے ملازموں سے کہوں کہ میرے لیے وہ پھول خرید کر لائیں، جن کی قیمت ان کی ایک ہفتے کی تنخواہ کے برابر ہے۔ لیکن شاید میں کچھ انسان دوستی وغیرہ کے جذبات سے بھی مغلوب ہوں۔ شہر میں ایک ذاتی خدمت گار کی عام تنخواہ پینتیس روپے ماہانہ ہے جو صرف تیرہ شلنگ فی ہفتہ بنتے ہیں۔ اُسے اسی تنخواہ میں اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالنا ہوتا ہے۔ پیچھے گاؤں میں رقم بھیجنی ہوتی ہے۔ تفریح کرنی ہوتی ہے اور بچت بھی .... جب میں دوسرے مالکوں سے کہتا ہوں کہ اس طرح تو ان ملازمین کی زندگی کافی مشکل ہوگی تو وہ پھنکار کر کہتے ہیں ''یہ لوگ تیل میں بھیگی ہوئی دھجی کی بُو پر بھی گزارہ کر سکتے ہیں''۔ لیکن میں ان لوگوں میں گھر ا رہنا پسند نہیں کرتا جو تیل میں بھیگی ہوئی دھجیوں کی بُو پر گزارا کرتے ہوں۔ انھیں اس گھٹیا سماجی سطح پر رکھنے سے مجھے اپنی سماجی توہین کا احساس ہوتا ہے۔

گزشتہ رات ''اے'' کے ایک دوست کو اچانک یہ حقیقت معلوم ہوگئی کہ حسین کی تنخواہ کیا ہے اور وہ دندناتا ہوا میرے کمرے میں داخل ہوا ...... مجھے ایک طویل اور .... میرا خیال ہے .... شدید مخلصانہ لیکچر دینے کے لیے کہ میں مارکیٹ کو خراب کر رہا ہوں۔ میں بہت جذباتی اور گرم ہو گیا اور جواب دیا کہ اگر میں مارکیٹ کو خراب کر رہا ہوں تو یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات ہے اور جتنی جلدی یہ مارکیٹیں خراب ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔ نرس تھرمامیٹر لے کر آئی تو بحث کا یہ سلسلہ ختم ہوا۔ تھرمامیٹر پر اس طیش کا درجہ ۱۰۱ ڈگری تھا۔

لوئیس بروم فیلڈ

ایک نوجوان ہندوستانی طالب علم ملنے کے لیے آیا اور کہنے لگا کہ اُسے اُمید ہے کہ اگر میں کبھی

ہندوستان کے بارے میں کوئی کتاب لکھوں گا تو اس میں اس قدر بنیادی غلطیاں نہیں ہوں گی جس قدر لوئیس بروم فیلڈ نے کی تھیں۔ اُس نے کئی مثالیں دیں، جن میں سے مجھے دو یاد ہیں۔ جیسے ''Night in Bombay'' میں ہیرو کشتی پر ساحل کی طرف آتا ہے اور مشرق کی جانب ایلیفنٹا غار اور مغرب کی جانب جوہو دیکھتا ہے۔ جبکہ اگر اس کے پاس بہت طاقتور ڈوربین بھی ہو، تب بھی یہ ممکن نہیں ہے اور فلم ''The Rains Came'' میں مہارا جانے وہ پگڑی پہن رکھی ہے جو صرف نچلے درجے کے خاکروب پہنتے ہیں جبکہ مہارانی ننگے پاؤں گھومتی ہے اور یہ اسی طرح ناقابل تصور ہے جیسے مسز روز ویلٹ پاجامہ پہن کر امریکی انقلاب میں شریک خواتین سے خطاب کریں۔

☆☆☆

تیسرا باب

اخبارنویس

ہم نے کافی وقفہ لے لیا اور اب وقت ہے کہ اپنی تحقیقات کا از سرِ نو جائزہ لیں۔

بیڈ پر بے کار پڑے پڑے اخبارات کے صفحۂ اوّل کی خبروں کا موضوع بن چکا تھا۔ ایک صبح ''اے'' اخبارات اُٹھائے ہوئے میرے کمرے میں آیا اور بولا ''ان کی نظر میں تم روسی جارحین سے بھی بڑی قسم کے جارح ہو۔ میرے خیال میں تم جارح تو ہو سکتے ہو مگر ایسے نہیں، جیسا اُنھوں نے لکھا ہے۔

اس نے اخبارات اور رسائل کا ایک پلندہ میرے بستر پر پھینکا۔ وہ سب کے سب چیختی ہوئی سرخیوں میں ایک ہی کہانی دہرا رہے تھے۔

''بیورلے نکولس کا راز گہرا ہوتا جا رہا ہے''۔

''نکولس نے ابھی تک منہ نہیں کھولا''۔

کئی اہم مضامین میں میرے ''مشن'' پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے تبصرے کیے گئے تھے۔ کئی تحریروں میں میرے کوائف کی طرف اشارے تھے۔ پُر جوش خطوط کے کئی کالم تھے۔ دو کارٹون اور بہت سی تصاویر تھیں۔

عام طور پر ایسی پبلسٹی پر آدمی پھولا نہیں سماتا مگر اس وقت یہ میرے لیے شرمندگی کا باعث تھی۔ میں ایک آزاد تفتیش کنندہ کے طور پر خاموشی سے ہندوستان کا چکر لگانا چاہتا تھا لیکن ہندو پریس خود ان تمام متنازعہ سوالات کے جواب کے لیے دہائی دے رہا تھا جن کا جواب تلاش کرنے کی کوشش خود میرے لیے بے موقع تھی۔ ''سٹیفورڈ کرپس تک کے لیے یہ اتنا خطرناک نہیں تھا۔ جتنا تمھارے لیے ہو چکا ہے۔'' ''اے'' نے کہا ''اسے دیکھو''۔ وہ ایک بہت بڑی تصویر تھی جس میں ایک نوجوان پاؤں پر پٹی باندھے بیڈ پر لیٹا تھا۔ اس تصویر کو بڑی چالاکی سے میرے پورٹریٹ کا عنوان دیا گیا تھا۔ اس کی سرخی تھی "My Foot" یہ وہ اخبار تھا جو کئی روز سے میری تصویر کا تقاضا کر رہا تھا۔

''اب تم اس بارے میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' ''اے'' نے پوچھا۔

''کچھ نہیں!''

''میرا خیال ہے تم اس سب کے مطالعے کے بعد اپنا ارادہ بدل دو گے''

اور میں نے ایسا ہی کیا۔ اس اخباری مہم کے بعض حصے ایسے تھے جن کے بارے میں کوئی اقدام کرنا بہت ضروری تھا۔ اب محض تاثر نہیں دیا جا رہا تھا بلکہ کھلم کھلا یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا کہ میں حکومتِ برطانیہ کا ایک ایجنٹ ہوں کہ میری آرا حکومتی پالیسی کی آئینہ دار ہیں...... یہاں تک کہ میں ان کے درمیان گفت وشنید میں کوئی کردار ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ اگرچہ یہ نشاندہی نہیں کی گئی تھی کہ یہ ''گفت وشنید'' کیا ہے اور کن لوگوں کے درمیان ہے۔

اور اس طرح، چند روز بعد، میں نے اپنے آپ کو گھسیٹ کر بستر میں سے نکالا۔ مجھے سیڑھوں سے اُتارا گیا اور ایک ایمبولینس میں ڈال کر ہندوستانی پریس کے نمائندوں سے ملاقات کے لیے لے جایا گیا[1]۔

۲

''ہندوستانی اخبار نویس رن اموک...... بیورلے نکولس ملاقات، ایک تلخ تجربہ''[1] یہ ایک عمومی انداز تھا جس سے ہندوستانی پریس تمام معاملات پر روشنی ڈالتا تھا۔ درج بالا سرخی تو کافی حد تک کم بیانی تھی۔

میں لنگڑاتے ہوئے اُس کمرے میں داخل ہوا جو فرش سے چھت تک اخبار نویسوں سے اَٹا ہوا تھا۔ ان میں زیادہ تر نوجوان تھے اور تمام تر...... ایسا نظر آتا تھا کہ ہسٹیریا میں مبتلا تھے۔

وہ میز کے گرد ہجوم کر آئے...... میرے ٹخنوں سے جُوے ہوئے اور میری گردن پر سانسیں لیتے ہوئے...... وہاں موجود لوگوں میں، میں واحد گورا تھا۔ سوائے چیئرمین مسٹر ہورنیمین کے جو کئی برس سے شام کے ایک وحشیانہ طور پر برطانیہ مخالف اخبار ''The Bombay Sentinel'' کا ایڈیٹر ہے اور ہر شام شہر والوں کی تواضع اپنے کالم ''Twilight Twitters'' سے کرتا ہے۔ عنوان کافی موزوں ہے کیونکہ "twilight" سے لکھنے والے کی ذہنیت کی عکاسی ہوتی ہے اور "twitters" سے اس کے طرزِ تحریر کی...... یہ بتانا غیر ضروری ہے

(۱) یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ''ہندو انڈین پریس'' سے، ہندو تمام تر مراعات کے مالک ہیں۔ اس لیے تمام تر شور بھی وہی مچاتے ہیں۔ دس کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی مقابلتاً ناکافی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا نمائندہ ایک ہی اخبار صرف "DAWN" ہے اور وہ اگرچہ برطانیہ کا حمایتی نہیں ہے تاہم اپنے مخالفین کے ساتھ ایک رواداری کے ساتھ پیش آتا ہے۔ بلاشبہ بعض انتہا پسند مسلم اخبارات بھی ہیں لیکن ہندوؤں کے چیختے چنگھاڑتے صفحات کے مقابلے میں مسلم پریس کافی شائستہ، معقول اور سب سے بڑھ کر صاف گو ہے۔

(۲) ''قیصرِ ہند''، ۵- مئی ۱۹۴۳ء۔

کہ یہ کالم کافی مقبول ہے۔

یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ مجھے مسٹر ہورنیمین سے کوئی لگاؤ پیدا نہیں ہوا۔ یہ بھی برابر کی مصدقہ حقیقت ہے کہ اس نے بھی میرے لیے کسی شوق کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ملاقات کے کئی ہفتے بعد تک وہ اپنے اخبار پھبتیوں، ہجوؤں اور حقارتوں سے بھرتا رہا۔ "The Bombay Sentinel" کے لیے کوئی تحقیری رویہ بہت گھٹیا نہیں تھا اور کوئی افواہ بہت غیر منطقی نہیں تھی۔ سب سے سنسنی خیز اور من گھڑت کہانی اس کے پہلے صفحے پر چھپنے والی اس خبر میں تھی کہ مجھے حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان کا آئندہ وائسرائے منتخب کیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے اپنے تحفظ کے لیے اس ''افواہ'' کو سچ ماننے سے انکار بھی کر دیا تھا۔

''نکولس نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کیا''۔ اُس نے اپنے قارئین کو یقین دلانے کے لیے لکھا تھا۔ ''وہ اس منصب کی پیچیدگیوں کی وجہ سے اسے قبول کرنے سے سخت خوفزدہ ہے''[1]۔ یہ میٹنگ ان تمام روایتی اجلاسوں سے ملتی جلتی تھی جن سے میں پہلے بھی خطاب کر چکا تھا۔ کیونکہ پہلے ہی لمحے سے یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ کسی شخص کی نیت بھی کچھ سننے کی نہیں ہے۔ میں ابھی تک خود کو ہندوستان کے بارے میں بات کرنے کا اہل نہیں سمجھتا تھا، لہٰذا میں نے انگلینڈ کے بارے میں بات شروع کر دی.......... عام انگریز مردوں اور عورتوں کے بارے میں...... جنھیں میں نے اپنی آسانی کے لیے مسٹر اینڈ مسز سمتھ کا نام دیا...... وہ کیا سوچتے تھے؟ وہ کس طرح تبدیل ہوئے؟ جنگ کے بعد دنیا کے بارے میں ان کا رویہ کیا تھا؟ ان سوالات کے جواب دینے کے لیے مجھ میں خاطر خواہ صلاحیت تھی۔ یہ جوابات وسیع اور یقینی اہمیت رکھتے تھے اور ہندوستانی مسائل پر براہِ راست طریقے سے منطبق ہوتے تھے۔

چند منٹ کے بعد گفتگو کو جاری رکھنا ناممکن ہو گیا۔ چیخوں، چنگھاڑوں اور بلبلاہٹوں نے فضا کو بھر دیا۔ ''ایک سوال''............ ''ایک سوال'' وہ ایک کے بعد ایک چیخ رہے تھے۔ یہاں تک کہ حاضرین کی آدھی تعداد اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جبکہ باقی آدھے انھیں کھینچ کر بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس اثنا میں لکھے ہوئے سوالات کی پرچیاں میز پر پھینکی جاتی رہیں۔

بہت احتیاط سے قائم رکھا ہوا درجۂ حرارت، میرے اندر تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ جیسے کسی نے تھرمامیٹر کو چائے کی پیالی میں ڈال دیا ہو............ میں نفرتوں کی عین زد پر تھا۔ لوگوں کی نفرت...... یہاں وہ

(۱) "Bombay Sentinel"، ۵- مئی ۱۹۴۳ء۔

نعرہ "ہندوستان چھوڑ دو" میری زندگی میں در آیا تھا۔ یہاں وہ آدمی موجود تھے جو اندھیرے میں دیواروں پر نفرت بھرے نعرے لکھتے ہیں۔ یہاں تخریب کاروں کی سفلی فوج کے محافظ موجود تھے، عمل میں نہیں تو ارادے میں......... یہاں ہندو قوم پرستی بے لباس اور بے باک تھی اور اگر ایک سطحی تشبیہ استعمال کی جائے تو...... اس کی مشکیں پوری طرح نہیں کسی گئی تھیں۔

چیئر مین نے اس شورش کو دبانے کی کوشش کی۔ اگلے چند منٹ تک میں جواب دینے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن بے سود......... ان آدمیوں کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ فوں فوں......... وہ ایک انگریز کے خون کی بُو سونگھ رہے تھے۔ یہ مجھ جیسے ایک شخص کے لیے جو محض بیئر کے ایک گلاس پر گپ شپ کے خیال سے آیا تھا۔ ایک ششدر کر دینے والا تجربہ تھا۔

"تم ہندوستان سے چلے کیوں نہیں جاتے تاکہ ہم (ایک تبدیلی کے طور پر) جاپانیوں کو آزما سکیں"؟

"تم نے چرچل کو پھانسی کیوں نہیں دی"؟

"آخر برطانیہ اور جرمنی میں فرق کیا ہے"؟

یہ تین سوالات تھے جن کو میں نے سنجیدگی سے لیا۔ وہ امریکہ کے بھی اتنے ہی خلاف تھے، جتنے برطانیہ کے۔

"امریکی افسر اپنے سیاہ فام فوجیوں کو اپنے کلبوں میں کیوں نہیں آنے دیتے"؟ کم از کم چھ اشخاص نے یہ سوال کیا۔

"روز ویلٹ کو اٹلانٹک چارٹر پر دستخط کرنے کی جرأت کیسے ہوئی جبکہ امریکہ میں نیگروز کو برابر حقوق حاصل نہیں ہیں"؟

"کیا برطانیہ نے روز ویلٹ کے ساتھ کسی معاہدے پر دستخط کیے ہیں کہ وہ نیگروز کا اسی طرح قتل کریں گے، جس طرح برطانیہ ہندوستانیوں کا قتل کر رہا ہے"؟

ایک گھنٹے سے زیادہ یہ غل غپاڑہ جاری رہا۔ میں اس پر مزید تبصرہ نہیں کروں گا۔ بہتر ہے کہ اسے ہندوستانی اخبار نویسوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے۔ جن میں کچھ شرافت کے نمونے بھی اس کمرے میں موجود تھے۔ خود انھوں نے اس وقت جاری ہنگامے میں مداخلت کی کوشش نہیں کی۔ اگلے روز کے "Times of India" میں ان میں سے ایک نے یہ مہربانی کی۔ "جس حیران کن درگزر اور حسِ لطیف کے

ساتھ نکولس نے اس وحشت ناک صورت حال کا سامنا کیا، ہم اس کی صرف تعریف ہی کر سکتے ہیں"۔

"Indian Annalist" نے یہ تبصرہ کیا "ہم صرف اُمید کر سکتے ہیں کہ نکولس اس گھٹیا سلوک کی کسوٹی پر ہندوستان کو نہیں پرکھیں گے جو زرد صحافت کی بدمعاشی کے نمائندہ، ناپختہ اخبار نویسوں کے ہاتھوں ان سے روا رکھا گیا"۔

"Sunday Standard" نے لکھا "اگر یہی انداز پذیرائی ہے تو ہماری تجویز ہے کہ آنے والوں پر، جنھیں اتفاق سے جارحیت کی کوئی وجہ نہیں بتائی جاتی، یہ واضح کر دیا جائے کہ ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ دنیا بھر میں ہمیں سنجیدگی سے لیا جاتا ہے"۔ بدقسمتی سے، دنیا بھر کے لوگ ہندوستانی پریس کو سنجیدگی سے لیتے ہیں، لہٰذا ہم اس کے جائزے میں کچھ توقف کریں گے۔

۳

پہلی چیز جو کسی پیشہ ور مغربی صحافی کو ایک عام ہندوستانی اخبار کے بارے میں حیرت میں مبتلا کرتی ہے وہ اس کی مختصر تعداد اشاعت ہے۔ وطن میں وہ کروڑوں میں سوچنے کا عادی ہوتا ہے یا کم از کم لاکھوں میں......... اور یہاں...... ایسے ملک میں جہاں ہر چیز اتنے وسیع پیمانے پر ہے......... وہ اخبار کی دو یا تین ہزار کاپیوں کے بارے میں سنتا ہے...... یا بعض صورتوں میں دو تین سو۔

یہ کہنا بے کار ہے کہ یہ تجزیہ اخبارات کے معیار پر بات کرنے کے لیے نہیں کیا جا رہا۔ کیونکہ صحافیانہ قابلیت یہاں اکثر تعدادِ اشاعت کے لیے مخالف کردار ادا کرتی ہے اور چند ہزار کی اشاعت پر مبنی کسی اخبار کا ہفتہ وار تبصرہ، بڑے بڑے اور مقبول ترین اخبارات کی نسبت، بڑی طاقتوں کو چلانے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ حقیقت کہ اتنی کم اشاعت والے ہندوستانی اخبارات کے اثرات کیا ہیں، بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کا سب سے پہلا مطلب یہ ہے کہ اخبار نویس کو کوئی تنخواہ وغیرہ نہیں ملے گی۔ جیسا کہ انگلینڈ میں ایک کامیاب جرنلسٹ، تنخواہ میں کسی بھی دوسرے پیشے سے تعلق رکھنے والوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ہندوستان میں وہ خواہ چوٹی پر جا پہنچے ایک مفلس آدمی رہے گا۔ ہندوستان کے اخبار نویس افلاس کی لکیر کے آس پاس ہی رہتے ہیں۔

اس کا مطلب ہے کہ ہندوستان کی نئی نسل کے اچھے ذہن اس پیشے کی طرف بہت کم راغب ہوتے

ہیں۔ لہٰذا یہ خلا ناکارہ لوگوں سے پُر کیا جاتا ہے...... بی اے فیل...... خاندان کی کالی بھیڑیں...... ہندوستان میں چند معروف لوگوں کو چھوڑ کر، اخبار کے رپورٹرز کو انٹرویو دینا، انتہائی محنت طلب کام ہے۔ آدمی کو زیادہ تر انگریزی تین مختلف تلفظات کے ساتھ بولنی پڑتی ہے اور بین الاقوامی اہمیت کی شخصیات کے حوالوں پر صرف سپاٹ نظروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس قدر کم تنخواہوں کا ایک اور تشویش ناک نتیجہ یہ ہے کہ وہ بدعنوانی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اگلے کسی باب میں، میں نے آل انڈیا فلم پبلسٹی کے ڈائریکٹرز میں سے ایک کا، جو خود بھی ایک ہندوستانی ہے، ایک فقرہ نقل کیا ہے۔ اس نے کہا "ہندوستان میں فلمی تنقید کے دو ہی معانی ہیں۔ رشوت یا بلیک میل"...... اُس کی یہ تنقیص، تنقید کی دیگر اقسام پر بھی منطبق ہوتی ہے۔

نتیجتاً یہاں عوامی رائے کا عملی طور پر کوئی خود مختار رہنما موجود نہیں ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مغرب میں ہم اپنے اخبارات کو قوم کے لیے سوچنے کی اجازت دیتے ہیں یا کم از کم وہ اخبارات، بدعنوانی سے مبرا مبصرین کی بڑی تعداد کو بات کرنے کے لیے پلیٹ فارم مہیا کرتے ہیں (مثال کے طور پر "London Evening Standred" میں "Low" کے کارٹون اکثر بیوربروک کی پالیسیوں کے خلاف ہوتے ہیں۔ ڈورتھی تھامسن کا جنگ کے ابتدائی حصے کے بارے میں مئی ۱۹۴۱ء، مشاہدہ اُس کے ادارتی بورڈ کے لیے یقیناً مستقل دردِ سر ہوگا) مگر ہندوستان میں کوئی نہیں پوچھتا "ڈورتھی تھامسن نے کیا لکھا"؟......... "والٹر لپمین کیا کہتا ہے"؟......... "کیا جے بی پریسلے نے کسی رائے کا اظہار کیا"؟ کیونکہ ہندوستان میں کوئی ایک شخص ایسا نہیں جس کا ان سے واسطہ پڑا ہو...... یہاں سیاست دانوں کا حلقہ تو ہے لیکن کوئی قومی دائرہ نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کوئی قومی (درباری) مسخرہ تک موجود نہیں ہے اور ابھی یہ بھی بتانا ہے کہ یہاں فنونِ لطیفہ کے کسی قومی نقاد کا وجود نہیں ہے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ یہاں مطالعے کے لیے کوئی فنونِ لطیفہ اور دیکھنے کے لیے کوئی تمیز موجود نہیں ہے[۱]۔

ہندوستان منفیت کا ایک عظیم سلسلہ ہے اور اس کی یہ مغموم حقیقت بے حد دیانت داری سے اس کی پریس میں جھلکتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ منفی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی ٹھوس تعداد کے سوا یہاں کوئی عوامی

(۱) دیکھیے ایک آئندہ باب بعنوان "فن کاری کی تلاش"

رائے نہیں ہے۔ صرف عوامی آرا کی مختلف اقسام ہیں جو بالکل الگ چیز ہے...... جس ملک میں ایک "قوم" بستی ہو، وہاں آپ عوام کی نبض کو محسوس کر سکتے ہیں۔ کم از کم آزمایش کے وقتوں میں...... یہ ایک آہنگ میں دھڑکتی ہے...... اس طرح کہ اسے ناپا اور جانچا جا سکتا ہے۔...... لیکن ہندوستان میں عوام کی نبض ناقابلِ تعیین ہے...... یہ آپس میں ٹکراتی ہوئی پھڑ پھڑائیوں کا ایک سلسلہ ہے۔

یہاں ہندوستان کی 'کتابِ ابیض' سے ایک مثال پیش کی جا رہی ہے۔ جب اس کا موازنہ برطانیہ کے سادہ، ٹوری، لبرل اور لیبر گروپوں سے کیا جائے گا تو اس سے ہندوستان کی سیاسی رائے کے مایوس کن تضادات کی تصویر کشی ہوگی[۱]۔

اخبارات	سرکولیشن	عمومی رائے
بمبے کرانیکل	۱۸،۰۰۰	کانگریس کی سرکاری پالیسی کا ترجمان
بھارت	۵،۰۰۰	بے حد تنگ نظر۔ ہندو مہا سبھا (دائیں بازو کی ہندو جماعت) کا طرف دار۔
بمبے سینٹینل	۹،۰۰۰	پکا کمیونسٹ، برطانیہ مخالف اور کانگریس کی سرکاری پالیسی کا مستقل نقاد۔
انڈی پینڈنٹ انڈیا	۳،۰۰۰	موجودہ کانگریس پالیسی کا شدید نقاد، ہندوستان کی جنگ میں شمولیت کا وکیل، کمیونسٹ جھکاؤ۔
جنتا	۳،۰۰۰	اُچھوتوں کے طرزِ فکر کا ترجمان۔
جنم بھومی	۱۶،۰۰۰	ہندوستانی سرکار کے معاملات کا مضبوط وکیل۔
قوم سیوک	۳،۰۰۰	پارسیوں کے معاملات سے متعلق۔ روادار۔
مسلم گجراتی	۳،۰۰۰	سخت طبقاتی۔ مسلم لیگ کا حامی۔
پربھات	۶،۵۰۰	کیسری (Kesari) فکر کا حامل۔ روادار۔
روزانہ خلافت	۴،۰۰۰	مسلمان آبادی کے حقوق کا علمبردار، کانگریس کا شدید نقاد، انتہا پسند، سیاسی فکر کا حامل۔

(۱) برطانوی ہند اور وہاں کی ریاستوں سے شائع ہونے والے انگریزی اور مقامی اخبارات و رسائل کی فہرست

اس مختصر تعداد میں ہم ''ہندوستان کی آواز'' کو کہاں تلاش کریں؟ اگر یہ سوال نامناسب معلوم ہو تو یاد رکھیے کہ ان میں سے کئی اخبارات کافی نمایاں اور بااثر ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً چار ہزار اخبارات مزید ہیں، جن کی سرکولیشن ایک ہزار سے بھی کم ہے۔ کم علمی پر مبنی اور شدید تضادات کے حامل ان چیتھڑوں کو کانگریس کے رہنماؤں کی طرف سے ''ہندوستانی عوام کی رائے'' کے طور پر پیش کیا جاتا ہے[1]۔

۴

یہ رائے کافی سخت ہے لیکن ایک تلخ تجربے کا نتیجہ ہے۔ عالمی پریس کے واقفیت رکھنے والے اس سے اتفاق کریں گے کہ یورپ کے کسی بھی حصے میں بادشاہت کی یا امریکہ کی خبر رسانی کے معاملے میں ہندو پریس جیسی جھوٹ اور بددیانتی کی دھندلی سی مشابہت کا سامنا بھی نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں جھوٹ، فنونِ لطیفہ کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ بلاواسطہ اور بالواسطہ جھوٹ......ترمیم و اضافے کا جھوٹ...... بہتان طرازی اور اشارے کنایے کا جھوٹ.......... یہاں ایک مثال پیش ہے۔ جب میں علالت کی حالت میں تھا تو میں نے تار کے ذریعے ایک مضمون انگلینڈ بھجوایا۔ جس میں ان ہندوستانی ڈاکٹروں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا، جنھوں نے بیماری کے دوران میرا علاج کیا۔ اس مضمون میں ہندو نرسوں کی صلاحیت اور جذبۂ خدمت کی تعریف بھی کی گئی تھی۔ ہر چند اس میں یہ نشاندہی کی گئی تھی کہ ہندوستان میں نرسوں کی شدید کمی کی وجہ بدقسمتی سے یہ ہے کہ یہاں کی خواتین اس پیشے کو حقیر گردانتی ہیں۔ اس مضمون کا لب لباب یہ تھا:

---

(۱) خاص بات یہ ہے کہ جن اخبارات کی سرکولیشن سب سے زیادہ ہے وہ انگریزی زبان میں شائع ہوتے ہیں، ان کے قارئین کی تعداد تقریباً ۷۰،۰۰۰ ہے، یہ "Times of India" اور "Calcutta Statesman" ہیں۔ ٹائمز کے پیچھے کوئی کاروباری دلچسپی کارفرما نہیں ہے، یہ اپنے طریقے سے چلتا ہے۔ دیگر معروف انگریزی اخبارات میں "Madras Mail" لاہور کے "Civil and Military Gazette" اور "Pioneer" شامل ہیں۔ پائنیر لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے، اس کے صفحات پر اب تک ایک طرح کے رومانس کی فضا باقی ہے کیونکہ یہ کپلنگ کا اخبار ہے۔ پُرانے وقتوں میں یہ پورے ہندوستان میں بہت مہنگے داموں فروخت ہوتا تھا۔ تقریباً ایک روپیہ فی کاپی۔ یہ مخصوص طبقے کا اخبار تھا اور ہر چند اس نے وقت کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا تھا، پھر بھی یورپ میں اپنے نمائندوں کی بدولت حالات سے حیران کن حد تک آگاہی رکھتا تھا۔ اس کا رویہ جدید اختراعات کے سلسلے میں نوابانہ تھا۔ ۱۹۲۶ء تک اس میں ہر قسم کے کام ہاتھ سے انجام دیے جاتے تھے۔ ہاتھوں کی تین سو جوڑیوں کی مدد سے پرنٹنگ کے آغاز سے رات کے گیارہ بجے تک۔ اُن شاندار پُرانے وقتوں سے آج تک یہ کئی قسم کے نشیب و فراز سے گزر چکا ہے اور ان دنوں ایک ایسے شریف آدمی کا تاثر پیش کرتا ہے جو ایسے دور سے ہم آہنگی کی کوشش میں مصروف ہو جسے وہ سمجھ نہیں سکتا۔

''ہندوستان میں اس شعبے کے لیے مستقبل میں کافی امکانات ہیں بشرطیکہ اسے آزادی کے ساتھ پروان چڑھنے دیا جائے، نہ صرف انگریزوں بلکہ خود ہندوستانیوں کی طرف سے!''۔

یہ مضمون بذریعہ تار واپس ہندوستان آیا۔ لیکن اس میں ہندوستانی پریس کے مطابق کوئی چٹ پٹی چیز نہیں تھی۔ لہٰذا اسے ایڈٹ کیا گیا.......... درج بالا اقتباس میں سے فقط ایک لفظ نکال دیا گیا ''صرف''.... اگر اس ترمیم کے ساتھ اقتباس کو پڑھیں تو وہ یوں ہو جاتا ہے ''بشرطیکہ اسے آزادی کے ساتھ پروان چڑھنے دیا جائے، انگریزوں کی نہیں بلکہ خود ہندوستانیوں کی طرف سے!'' آپ نے دیکھا کہ تمام تر معقولیت کا کس طرح خون کیا گیا؟ اس ترمیم کے بعد اس مضمون نے ہندوستانی پریس میں حسب معمول ہنگامہ برپا کر دیا۔ اس طرح کی چیزیں بار بار وقوع پذیر ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ جب اخبار والوں سے چھٹکارا ناممکن ہو جاتا تو میں اس قسم کے الفاظ سے ان کی تواضع کرتا...... ''جو میں کہتا ہوں وہ آپ لوگ سنتے نہیں...... اگر سُنتے ہیں تو سمجھتے نہیں......اور اگر سمجھ لیتے ہیں تو رپورٹنگ میں غلط بیانی کرتے ہیں۔ آپ یہاں صرف دو مقاصد کے تحت آتے ہیں......یا تو مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کریں...... یا خود جھوٹ بولیں''۔

اس ہیجانی ردِّعمل پر وہ کہتے ہیں ''ہمارے بارے میں آپ کی رائے اتنی بُری ہے؟''

''بدترین! ایک ڈرنک لیجیے''۔

ہم اکثر اسی طرح بات کو ختم کرتے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر، اس طرح کے توہین آمیز برتاؤ کے بعد مجھے کسی قدر رنج سے واسطہ پڑ جاتا۔

۵

اس تلخ موضوع پر آخری تبصرہ۔

افواہوں، تعصبات اور جہالت کے اس آمیزے سے ہندو پریس تشکیل پاتا ہے۔ عالمی صحافت کے لیے ایک عضوِ معطل......اسے برطانوی حکومت کی طرف سے اظہارِ رائے کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ رائے، جو امن کے وقت اوٹ پٹانگ اور جنگ کے وقت لرزتی ہوئی ہوتی ہے۔

لکھنے کے اوقات میں، میں باہر کونے تک کا ایک چکر لگا کر ڈاکٹر گوئبلز کو بھیجنے کے لیے بہت سے برطانیہ مخالف، امریکہ مخالف، جنگ مخالف پروپیگنڈے پر مبنی اخبارات چند آنے میں خریدتا جو اُسے کئی ہفتوں

تک مصروف رکھتے۔ ہر ناپسندیدہ ارادہ، ہر قسم کی پست حرکت کو چرچل اور روزویلٹ سے منسوب کر دیا جاتا.......... وائسرائے کی توہین زیادہ کڑواہٹ کے ساتھ اور فحش انداز میں کی جاتی۔ ایک روز ایک نوجوان ہندو ایڈیٹر.......... جسے یقیناً میرے ذاتی خیالات کے بارے میں آگاہی نہیں تھی.......... تیزی سے کمرے میں داخل ہوا.......... اس کے ہاتھ میں ایک بہت بڑا کارٹون تھا۔ جسے اس نے میرے بستر پر پھیلا دیا.......... اس پر لارڈ لن لتھ گاؤ کی تصویر تھی.......... بالکل عریاں.......... اور مسٹر جناح کے سامنے گھٹنوں پر جھک کر ان کے پاؤں چاٹتے ہوئے (یہ وائسرائے کی ایک تقریر پر جس میں اس نے مسلمانوں کے معاشی استحقاق کی حمایت کی تھی، ردعمل کا اظہار تھا)۔

''اس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟'' نوجوان ایڈیٹر نے پوچھا۔

میں فقط اس قدر کہہ سکا کہ میرے خیال میں یہ بہت گھٹیا ہے۔

''ہاں.......... لیکن آئیڈیا؟''

میں نے یہ کہہ کر معذرت کی کہ اس طرح کی گھٹیا چیزوں کے لیے میرے کوئی آئیڈیاز نہیں ہیں۔

''بہرحال.......... میں اسے شائع کر رہا ہوں!''

''یقیناً.......... تم اسے شائع کر سکتے ہو...... ہندوستانی پریس آزاد ہے!'' اس پر وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گیا.......... ہندوستانی پریس آزاد ہے! اوہ.......... بہت خوب.......... زبردست...... وہ اپنے دوستوں کو ضرور بتائے گا۔ خیر.......... لیکن اس قدر ہنسی کی کیا وجہ ہے؟ اگر میری کھڑکی کے باہر بک سٹالز پر لٹکے ہوئے تمام اخبارات اور رسائل بول سکتے تو یہ سوال ضرور کرتے.......... انھیں دیکھیے.......... گاندھی کی طرف سے ''ہندوستان چھوڑ دو''۔ ایک ہندوستانی کی طرف سے امریکی زوال کے لیے ''انکل شیم''...... لاتعداد پمفلٹس اور آرٹیکلز.......... برطانیہ کے خلاف.......... امریکہ کے خلاف.......... جنگ کے خلاف.......... مسلمانوں کے خلاف.......... ہر اس چیز اور اس شخص کے خلاف جو ہندو نہیں ہے۔ رُسوا کن.......... دروغ گو.......... غراتے ہوئے.......... تھوکتے ہوئے.......... تمام عام انداز سے کھلے بازار میں مکمل آزادی سے فروخت ہو رہے ہیں۔

فطری طور پر، ہولناک جنگ کے دوران کسی وقت سنسر کی قینچی ذرا سختی سے کاٹتی ہے۔ فطری طور پر، ایسے ملک میں جو دشمن تخریب کاروں سے بھرا ہوا ہو، پولیس کو بعض مواقع پر ایسے مواد کو جو ضرر رساں ہو، دبانا

پڑتا ہے۔ پوری اور کھلی حقیقت اپنی جگہ قائم ہے...... اور میں تمام ہندوؤں کو چیلنج کرتا ہوں کہ اسے غلط ثابت کریں.......... کیونکہ جنگ کے اس طویل عمل کے دوران، ہندو پریس مسلسل نفرت کا بھجن الاپتا رہا.......... برطانوی راج کے خلاف...... ہر روز...... ہزاروں آوازوں میں...... اور نفرت کا یہ بھجن، خواہ کتنا ہی بلند آہنگ تھا، خواہ اس کے سُر کتنے ہی شرانگیز تھے، خواہ اس کی بازگشت کتنی نقصان دہ تھی۔ برطانیہ نے شاذ ہی اسے دبانے کی کوشش کی ہوگی.......... بھجن جاری رہا، جبکہ دشمن دروازے پر کھڑا تھا۔

اگر یہ آزادی کا پیمانہ نہیں تو کم از کم اس کی سچی نقل کی کوشش ضرور ہے۔

☆☆☆

چوتھا باب

ہندو ہالی ووڈ

چلو سینما چل کر کوئی ہندی فلم دیکھتے ہیں۔

جب میں قدرے بہتر اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو میں نے سب سے پہلی چیز یہ کی ....
اور ایسا لگتا تھا کہ اس سے پہلے کسی انگریز نے اس وحشیانہ خیال پر عمل نہیں کیا۔

''ہندی فلم کیسی ہوتی ہے'' وہ ہمیشہ پوچھتے:

''میرے خدا .... مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟''

''لیکن کیا تم نے کبھی ہندی فلم نہیں دیکھی؟''

''ہندی فلم؟ واقعی!''

اس طرح کے سپاٹ تعجب نے مجھے اُکسایا کہ ہندی فلم دیکھنا دلچسپ تجربہ ہوگا اور کیونکہ...... فلمیں کسی قوم کی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ خواہ کوئی آئینے میں دکھائی دینے والے عکس کو پوری طرح نہ سمجھ سکے۔ پھر بھی اُسے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے وقت ضرور دینا چاہیے۔ میں خصوصی طور پر سٹوڈیوز کو دیکھنے کا خواہش مند تھا اور چند تار ہلانے کے بعد، بالآخر ایک تاریخی فلم کی شوٹنگ دیکھنے کی اجازت مل گئی، جو بمبئی سے قدرے کم فاصلے پر جاری تھی...... چلیے مل کر دیکھتے ہیں۔

۲

سٹوڈیو کے فرش پر ایک اداکارہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ وہ اپنے چمچ کو تازہ کٹے ہوئے آموں سے بھرے پیالے میں گھماتی تھی، برف میں لگے ہوئے، رسیلے اور سنہری۔ خوبصورت ہاتھ کے اشارے سے اس نے ایک ملازم کو بلایا اور اسے پنکھا اور قریب کرنے کو کہا...... اور جونہی ملازم نے ایسا کیا...... پنکھے کی ہوا نے اداکارہ کے بال بکھیر دیے.......... اس کے اپنے حیران کن بال.......... جو اس کی کمر سے نیچے تک ایک دلفریب آبشار کی طرح گر رہے تھے۔

گرمی ناقابلِ برداشت تھی .... اور جب مائیک میں کوئی خرابی ہوئی تو میں نے تازہ ہوا کے

لیے باہر جانے کا فیصلہ کیا......... دروازے تک پہنچنے میں نصف درجن سے زائد تقریباً ننگے مزدوروں کو پھلانگنا پڑا۔ جو موقع پاتے ہی مٹی پر لیٹ کر سو گئے تھے۔ اس سٹوڈیو میں کچھ بھی ہالی ووڈ جیسا نہیں تھا......... ہالی ووڈ کے اطراف جیسا بھی نہیں۔

ایڈورڈین طرز کے بھرے مکانوں کے ایک سلسلے کا تصور کیجیے۔ سفید سیمنٹ سے لپے ہوئے۔ بمبئی کے نواح میں مین روڈ پر جمگھٹا کیے ہوئے۔ سڑک پر بیل گاڑیوں کی لمبی قطار۔ ندی کی طرح ڈولتی ہوئی جو ہندوستانی ٹھاٹھ باٹھ کا ابدی پس منظر پیش کرتی تھی۔ ناریل کے گھنیرے درخت کوّوں کے شور سے گونج رہے تھے......... اور دہکتے ہوئے آسمان سے چیلوں کی چلاہٹ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی...... داخلی دروازے پر ایک چوکیدار سفید اور جامنی پگڑی پہنے کھڑا تھا۔ روشن صبح کے شاندار خوابوں میں گم۔

میں واپس اندر چلا گیا اور وہاں مجھے لوہے اور کنکریٹ کی ایک خستہ عمارت نظر آئی، جس پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

''سٹوڈیو نمبر چار......... تمباکو نوشی منع ہے''

مشرق اور مغرب کا یہ امتزاج ششدر کر دینے والا تھا۔ صحن کے کونے میں ایک بہت خوبصورت درخت تھا۔ پُرانے ساگوان کی رنگت کے مضبوط تنے اور گھنے چمک دار پتوں والا...... جنھیں سیزین (Cézanne) ضرور سفید کرتی...... وہ پتے اپنے ہی سائے تلے، سبز رنگ میں بھیگے نظر آتے تھے۔ میرے دوست نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

''میں اس درخت کو پینٹ کرنا چاہتا ہوں''۔

''تو پھر تمھیں جلدی کرنی چاہیے کیونکہ ڈائریکٹر بتا رہا تھا کہ وہ لوگ سٹوڈیوز کو پھیلا رہے ہیں، لہٰذا اس درخت کو کاٹ دیں گے''۔ ''وہ اسے کبھی نہیں کاٹیں گے...... یہ پیپل کا پیڑ ہے اور پیپل مقدس ہوتا ہے۔ اگر انھوں نے اسے کاٹ ڈالا تو انھیں اپنا سٹوڈیو بند کرنا پڑے گا کیونکہ کوئی شخص یہاں کام نہیں کرے گا''۔

سو......... یہ تھا پیپل......... وہ درخت جس پر راما چڑھا اور اپنی ٹانگیں زخمی کر لیں۔ ہاں......... یقیناً یہ بہت پیاری چیز تھی...... اور اگر ہندوستان میں مقدس اشیا کی بھرمار ہے تو اس میں صرف ایک اچھی بات ہے کہ ان میں درخت بھی شامل ہیں...... افسوس...... انگلینڈ میں کوئی مقدس درخت نہیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جب آپ ہندوستان کو پوری طرح جان لیتے ہیں تو محسوس کرتے ہیں کہ پیپل کے درخت

کے تقدس میں بھی مبالغہ ہے۔ یہ اپنا سایا طول و عرض میں پھیلا دیتا ہے۔ پہاڑوں میں...... وادیوں میں...... میدانوں و شہروں میں...... اور بعض اوقات یہ اسے بہت نامناسب مقامات پر بھی پھیلا دیتا ہے...... ایک تنگ گلی کے درمیان، عین اس جگہ جہاں عمارت بنانے والا گندے پانی کا حوض بنانا چاہتا ہے، کمرے کی کھڑکیوں کے اوپر، جہاں سے روشنی بالکل رُک جاتی ہے۔ ایک بُری مثال سہی۔ مگر ہندوستان کی مقامی حکومت، خالص پیپل کی حکومت ہے...... پیپل کے ذریعے...... اور پیپل کے لیے۔

ہم جا کر درخت کے سائے میں کھڑے ہو گئے۔ وہاں ٹھنڈک اور فرحت تھی اور یہ میرے دوست سے جو اس صنعت کے بارے میں کافی معلومات رکھتا تھا، تبادلۂ خیال کے لیے اچھی جگہ تھی۔

''ہندوستان میں فلم انڈسٹری کتنی بڑی ہے؟''

''کافی بڑی......... اور روز بروز ترقی کر رہی ہے، مثلاً یہاں ایک سو سے زیادہ پروڈکشن کمپنیاں ہیں جن کے مراکز بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں ہیں اور ان میں تقریباً اسی ہزار لوگ کام کرتے ہیں۔''

''اور سینما؟''

''یہ بھی کثیر تعداد میں ہیں۔ بمبئی کے مستروجے ایئر کنڈیشنڈ سینماؤں سے، چھوٹے شہروں کے کھٹملوں سے بھرے لکڑی کے بنچوں والے سینما گھروں تک۔ یہاں تک کہ سولہ سو عمارتیں فلموں کی نمائش کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

''اور دیہاتوں میں؟''

''وہاں سے یہ ویگنوں میں جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سفری سینما......... ان کی تعداد تقریباً پانچ سو ہے۔ یہ عام طور پر طویل مذہبی فلم اور سرکاری مہم کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا دکھاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ حصے کافی اچھے ہوتے ہیں اور حفظانِ صحت، فرسٹ ایڈ اور فوج کی نقل و حرکت کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں''۔

''اور فلم سٹارز......... ان کے بارے میں بتاؤ......... ان کی آمدنی......... اور یہ کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں؟''

''واپس سٹوڈیو چلتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھتے ہیں''۔

۳

سیٹ پر کام کا آغاز ہو چکا تھا.......... حیرت انگیز زلفوں والی دوشیزہ نے اپنے آم ختم کر لیے تھے اور ایک دیہاتی جھونپڑے کے دروازے پر کھڑی تھی جو منظر کا مرکزی حصہ تھا۔ ہدایت کار، جس نے شدید ترین گرمی میں بھی اپنی گاندھی کیپ نہیں اتاری تھی، اُسے آخری ہدایات دے رہا تھا۔ لڑکی کے ساتھ ایک داڑھی والا، بوڑھا آدمی کھڑا تھا، جو آوارہ گرد فقیر کا کردار کر رہا تھا۔

گاؤں کی رقاصہ اور فقیر کے درمیان گفتگو کا منظر تھا.......... مکالمہ لامختتم وقت تک جاری رہا .... اور لڑکی کے شوہر کی آمد پر ختم ہوا جو، کٹ کا اشارہ تھا۔

''اوکے لائٹس''

''لائٹس...... لائٹس''۔ ایک درجن سے زیادہ ہندوستانی آوازوں نے مختلف لہجوں میں دہرایا۔

لائٹس آن ہو گئیں.......... سرگوشیاں بند کر دی گئیں...... میک اپ مین آگے بڑھا اور لڑکی کی ناک پر آخری بار پاؤڈر تھپتھپایا.......... ہندوستان کے میک اپ مین، چھت کے نیچے نوے کے درجۂ حرارت پر بھی اداکاروں کے چہروں کو خشک رکھنے کا تھکا دینے والا کام سرانجام دیتے ہیں۔ موت کا سا سناٹا.......... اعصابیت کا ایک پُرانا.......... پُرانا احساس...... بزنس...... ایکشن۔

اداکار نمودار ہوئے۔ مکالمہ شروع ہوا.......... ہر چیز ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ اور پھر...... کسی وارننگ کے بغیر...... اداکار رُخصت ہو گئے .... ایک ناگوار وقفہ.......... ''کٹ!''۔ پروڈیوسر تیزی سے آگے بڑھا...... ''روشنی کم کرو''۔ لائٹس بند کر دی گئیں...... پروڈیوسر اداکاروں کو پھر ریہرسل کروانے لگا۔

اب اس سلسلے میں بیان کرنے کو باقی کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو تقریباً ہر فلم سٹوڈیو کا معمول ہے.......... لیکن یہ حقیقت ہے کہ چند منٹ کے بعد دوبارہ ایسا ہوا...... اس کے بعد پھر ہوا.......... اس کے بعد پھر.......... یہاں تک کہ آٹھ مرتبہ یہ سب دہرایا گیا...... روشنیاں جلتی بجھتی رہیں...... میک اپ مین آتا جاتا رہا...... لیکن یہ سب عین درمیان میں ٹھپ ہو جاتا تھا اور پروڈیوسر چیختا تھا ''کٹ!'' اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ یہ بات خوشگوار انداز سے کہتا تھا اور اداکار مایوس یا شرمندہ نظر آنے کے بجائے محض مسکرا دیتے تھے۔

''کیا ہمیشہ ایسا ہوتا ہے؟''

''اکثر اوقات...... یہ اس لیے نہیں ہے کہ ان کی یادداشت اچھی نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ زیادہ کام

میں مصروف ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ لڑکی اداکاری کے اس مختصر عرصے میں ایک اور کمپنی کی ایک اور فلم میں بھی کام کر رہی ہے۔ کل اسے وہاں کام کرنا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ وہ وہاں بھی اپنے مکالے بھول جائے گی''۔

''لیکن پروڈیوسر اس کی اجازت کیوں دیتے ہیں؟''

''وہ کچھ نہیں کر سکتے.......... ہندوستانی اداکار دنیا کے سب سے خودمختار لوگ ہیں''۔

دوسروں کی دولت ہمیشہ دلچسپی کا موضوع ہوتی ہے۔ یہاں ہندوستانی بالی ووڈ کے بارے میں کچھ حقائق درج ہیں۔ یہ اداکارہ ایک فلم کا معاوضہ زیادہ سے زیادہ پچھتر ہزار روپے لیتی ہے جو تقریباً پچیس ہزار امریکی ڈالر بنتے ہیں۔ اگر یہ لڑکی ایک سال میں تین فلمیں کرتی ہے تو ممکن ہے وہ بالی ووڈ سے زیادہ فائدے میں ہو.......... کیونکہ ہندوستان میں انکم ٹیکس (ہر چند وصول کرنے کی کافی کوشش کی جاتی ہے) برطانیہ اور امریکہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں.......... اور اس دولت کو وہ قابلِ تعریف حد تک کفایت شعاری سے استعمال کرتی ہے.......... نہ بڑی بڑی گاڑیاں.......... نہ شاندار مکانات.......... یہاں تک کہ کسی داشتہ (مرد) کے شبے کے بغیر۔

بیولے ہلز، بمبئی کا تقریباً مضافات ہے جہاں کوئی سوئمنگ پول تک نہیں۔ کوئی سیاح اسے دیکھنے نہیں آتا.......... باغ کی دیواروں کے اوپر کوئی فوٹوگرافر لٹکا ہوا نظر نہیں آتا.......... جب صبح اداکارہ ٹیکسی میں نکلتی ہے تو کوئی گردن گھما کر دیکھتا تک نہیں۔ ہندوستان میں ''شخصی نمود'' کا کوئی مطالبہ نہیں ہے۔

شاید وہ اس لیے خاموشی سے زندگی گزار رہی ہے کہ اس کا کیریئر مختصر ہے۔ اس کا اختتام بھی اتنا ہی اچانک ہوگا جتنا اس کا آغاز تھا۔ یہ بات کسی مغربی ڈائریکٹر کو عجیب لگے گی کہ ایک ہندوستانی لڑکی اپنے پہلے سکرین ٹیسٹ کے ساتھ ہی فلم کا مرکزی کردار ادا کرنے لگتی ہے اور یہ نہ اُسے حیران کن لگتا ہے نہ کسی اور کو.......... وہ چند برس خوب چمکتی ہے۔ اس سلسلے میں تین سال کافی لمبا عرصہ سمجھا جاتا ہے...... اور اچانک غائب ہو جاتی ہے۔ عوام نے اُسے کافی دیکھ لیا، اب بس...... کیوں؟ کوئی نہیں جانتا...... ہو سکتا ہے وہ بہت خوبصورت ہو.......... ہو سکتا ہے وہ بہت اچھی اداکارہ ہو...... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... بس...... اس کا وقت ختم ہو گیا۔

اداکاروں کے مقابلے میں باقی تمام لوگوں کے معاوضے معمولی ہیں اور رائٹرز کے قابلِ رحم۔ ایک

مکمل فلم کے تمام سین اور ڈائیلاگ لکھنے کا معاوضہ اگر دو سو روپے مل جائے جو تقریباً ساٹھ ڈالر بنتے ہیں تو مصنف خود کو خوش قسمت سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی فلمیں وقت سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن کچھ اور لوگ بھی ہیں جیسا کہ ہم دیکھیں گے۔ بہتر ہے ان کی تصویر کشی سیٹ پر کی جائے۔

۴

سہ پہر کے آخری لمحات تھے جب ہم سٹوڈیو میں واپس آئے۔ ایک عشقیہ منظر فلم بند ہو رہا تھا .... یا کم از کم وہ عشقیہ منظر جیسا لگ رہا تھا۔ لیکن کسی طرح تکمیل پاتا نظر نہیں آتا تھا............ دیہاتی دوشیزہ ایک نوجوان کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی...... اُبھری ہوئی چھاتیوں کے ساتھ...... تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے .... اگر کوئی لڑکی کسی کو "آؤ ناں" کہہ سکتی ہے تو وہ بھی کہہ رہی تھی۔ اور اگر کسی کی چھاتیاں آنے والے عشقیہ لمحات کے خیال سے اُبھر سکتی ہیں تو یہ بھی اُبھری ہوئی تھیں۔ لیکن کس حد تک...... اس لحاظ سے یہ قابلِ تفتیش تھیں۔

مگر کچھ نہیں ہوا...... کچھ نہیں .... جسے کہنے کو ہی سہی مگر چمٹنا لپٹنا کہا جا سکے۔ آنکھیں چیخ چیخ کر "آؤ ناں" کہتی رہیں۔ چھاتیاں پھٹنے کی حد تک اُبھر آئیں (قابلِ رحم حد تک۔ شکنجے میں جکڑے کبوتروں کی طرح پھڑکتے ہوئے) انگلیاں لرزنے لگیں...... گردنیں تن گئیں............ پلکیں پروانوں کی طرح پھڑپھڑانے لگیں ...... ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ لیکن کوئی بغل گیری نہیں ہوئی۔ "یہ اس طرح جاری نہیں رہ سکتا" میں نے اپنے آپ سے بڑبڑا کر کہا...... "لیکن...... واقعی...... نہیں...... یہ تمام گدگداہٹ...... ضائع نہیں جائے گی...... کوئی چیز بدلے گی...... پھٹے گی...... کچھ نہ کچھ ہوگا" اور میں نے اپنے دوست سے پوچھا "آخر یہ کب اس لڑکی کو چومے گا؟"

"چومے گا؟" اُس نے تعجب سے دہرایا۔

"ہاں ہاں...... کب چومے گا آخر؟"

"کبھی نہیں!"

"کیوں نہیں؟"

"یہ کبھی ایسا نہیں کرتے"۔

"کیا...... یہ دونوں؟ کیا ان کے درمیان کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں...... صرف یہ دونوں نہیں...... بلکہ کوئی بھی نہیں"۔

"کوئی ایک دوسرے کو نہیں چومتا؟"

"کوئی نہیں...... کبھی نہیں...... ہندوستانی فلم سکرین پر نہیں!"

میں نے اُبھری ہوئی چھاتیوں پر آخری نظر ڈالی...... وہ، جیسا کہ فرانسیسی سنیک کے بارے میں کہتے ہیں AU-POINT پر تھیں۔ جیسے کوئی چیز پھٹنے والی ہو۔ یہ صبر کی انتہا تھی۔ میں نے اپنے دوست کا بازو پکڑا اور ہم تازہ شکنجبین کی تلاش میں نکل گئے۔

لیموں کا شربت پیتے ہوئے میں نے ہندی فلم سکرین پر، بوسے کی حیران کن تاریخی روایت کے بارے میں سُنا۔ حیران کن اس لیے کہ یہ تاریخ تا حال لکھی نہیں گئی۔

بوسا............ ٹیبو ہے!

صرف ایک مرتبہ، دس برس پہلے، ایک خانہ بدوش فلم "زرینہ" میں ایک روایت شکن ہدایت کار نے ایک اداکار کو اجازت دی تھی کہ وہ اداکارہ کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوئے...... لیکن اس نے انھیں سختی سے نہیں دبایا اور زیادہ دیر تک نہیں دبایا...... لیکن اتنی دیر ضرور دبایا جو ایک شدید دھماکے کا سبب بن سکتا...... یہ تو درست نہیں ہے کہ لوگوں کی بڑی تعداد نے دیوتاؤں کی خفگی دُور کرنے کے لیے بلند عمارتوں سے چھلانگ لگا دی۔ لیکن یہ ضرور سچ ہے کہ سینماؤں میں بلوے ہوگئے۔ سارے ملک میں احتجاجی جلسے جلوس ہوئے اور نقادوں کی طرف سے شدید مذمت ہوئی۔ اخبارات میں اس قسم کی سرخیاں لگیں:

"مغربی بے حیائی کا گھٹیا مظاہرہ"

"ہندوستانی فلم سکرین کو پاک کیا جائے"

"زرینہ" میں ہندی فلموں کا پہلا اور آخری بوسہ لیا گیا۔ ہندی فلموں کے وقت سے بہت پیچھے رہ جانے کی یہ ایک اور وجہ ہے![1]

(۱) اٹھارھویں صدی کے اوائل میں لکھا گیا "The Abbe Dubois" ہمیشہ کی طرح آج بھی نیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ہم اس کے فقروں کو فلموں پر منطبق کریں "جنسی محبت ہندوؤں کے لیے بالکل نامعلوم چیز ہے"۔ وہ لکھتا ہے "اگر ان کو فحاشی اور عریانی کی انتہا میں کوئی نقصان نظر نہیں آتا، دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جہاں بیرونی اظہار کو اہمیت نہ دی جاتی ہو۔ وہ تمام کہاوتیں، لطیفے اور فقرے بازی، جن سے ہمارے نوجوان اس قدر محظوظ ہوتے ہیں، کسی ہندو عورت کے لیے توہین کا باعث ہیں۔ اس حد تک کہ لوگوں کے سامنے اس سے مخاطب ہونا بھی اس کی توہین ہے"۔

۵

لیکن ہندوستانی ہالی ووڈ کے جمود کی اصل وجہ (جس پر تمام تر سرمایہ کاری ہندو کرتے ہیں) وہی ہے، جو دیگر تمام معاملات کی وجہ ہے۔ ہندو دھرم!

ہندی فلموں کی بہت بڑی تعداد کا موضوع کسی نہ کسی انداز سے یا تو دھرم ہے یا دیومالائی موضوعات۔ کیمرہ مستقلاً ماضی بعید پر مرتکز رہتا ہے۔ یہ سکرین حقیقت میں ایک سایازدہ سکرین ہے جس پر بھٹکی ہوئی آتماؤں کے نہ ختم ہونے والے اجتماعات ہوتے ہیں جو سرگوشیوں میں قدیم توہمات کی کہانیاں دہراتی رہتی ہیں۔

یہ ساری کی ساری زمین کہانیوں سے گونج رہی ہے۔ جدید ہندوستان میں ہر درخت پر پلاٹ اُگتے ہیں۔ ساری فضا ڈرامے سے پُر ہے۔ لیکن کوئی ڈراما سٹوڈیو میں جگہ حاصل نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ کبھی نہ کبھی کوئی جدّت پسند پروڈیوسر ضرور ایسی کوشش کرے گا، جسے وہ ''ماڈرن اور سوشل'' کہتا ہے لیکن ابھی تک سکرپٹ رائٹرز کی اکثریت، اپنے طور پر اس ''سوشل'' پر کام کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ وہ زیادہ تر ''سوشل'' پرانی امریکی فلموں سے اُڑاتے ہیں اور واقعات کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ لوکل بال جیسے کسی کردار کی اصل سچویشن کو جس میں وہ بلند عمارات کے پس منظر میں پاجامہ پہنے ہوئے ہے، فاختہ جیسی آنکھوں والی کسی دوشیزہ پر، جس کا لباس ہوا میں پھڑ پھڑا رہا ہے، آموں کے باغات کے میلوں پر پھیلے ہوئے راستے پر فلماتے ہیں۔ نتیجتاً یہ کسی قدر ناخوشگوار لگتا ہے۔ کیونکہ دانشورانہ گفتگو سازی میں اتنی حقیقت پسندانہ نہیں لگتی۔ خصوصاً جب ذرا فاصلے پر مندر کی گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

اس کے علاوہ پروڈیوسر اور سکرپٹ رائٹر کے انتظار میں اور سٹار کے بارے میں بات کیے بغیر کیا لذت پوشیدہ ہو سکتی ہے؟ یہاں ایک دو مثالیں پیش ہیں۔ پہلی اچھوت تا کے بارے میں۔ کیوں نہ ایک اچھوت لڑکے کو برطانیہ یا امریکہ کی آزاد فضا میں پروان چڑھنے کے لیے بھیجا جائے۔ اسے ایک بہترین آدمی بنانے کے لیے جس طرح اس سے قبل اس جیسے کئی بن چکے ہیں (جی ہاں میں مغرب میں رنگ کے امتیاز کے بارے میں پوری طرح جانتا ہوں لیکن یہ امتیاز، اچھوت تا کی بنیادی غلامی سے کم ہے) پھر اُسے مشہور و معروف اور دولت مند آدمی بنا کر اس کے آبائی گاؤں میں واپس لایا جائے۔

یہ تھیم آرنلڈ بینٹ کے لیے کیسا رہے گا؟

اُس اچھوت آدمی کو گاؤں کے نلکے سے پانی پینے کی اجازت نہیں...... خوب ...... وہ اپنا نلکا لگا لیتا ہے! وہ اتنا نیچے ہے کہ گاؤں کی معمولی دھوبن اس کے کپڑوں کو ہاتھ لگانے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ اپنی لانڈری بنا لیتا ہے! اس کے بچوں کو گاؤں کے سکول میں پڑھنے کی اجازت نہیں...... وہ اپنا سکول قائم کرتا ہے اور اس میں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک سے قابل ترین اُستاد رکھتا ہے!...... اگر کوئی باہمت پروڈیوسر اس موضوع کے دردناک پہلوؤں پر فلم بنائے اور صرف ایک بار باکس آفس پر لعنت بھیج سکے!!

ایک اور موضوع جو ڈرامائی سلوک کا بے حد مستحق ہے، وہ ''پردے'' کا ادارہ ہے۔ جس میں ایک مسلمان مرد کی بیوی پوری زندگی اپنے جسم اور چہرے کو ایک موٹے کپڑے میں چھپائے رکھنے پر مجبور ہے تا کہ کوئی اور مرد اس کی صورت نہ دیکھ سکے۔ اس رواج پر تنقید کرنا میرا کام نہیں ہے۔ اسے مسلمانوں کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جن کے ترقی پسند حضرات اسے کافی عرصے سے تلخ تنقید کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ وہ اسے ظالمانہ، سفاکانہ، غیر صحت مندانہ، غیر فطری، جسم کو معذور اور ذہن کو ماؤف کرنے والا گردانتے ہیں۔ وہ اسے عورتوں کی سیاہ بختی کا شیطانی مظاہرہ کہتے ہیں۔

کیا زبردست موضوع ہے کسی بھی فلم کے لیے۔ ایک نہیں، سینکڑوں فلموں کے لیے۔ نقاب سے چھٹکارہ...... سورج کی روشنی کے لیے جدوجہد۔

لیکن ان ڈرامائی شاہکاروں کے لیے آپ کو ایک روایت شکن پروڈیوسر کی ضرورت ہوگی۔ جس میں کاٹ ہو...... رفتار ہو...... جرأت ہو...... جس میں آگے بڑھ کر حملہ آور ہونے کی صلاحیت ہو...... ہندوستان میں ایسے پروڈیوسرز موجود ہیں لیکن ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ان میں سہراب مودی کا نام نہ لینا زیادتی ہوگی جس نے حال ہی میں مجھے اپنی فلم ''سکندر'' دکھائی جو ہندوستان پر سکندر اعظم کے حملے کی روداد پر مبنی ہے۔ یہ ایک اثر انگیز فلم ہے۔ جوش اور ولولے سے بھرپور "The Birth of A Nation" جیسے قدیم شاہکاروں کے معیار کی۔

ایک اور بے حد ذہین پروڈیوسر جے بی ایچ واڈیا ہے جس نے "The Court Dancer" جیسی تاریخی فلم بنائی تھی۔ یہ ہندوستان کی پہلی متحرک فلم تھی جس کے ڈائیلاگ انگریزی میں تھے۔ بہرحال ''دی کورٹ ڈانسر'' کو کسی طرح بھی غیر معیاری فلم نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی تصویر کشی شاعرانہ قسم کی تھی اور اس کی مقبول اداکارہ سادھنا بوس مغربی نقطۂ نظر سے افسوس ناک حد تک بھاری بھرکم تھی اور اس کے انگریزی مکالمے

ششدر کر دینے کی حد تک بے مزہ تھے۔ مثال کے طور پر بے شمار مواقع پر کسی ڈرامائی فقرے کا جواب ایک ہی تھا۔''اوہ''اور غیر ارادی طور پر اس کا اثر انتہائی مزاحیہ ہوتا۔''ڈارلنگ! وہ تمھیں قتل کرنے کے لیے آ رہے ہیں!''ہیرو کہتا ہے۔ یا اسی نوعیت کا کوئی اور خطرناک فقرہ۔''اوہ''مس بوس جواب دیتی ہے اور لفظ واحد کی حیثیت سے یہ قطعی متاثر کن لفظ نہیں ہے۔

پھر بھی مودی اور واڈیا قریب قریب نابغہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں نے ہندی فلموں کو اس پستی اور گراوٹ سے نکالنے کا تہیہ کر رکھا ہے، جس میں یہ گردن گردن تک ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان کا کام کافی دشوار ثابت ہوگا کیونکہ ان کے معاصرین کا رویہ حوصلہ شکن ہوگا۔ یہاں تک کہ جب وہ ان قدیم ترین المیوں پر کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں ان کا ملک مبتلا ہے تو انھیں بالآخر اس کوشش سے دست کش ہونا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر:

''ایک ہندو دوشیزہ کا ایک مسلمان بھائی تھا اور ان دونوں کا یہ مقدس تعلق پوری قوم کا درد بن گیا''۔

اس طرح ایک اہم فلم''بھلائی''کا اشتہار چلتا ہے۔ یہ فلم باکس آفس پر ہٹ ہے۔ لیکن اس سلسلے میں مزید بات کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر شدید طنز کیا جانا چاہیے جبکہ اس کا حاصل محض ایک آہ ہے۔ یہ رمولا جیسی اداکارہ کی، جو ہندی سکرین کی رونق ہے، تشہیر کے لیے تو بہت اچھا ہے۔ یا ہالی ووڈ کے زرقون، ونا یک کی "My Child" کی پبلسٹی کی نقل کے طور پر۔(''ایک آسمان بھر ستارے...... ایک آنکھ بھر منظر...... ایک روح بھر جذبہ'') لیکن اس میں ظاہری جدیدیت کے باوجود مذہبی عنصر غیر محسوس انداز میں سرایت کرتا ہے اور یہ کہنا بیکار ہے کہ یہ فلم سازوں کے ذاتی مذہبی جذبات و تعصبات کا نتیجہ ہے جن کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے۔

نتیجتاً ہندوستان میں حقیقی دیانت دارانہ فلمی تنقید کا وجود نہیں ہے۔ چند قابلِ احترام لوگوں کے سوا، باقی نقادوں کا قلم ان کی کاسٹ، ان کے طبقے اور سیاسی مفادات کے مطابق جنبش کرتا ہے۔ مجھے جلدی سے یہ اضافہ کرنے دیجیے کہ ان بیانات کی تصدیق خود ہندوستانی بھی کرتے ہیں۔

''ہندوستان میں فلمی تنقید کا مطلب یا تو رشوت ہے یا بلیک میل''ہندی فلموں کے بڑے تشہیر کاروں میں سے ایک نے یہ بات کہی تھی، میں اسے شرمندگی سے بچانے کے لیے اس کا نام حذف کر رہا ہوں۔

ہنگری کے ایف برتو نے لکھا تھا (ہندوستان میں قیام کے دوران نہیں بلکہ امریکہ کے ایک فلمی رسالے میں)

''پورے ہندوستان میں دیانت دارانہ فلمی تنقید کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کوئی اخبار اور رسالہ ایسا نہیں ہے جسے ترغیب نہ دی جا سکتی ہو۔ کوئی شخص فلمی تبصرہ نگاروں سے اخلاقی تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی توقع نہیں کرتا''۔

''دنیا کا گھٹیا ترین''......''صحافت کے گندے چوہوں کا گروہ''......''غلیظ انگلیوں والے مسخرے''...... یہ وہ جذبات ہیں جن کا اظہار خود ہندوستانی، اپنے فلمی تنقید سے وابستہ بھائیوں کے لیے کرتے ہیں۔

۶

یہ ایک مایوس کن تصویر ہے لیکن بخیلی سے بنائی ہوئی نہیں ہے اور ہر چند اسے ایک انگریز نے بنایا ہے پھر بھی یہ اس قدر تاریک نہیں ہے جس قدر تاریک اسے خود ہندوستانی بناتے ہیں۔

خود مجھے اُمید ہے...... بہت قومی اُمید...... اور باوجود اس کے کہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے، مجھے یقین ہے کہ ہندی فلم سکرین کا ایک شاندار مستقبل ہے۔ کیوں؟

اس کی کئی وجوہات ہیں اور ان میں تین کا بیان کافی ہوگا۔

پہلی وجہ ممکن ہے سرسری معلوم ہو لیکن کافی اہم ہے۔ ابھی تک تمام ہندی فلمیں ناقابلِ برداشت حد تک طویل تھیں۔ پندرہ ہزار فٹ کوئی معمولی لمبائی نہیں ہے لیکن فلم بین اس کی فرمائش کرتے تھے۔ اپنے پیسے کے عوض وہ کیا حاصل کر رہے تھے کہ تمام وقت بالکل خاموش بیٹھے رہیں، فلم میں شامل ناموں کی فہرست چلنے پر، فلم سازوں، ہدایت کاروں، اداکاروں کے ناموں پر بالکل بے حس و حرکت رہیں اور صرف اس وقت وحشیانہ داد و تحسین سے پھٹ پڑیں جب پردۂ سکرین پر فلم کی لمبائی بتائی جائے۔ پندرہ ہزار چار سو سات فٹ...... اوئے ہوئے...... اس کا مطلب ہے فلم واقعی زبردست ہے۔ جنگ نے اس طوالت پر قدغن لگا دی ہے۔ سلولائیڈ کی کمی کی وجہ سے حکومت نے ایک حکم نامہ جاری کیا ہے کہ کوئی فلم بھی گیارہ ہزار فٹ سے طویل نہیں ہوگی اور اگر تماش بین تلملاتے اور بڑبڑاتے ہیں کہ یہ برطانوی راج کے ظلم کی ایک اور مثال ہے تاہم فلم سازوں اور سمجھدار فلم بینوں نے اس پر سُکھ کا سانس لیا ہے۔

یہ میری اُمید کا ایک منفی پہلو ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی فلمیں جدید خیالات کی طرف

پیش قدمی کریں گی۔ چاہے اس معجزے کے لیے جنگ ہی کیوں نہ لڑنی پڑے۔

دوسری دو وجوہ کافی مثبت ہیں۔ ان میں پہلی کا تعلق ہندوستانی اداکاروں کے ساتھ ہے۔ یہ واقعی ہندوستانی سکرین کا سرمایہ ہیں۔ ان میں اداکاری کی پیدائشی صلاحیت ہے۔ اداکاری ان کے لیے اسی طرح فطری عمل ہے جس طرح طوطی کے لیے گانا...... اس سے قبل کسی جگہ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ ہوسکتا ہے ایک لڑکی اپنے پہلے سکرین ٹیسٹ کے فوراً بعد ہی مرکزی کردار ادا کرنے لگے اور اس پر کسی شخص کو کوئی حیرت نہیں ہوتی۔......... خوب۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ وہ ایک فلمی ستارہ ہے! اور اگرچہ یہ ناقابلِ یقین لگتا ہے......... یہاں اس کے سیکھنے کے لیے کچھ زیادہ ہے بھی نہیں!

اپنے مغربی پیشرو کے بالکل برعکس، ہندوستانی فلم ساز کو مستقل طور پر اپنے اداکاروں اور اداکاراؤں کو روکے رکھنا پڑتا۔ ان کے نقوش اتنے متحرک ہیں۔ ان کے تاثرات اس قدر معنی خیز ہیں...... اور ان کے جذباتی اظہار اس قدر گہرے اور بے ساختہ ہیں کہ اُسے تمام تر کوششیں اس لَو کو اونچا کرنے کے بجائے دھیما کرنے کے لیے کرنی پڑتی ہیں۔

علاوہ ازیں اس ملک میں اس شعبے میں کام کرنے کے لیے انواع و اقسام کے لوگ بھرے پڑے ہیں۔ پٹھانوں سے زیادہ شاندار مردانہ خصوصیات دنیا کے کسی ملک کے لوگوں میں نہیں اور یہاں کے بڑے شہروں کی گلیوں میں آپ، بڑی بڑی آنکھوں نازک ٹھوڑی، نفیس ناک اور دُبلے پتلے لیکن مضبوط جسموں والی خوبصورت لڑکیوں کے گروہ دیکھیں گے۔ جنھیں اپنی فلم میں کاسٹ کرنا کسی بھی ہدایت کار کا خواب ہوسکتا ہے۔ جہاں تک انوکھے کرداروں کا تعلق ہے......... جوشیلے، مسخرے، سیانے، مضحک، ہندوستان میں ان کی تعداد لاکھوں میں ہے اور اگلی وجہ......... کہ کیوں ہندی فلمیں ایک روز دنیا کے پردے پر چمکیں گی؟ اس کی نشان دہی میں اس سے قبل بھی کر چکا ہوں۔ یہ وجہ خود "مدر انڈیا" کی آنکھوں میں پوشیدہ ہے۔ یہ اس کے قدیم چہرے کی ہر لکیر میں نہاں ہے۔

بھارت ماتا دنیا کی سب سے عظیم داستاں گو ہے۔ اس کی دیو مالائیں بھی نہ ختم ہونے والی ہیں اور اس کے دھوپ سے جُھلسے ہوئے علاقوں کے ہر حصے میں، خون خرابے، جوش و خروش اور پوتر اگنی کا ایک افسانہ سنائے جانے کا منتظر ہے۔

اور اب بالآخر بھارت ماتا ایک طویل نیند سے جاگ رہی ہے۔ اب وہ موجودہ تاریخی عمل میں

اپنے تاریخی خزانوں کی سنسنی کو شامل کرے گی......... اب فضا میں ٹوٹتی ہوئی زنجیروں اور پھٹتے ہوئے نقابوں کی گونج پھیلے گی۔ یہ خود بھارت ماتا کے حق میں بہتر ہے کہ وہ اپنے پُرانے قید خانے سے باہر آئے، جو اس کا خود ساختہ ہے۔ تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے......... جدید دنیا کے جدید خیالات سے بہرہ ور ہونے کے لیے......... اور انھیں اپنے علوم و فنون میں شامل کرنے کے لیے۔

کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟

میرے خیال میں اس کا جواب ہے "یقیناً!"

☆☆☆

پانچواں باب

فن کار کی تلاش میں

دراصل یہی وہ موڑ ہے، جس سے اس کتاب کا اصل آغاز ہوتا ہے۔ ہسپتال میں کئی ماہ کے قیام اور سٹریچرز پر رہنے کے بعد............اور بستر سے نکلنے اور زندگی کی طرف واپس آنے کے بعد............آخر کار میں اپنے پاؤں پر دوبارہ کھڑے ہونے کے قابل ہو چکا تھا اور ایک آدمی اپنے پاؤں سے بھی اتنا ہی دیکھ سکتا ہے، جتنا اپنی آنکھوں سے۔

آیئے، اپنی اب تک کی کوششوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ہم نے کچھ دیر کے لیے وائسرائے کے محل کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اس کی شان و شوکت کا مشاہدہ کیا۔ کچھ شخصیات سے ملاقات کی............طوفانی شمالی مغربی سرحد پر طائرانہ نظر ڈالی............ایک ہندوستانی ہسپتال کو اندر سے ملاحظہ کیا......اپنے بستر کے اطراف میں کئی آوازوں کی بازگشت سُنی............اور انھوں نے ہمیں ہندوستان کے مسائل کی حقیقت تک پہنچنے میں مدد دی۔............ہندو دھرم............جو ہمیں تاریخ کے دھندلے آغاز تک لے گیا۔ دوسری جانب ہم نے ہندو پریس اور ہندی فلموں کے بارے میں حقائق سے آگاہی حاصل کی۔ اس مواد کو کسی طرح بھی متاثر کُن نہیں کہا جا سکتا۔ اگرچہ کئی مصنفین اسے ہندوستان پر کوئی کتاب مرتب کرنے کے لیے کافی سمجھیں گے۔ بہرحال اب ہم بالآخر اس میں چند بہتر اضافوں کے قابل ہو جائیں گے۔

ہمیں بہت کچھ دیکھنا اور بہت کچھ کرنا ہے............اور آغاز کہاں سے کیا جائے یہ فیصلہ دشوار لگ رہا ہے۔ اگر ہماری اُصولی دلچسپی سیاست میں ہوتی تو انٹرویو کرنے کے لیے یقینی شخصیت گاندھی جی کی ہوتی۔ لیکن اتفاق سے گاندھی جیل میں تھے۔ ناجائز طور پر یا جائز طور پر، ہر چند ہمیں اس معاملے پر ضرور غور کرنا ہوگا لیکن فی الحال یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہمیں سیاست میں کافی دلچسپی ہے لیکن عوام میں کہیں زیادہ دلچسپی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم عوام کو کس طرح جان سکتے ہیں۔ کیا اس قوم کی نفسیات کو سمجھنے کے لیے کوئی شارٹ کٹ ہے؟ ہم لوگوں کے دبے ہوئے جذبات، ان کی تمناؤں کو کسی خاص صورت میں ظہور پذیر ہوتے کس طرح دیکھ سکتے ہیں؟ یقیناً فنونِ لطیفہ میں!

جدید ہندوستانی آرٹسٹ اور آرکیٹکٹ ہمیں لوگوں تک رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔ ہمیں وہ انسانی

نمونے دکھا سکتے ہیں جن میں خود کو شمار کرتے ہیں۔ اپنے خیالات کی سرخیوں اور متن سے ہمیں آگاہ کر سکتے ہیں۔ زور، ظاہر ہے لفظ "جدید" پر ہے۔ مندر، مسجدیں اور عظمت رفتہ کے آثار، یہ سب بعد میں دکھائے جا سکتے ہیں۔ بہر کیف وہ تو ہر شخص کے ثقافتی ورثے کا حصّہ ہیں۔ تاج محل کی ہزار ہا تصاویر دیکھ کر اس کے حُسن کا پیشگی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اجنتا کی ثقافت کی بے شمار نقول ہم سب دیکھ چکے ہیں۔ دنیا بھر کے میوزیم ہندو مجسمہ سازی، مغل منی ایچر اور راجپوتوں کی فکری تصویر کشی سے بھرے پڑے ہیں۔ ان تمام چیزوں کو دیکھنا مسرت کا باعث ہے لیکن کسی فنکار سے ملاقات ایک مانوس قسم کی مسرت ہوگی۔ جیسے، جس گلوکار کو آپ گراموفون پر سنتے رہے ہیں، روبرو سُننا .... یہ نئے جنگلوں اور سبزہ زاروں کی تلاش ہے!

۲

بد قسمتی یہ ہے کہ ہم اس تلاش کی ابتدا بمبئی سے کرنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ یہ شہر گھٹیا طرز کا بے مثال نمونہ ہے۔ یہاں تک کہ اس پر ایک سرسری سی نظر کسی سیاح کو اگلے جہاز سے واپس جانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ گیٹ وے آف انڈیا سے (جو اتفاقاً سنگِ مرمر کی محراب کا بھونڈا نمونہ ہے اور چالاکی سے ایسی جگہ پر تعمیر کیا گیا ہے کہ مستقل طور پر نقشے سے باہر نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے) کاٹن ملوں کی جھونپڑیوں تک، یہ کرب کا ایک طویل راستہ ہے۔

آلڈس ہکسلے نے بمبئی کو فنِ تعمیر کے اعتبار سے آج تک بسائے جانے والے قابلِ نفرت شہروں میں سے "ایک" کیوں گردانا تھا؟ کیوں "ان میں سے ایک"؟ حالانکہ اس کا واسطہ اس سے بدترین چیز سے کبھی نہیں پڑا ہوگا! بمبئی میں گھناؤنے پن کا مست جنون کی حدوں کو چھوتا ہے۔ انسان اس شہر میں سیمنٹ اور پلاسٹر کے ڈراؤنے تسلسل کے ساتھ چلتا ہے، اپنے آپ سے یہ کہتے ہوئے "یہ اسی طرح تو جاری نہیں رہ سکتا .... اسے دیکھو .... نہیں اُسے دیکھو .... اس سلسلے کو کہیں نہ کہیں تو ختم ہونا ہے" لیکن وہ کہیں ختم نہیں ہوتا .... اور ہمیشہ آگے کوئی اس سے بھی بُری چیز منتظر ہوتی ہے۔

میں بمبئی میں درمیانے درجے کے شعور کے حامل کسی شخص کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ جس میں ذرا سی بھی حسِ لطیف ہو .... لیکن فنِ تعمیر نہ صرف گھناؤنا بلکہ وحشیانہ طور پر جارحانہ ہوتا گیا۔ سرکاری عمارتیں ڈراؤنے خواب میں آنے والی شیطانی مخلوق کی طرح ہیں۔ گھات میں بیٹھی بلی کی طرح۔ یہ ان نقلی رہائش گاہوں کے پس منظر میں جو پورے ساحل پر پھپھولوں کی طرح اُبھری ہوتی ہیں، پرچھائیوں کی طرح

کھڑی ہیں۔

یہ چکردار شہر، جس میں شاید ہی کوئی عمارت ایسی ہے جسے ازراہِ ہمدردی تیسرے درجے کی کہا جا سکے۔ تاج برطانیہ کے لیے باعثِ شرم ہے۔ یہ ہمیں ہنوں کے درجے پر لے آتا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ سوائے مسٹر ہکسلے کے کوئی اسے ناپسند نہیں کرتا۔ مثال کے طور پر شہر کے درمیان میونسپلٹی کی عمارتیں ہیں، جو بالکل پتھر کے زمانے کے عفریتوں سے مشابہ ہیں، جو دشمن سے برسرِ پیکار ہوں۔ یہ نہ صرف کریہہ المنظر ہیں بلکہ فحاشی کی حد تک مخلوط النسل ہیں۔ ایک ہی عمارت کے چہرے پر آپ کو گوتھک، سارسانک، نیوذر، ہندو، روکوکو کے علاوہ لوئیس سیزر کی بھی ایک جھلک ملے گی۔ سرایڈون آرنلڈ نے اس مہیب نمائش کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ وہ تمام بہت قابلِ قدر ساخت کی ہیں۔ اور اس نے انھیں "تحسین کی نظر" سے دیکھا۔ اور معروف صحافی جی ڈبلیو سٹیونز کا خیال ہے "پورے ہندوستان سے زیادہ سرکاری عمارتیں بمبئی میں ہیں، جن کا مقابلہ دنیا کے کسی بھی شہر کے کیا جا سکتا ہے"۔ اس نے مزید لکھا ہے کہ برٹمین محسوس کرتا کہ وہ اہم آدمی ہے کیونکہ اس نے بمبئی کو دیکھ لیا ہے۔ اس پر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ انگریز جتنی جلدی ہندوستان چھوڑ دیں، اتنا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ ان کا یہ مشاہدہ کسی بھی طرح سچا نہیں ہو سکتا۔

ہر قوم اپنے مزاج کے مطابق طرزِ تعمیر کا انتخاب کرتی ہے۔ بمبئی کی آبادی کی زیادہ اکثریت ہندوستانی ہے۔ یہ لوگ کسی بیرونی مداخلت کے بغیر میونسپلٹی کا نظام سنبھالتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو ان خوفناک چیزوں کو بنانے کے لیے بنیادی ساز و سامان فراہم کرتے ہیں۔ خواہ وہ ذاتی رہائش گاہیں ہوں یا کاروباری عمارتیں ...... کوئی شخص ...... انگریز یا کوئی اور ...... کسی ہندوستانی کروڑ پتی کو، ان فلیٹس کے بلاک کھڑے کرنے کا مشورہ نہیں دیتا جو خدا اور بندے دونوں کے لیے ہتک کا باعث ہیں۔

تو یہ وہ طرزِ تعمیر ہے جسے ہندوستانی پسند کرتے ہیں .... نہیں .... یہ غلط ہے .... وہ نہ تو پسند کرتے ہیں .... نہ ناپسند کرتے ہیں .... وہ لاتعلق ہیں .... اور انھیں اس لاتعلقی سے باہر نکالنا ناممکن ہے۔

میں نے ایک مرتبہ تاج محل ہوٹل میں منعقد ہونے والے ایک عوامی اجلاس میں اس کی کوشش کی ...... میں حاضرین کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ جن میں زیادہ تعداد بمبئی کے دانشوروں کی تھی اور تقریباً بیس منٹ تک ناقابلِ برداشت الفاظ میں ان کے شہر کی توہین کی۔ اسے زیادہ توہین آمیز بنانے کے لیے میں بالکل

ذاتیات پر اُتر آیا.......... میں نے لوگوں کے نام دوہراتے ہوئے یہ بتایا کہ ایک مشہور کروڑ پتی کا مکان شادیوں کے لیے بنائے گئے بھدے کیک کی طرح ہے۔ اور ایک دوسرے کروڑ پتی کا مکان چوہے پکڑنے کے شکنجے کی طرح ہے جس پر ملمع کاری کی گئی ہو۔ ''کوئی بھی گھوڑا جسے اپنی عزتِ نفس عزیز ہے''۔ میں نے کہا ''ان مقامات پر ٹھہرنے سے انکار کر دے گا۔ وہ دیوانہ وار سمندر کی طرف دوڑ لگائے گا اور اس میں کود پڑے گا''۔ یہاں تک کہ میں ان سب عمارتوں کو ڈھا دینے کی سفارش کی۔ یہ دعویٰ کیا کہ حاضرین میں سے جو شخص بھی ان کو گرا دینے کا عہد کرتا ہے وہ دکھی انسانیت کی خدمت میں اپنا مؤثر کردار ادا کرے گا۔

یہ ریمارکس بالکل واضح تھے اور انھیں تعریف سمجھنا بے حد دشوار ہوگا۔ میرا خیال تھا کہ جب تک کوئی شخص ملاحوں کی زبان بولنے پر نہ اُتر آئے، ان لوگوں کو اپنی بات سمجھانا آسان نہیں ہوتا.......... لیکن ہوا کیا؟.......... اخلاقی مسکراہٹیں.......... معمولی زہر خند.......... نہ سرخ چہرے، نہ غصیلی بحث و تمحیص۔ اس قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اس ردِعمل سے یا کوئی ردِعمل نہ ہونے سے، آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حاضرین کو محض یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے گھروں کے باہر کس قدر خوبصورت گلاب کھلے ہیں۔

اگلے روز میں نے اس توقع کے ساتھ اخبارات خریدے کہ ان میں چیختی ہوئی سرخیاں ہوں گی۔ آخر کو جب صحافی کسی سے ملتے ہیں تو انھیں اچھی سٹوری کی تلاش ہوتی ہے..... لیکن یہاں محض ایک شخص تھا.......... میں.......... جسے انھوں نے اس وقت کا ہاتف قرار دیا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر، جنھیں وہ خود ہی بہتر جانتے تھے۔ اُس ہاتف نے ان کے سامنے تقریر کی تھی؟..... نہیں..... وہ ان پر غرایا تھا.......... پھنکارا تھا.......... اس نے ان کے منہ پر تھوکا تھا..... اور یہ غرانا، پھنکارنا اور منہ پر تھوکنا ایسی چیزوں کے متعلق تھا جو ان سب سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے اپنے مکانات..... ان کی اپنی گلیاں..... ان کے اپنے کاروباری مراکز۔ لیکن کسی ایک اخبار نے بھی اس موضوع کو ایک مضمون کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ اوہ.......... ہاں.......... چیختی ہوئی سرخیاں موجود تھیں۔ چھوٹے چھوٹے عامیانہ سیاسی انداز کے فقرے.......... جن میں میری تمام تر تقریر کو اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ خرکوف (Kharkov) کے خلاف یورش کو چیلنج کرتی معلوم ہوئی تھی.......... لیکن ایک دلچسپ چیز کو.......... ایک تخلیقی چیز کو (کیونکہ میں نے اپنے اس حملے کے آخر میں ایک تفصیلی پروگرام دیا تھا کہ کس طرح ہندوستان میں فنونِ لطیفہ کی وزارت قائم کی جائے) یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا.......... کسی نے اس کی پروا نہیں کی۔

یہ بے حسی پورے ہندوستان کو ایک دھند کی طرح لپیٹے ہوئے ہے۔ اگر آپ ہندوستان کے کروڑ پتیوں کو بتائیں کہ ان کے محلات کو چڑیا گھروں یا جانوروں کی علاج گاہوں میں تبدیل کر دینا چاہیے تو وہ صرف اخلاقاً مسکرائیں گے..... اور اس پر کان نہیں دھریں گے۔ کسی بے حد معصوم سیاسی تبصرے پر پھٹ پڑنے والے لوگ، خود کو کور ذوق گردانے جانے پر محض مسکرا دیتے ہیں۔

اور بالآخر یہ کوشش ایک پُر مشقت عمل بن جاتی ہے۔

۳

اب ہم ایک سپاٹ دیوار کے سامنے کھڑے ہیں۔

یہ سپاٹ دیوار ہے ''بمبئی میں آرٹ''.......... اگر آپ بمبئی کی گائیڈ بک میں تلاش کریں گے..... باریک حروف میں چھپے ہوئے ایک سو بائیس صفحات۔ تو آپ کو کسی صفحے پر، کسی شکل میں، کسی انداز میں، فنونِ لطیفہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملے گا.......... اگر آپ یہاں ایک عام یورپین سے پوچھیں کہ اچھی تصویریں کہاں دیکھی جا سکتی ہیں تو پہلے تو آپ کی رہنمائی نزدیکی سینما کی طرف کرے گا، اور پھر.......... خوش دلی سے قہقہہ لگا کر بازارِ حُسن کی طرف۔

اگر آپ ہندوستانی دانشوروں سے رجوع کریں گے تو وہ کہیں گے ''اوہ.......... اے صاحب کے گھر کے گھر میں بی صاحب کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں ہیں، وہ انھیں آپ کو دکھا کر بہت خوش ہوں گے۔ ان کا گھر یہاں سے صرف دو سو میل کے فاصلے پر ہے اور وہ آپ کو جلد ہی چائے پر مدعو کرنے والے ہیں''۔

اگر آپ بی صاحب کی تصویروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہئیں تو معلوم ہوگا کہ کسی اور نے ان کے بارے میں سُنا تک نہیں.......... تب.......... اتفاق سے آپ کا سامنا اپنے جیسے کسی شخص سے ہوتا ہے، جو جدید تصاویر کا شوقین ہے.......... آپ اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں..... لیکن اس کا جواب ایک تھکا ہوا انکار ہوتا ہے۔

''لیکن ہو سکتا ہے کہیں کچھ منتخب تصاویر موجود ہوں؟''

''نہیں ہو سکتا!''

''ہو سکتا ہے کچھ سٹوڈیوز ہوں.......... شخصیات ہوں.......... ذاتی ذخیرہ ہو؟''

''نہیں!''

آپ کا اصرار دیکھ کر وہ قدرے مثبت جواب دیتا ہے۔

''بمبئی آرٹ سوسائٹی البتہ ہے''

بمبئی کے طویل اور تھکا دینے والے تبصرے کے بعد ہم اپنے قارئین کو بمبئی آرٹ سوسائٹی کے شاہکاروں پر تبصرے سے نڈھال نہیں کریں گے۔ یہ بتا دینا کافی ہے کہ انھوں نے دنیا کے کسی اور ملک کے فن پاروں کو اپنے ہاں کوئی جگہ نہیں دی۔ بہر حال اس مایوس کن ابتدائی مواد پر پردہ گرانے سے قبل ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے اور بڑے حصے میں اجنتا کی نقاشی کی گھٹیا نقول کا سلسلہ ہے[۱]۔

مغل[۲] اور راجپوت[۳] دبستان ہیں۔

دوسرا حصہ دنیا کے فرانسیسی امپریشنسٹ سے رینائیر (Renoir) تک کے مصوروں کی ویسی ہی بھونڈی نقول پر مشتمل ہے۔ ہمیں دوسرے حصے میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔

لیکن پہلے حصے سے ضرور ہونی چاہیے کیونکہ ہم اس سے پورے ہندوستان میں قدم قدم پر دوچار ہوئے ہیں۔ بار بار ہماری ملاقات ہندوستان کی نئی نسل کے مصوروں سے ہوتی ہے، جو ٹکٹکی لگائے ماضی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ ان کے لیے کبھی نیا سورج طلوع نہیں ہوتا.......... ان کا سورج ہمیشہ بہت دور اجنتا کے سنہرے پردوں کے عقب میں چمکتا ہے۔ یہ ایک مصدقہ حقیقت ہے کہ خواب دیکھنے والے ان نوجوانوں کو اسی عینک سے اپنے خیالات واضح دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب.......... بلاشبہ شدید وطن پرست ہیں۔ یہ ہمیشہ

(۱) اجنتا کے غار ٹھوس پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ یہ حیدرآباد دکن کے پہاڑی علاقے میں واقع ہیں۔ ان کا بنیادی مقصد بدھ بھکشوؤں کے لیے رہائش کی جگہ بنانا تھا۔ ان کا آغاز ۲۰۰ قبل مسیح میں ہوا۔ ان میں فن نقاشی پانچویں صدی کے فن کے اعلیٰ معیار کو چھوتا ہے۔ یہ ہندوستان کا ایسا تاریخی فنی ورثہ ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا اور یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ اگر انگریز مداخلت نہ کرتے تو یہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا ہوتا۔ صدیوں نظرانداز کیے جانے کے بعد یہ تباہی کے دہانے پر تھے جب ۱۸۱۹ء میں چند انگریز فوجیوں کو انھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے وہاں سے ان قبائلیوں کو زبردستی باہر نکالا جو ان غاروں کو مویشیوں کے باڑوں کے طور پر استعمال کر رہے تھے اور برطانوی حکومت کو ان کے بارے میں مطلع کیا جس پر انھیں تباہی سے بچانے کے بروقت اقدامات کیے گئے۔

(۲) ۱۵۵۰ء سے ۱۸۰۰ء تک مغلیہ دورِ حکومت۔ جس کے منی ایچر پورٹریٹ قابلِ ذکر ہیں۔

(۳) ۱۵۵۰ء سے ۱۹۰۰ء تک شمالی ہندوستان کے دو وسیع علاقوں راجپوتانہ اور پنجاب ہمالیہ سے برآمد شدہ۔ ابتدائی ہندو اسلوب۔

آگے بڑھنے کی بات کرتے ہیں اور ہمیشہ ہی پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں۔

اس عجوبے میں ایک سبق پوشیدہ ہے۔ وہ یہ کہ بہتر ہوگا کہ ہم بمبئی کو خیرباد کہہ کر حیدرآباد کی ٹرین پکڑیں[۱]۔

۴

ہم نے حیدرآباد کا انتخاب کیا۔ کیونکہ ہندوستان کی تمام ریاستوں میں یہ واحد ایسی ریاست ہے جہاں ہم دیانت دارانہ کام کی توقع میں کسی نوجوان آرٹسٹ سے مل سکتے ہیں۔

حیدرآباد کا رقبہ فرانس کے برابر ہے۔ یہ ایک ترقی پسند اور خوشحال ریاست ہے۔ اس کا حکمران ''نظام'' موجودہ حکمرانوں میں سب سے زیادہ دولت مند ہے، بدنامی کی حد تک۔ اس کے فقط جواہرات کی مالیت تیس کروڑ پاؤنڈز ہے۔ اس کے ذاتی سونے کے انبار اتنے بڑے ہیں کہ اگر وہ انھیں کاروبار میں لگا دے تو دنیا بھر میں معاشی بھونچال آ سکتا ہے۔ وہ ایک باشعور آدمی سمجھا جاتا ہے اور اگرچہ آئینی طور پر مطلق العنان ہے تاہم عظیم ذاتی صلاحیتوں کا حامل ہے۔

علاوہ ازیں اس کی شرف یافتہ شخصیت کے محور پر کافی تعداد میں چھوٹے چھوٹے سماجی سیارے بھی گردش کرتے ہیں۔ حیدرآباد شہر میں محلات کی تعداد اتنی ہے جس قدر پیرس میں تمباکو کوشکوں کی۔...... اور اگرچہ بہت زیادہ نہیں، پھر بھی یہاں دانشوروں کی خاصی تعداد موجود ہے جس کے ارکان کانگریس کی سابق صدر اور گاندھی کے قریبی دوست جگمگاتی ہوئی مسز نائیڈو کے کمرے میں آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔

یقیناً نوجوان فنکار اپنے آپ سے بجا طور پر یہ بات کہتے ہوں گے۔

''اگر اس دنیا میں کوئی جنت ہو سکتی ہے تو وہ یہاں ہے........ یہاں ہے........ یہاں ہے!''

اب ہم اس جنت میں داخل ہوں گے۔

حیدرآباد میں ماڈرن آرٹ کی تلاش کا کام میری وہاں آمد کے اول روز ہی سے آغاز ہو گیا......

(۱) اس سروے میں سب سے مثبت چیز جے جے سکول آف آرٹ ہے، جس میں اتفاق سے سب کچھ انگریزوں کا بنایا ہوا ہے۔ اس کا پرنسپل چارلس گیرارڈ خود ایک ممتاز مصور ہے اور اپنے طالب علموں کو چیلنج کرنے کی حد تک متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی بیوی ڈورس گیرارڈ مجسمہ سازی میں کسی جینئیس سے کم نہیں جو ہندوستان میں اپنے آپ کو محض ضائع کر رہی ہے۔

اور یہ تلاش جن خطوط پر ہوتی وہ اس قدر روایتی ہیں کہ اب انھیں بے حد مختصر طور پر آخری مرتبہ بیان کیا جائے گا اور یہ بالکل اُسی طرح مدراس، میسور، کلکتہ، لاہور وغیرہ پر بھی منطبق ہو سکے گی۔

''میں ماڈرن انڈین آرٹ کے کچھ نمونے دیکھنا چاہتا ہوں''۔

''او ضرور، آپ کو اجنتا کے غار دیکھنے چاہئیں............''

اس دوران مداخلت کر کے یہ وضاحت کی جاتی ہے کہ میں پانچویں صدی کے ذرا بعد کی چیزیں دیکھنا پسند کروں گا۔

دردناک خاموشی............اس کے بعد............

''آپ ملکہ مسجد دیکھ چکے ہیں؟''

مجھے تھوڑا سا اشتیاق ہوتا ہے۔ اس دلچسپ عمارت کی بنیاد ۱۰۲۳ء میں رکھی گئی تھی۔ لیکن ہنوز میں زیادہ پُر جوش نہیں ہوں۔

ہم ایک صدی فی منٹ کی رفتار سے مسجدوں اور مندروں کی طویل فہرست سے گزرتے ہیں۔ لفظ ''جدید'' پر توجہ مرکوز کیے ہوئے۔ ہم انیسویں صدی کے آغاز تک آتے ہیں اور وہاں رُک جاتے ہیں۔

''لیکن میں کسی زندہ ہندوستانی فنکار کا کام دیکھنا چاہتا ہوں!''

''زندہ؟'' ان کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ''زندہ؟''

اور تب آخرکار وہ اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن شاذ و نادر...... کہ وہ ایک ہندوستانی آرٹسٹ کو جانتے ہیں...... محض ایک کو............ وہ ہمیشہ ایک ''عظیم ترین انڈین آرٹسٹ'' ہوتا ہے اور ہمیشہ ایک ''مختلف آدمی'' ہوتا ہے۔ بنگال میں ٹیگور...... دہلی میں جیمنی رائے۔ مدراس میں چودھری۔

یہاں! حیدرآباد میں وہ چغتائی تھا۔

''ہمارے پاس چغتائی کی پینٹنگز کا بہت عمدہ انتخاب ہے''۔ انھوں نے بتایا میں چغتائی کے بارے میں سُن چکا تھا اگرچہ اس کے کام کا کوئی نمونہ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بہرحال اس لمحے اس کے کام کے معیار سے زیادہ یہ بات اہم تھی کہ وہ زندہ تھا!

''کیا تمھیں یقین ہے کہ وہ زندہ ہے؟''

''جی ہاں، وہ کسی حد تک زندہ ہے''۔ پہلے گائیڈ نے جواب دیا۔

''بہت زندہ ہے'' دوسرے نے اتفاق کیا۔

جب مسٹر چغتائی کے زندہ ہونے کی پورے شد و مد سے تصدیق کی گئی تو ہم اس کی پینٹنگز دیکھنے کے لیے نکلے۔ وہ...... میرے خیال میں، حیدرآباد شہر میں آویزاں تمام پینٹنگز میں سب سے زیادہ ماڈرن تھیں۔

۵

آویزاں؟ کیا میں نے آویزاں کا لفظ استعمال کیا؟

یہ لفظ قبل از وقت ہے۔

کیونکہ اب............ ایک بہت عجیب چیز واقع ہوئی جس کا بیان ضروری ہے، خواہ کتنا ہی مہمل معلوم کیوں نہ ہو......

جب میں گیلری میں داخل ہوا، اور نگران سے جو ایک دلکش معمر آدمی تھا، اپنا مدعا بیان کیا تو وہ مجھے طویل راہداریوں اور پُر پیچ سیڑھیوں سے لے کر چلا، سینکڑوں برس قدیم، دھندلے منی ایچرز سے گزر کر آخر کار ہم پچھلے دروازے کی طرف آئے جو اس شریف آدمی کے رہائشی کمرے کے قریب تھا اور یہاں، گرد سے ڈھکا ہوا ایک انبار دیوار کے پاس رکھا تھا۔ یہ ہمارے ممدوح چغتائی صاحب کی بے شمار پینٹنگز تھیں جو .... آپ کو یاد ہوگا کہ کس قدر زندہ بتائے گئے تھے۔

''لیکن کیوں؟'' میں نے بات شروع کی اور پھر رُک گیا...... ادھورا سوال شاید غیر اہم معلوم ہو...... ''کیوں؟''۔ میں پوچھنا چاہتا تھا ''چغتائی صاحب گرد کی چادر اوڑھ کر اس شریف آدمی کے کمرے کے باہر تشریف فرما ہیں؟''

وہ واحد ماڈرن آرٹسٹ تھا جس کے کام کا ذکر حیدرآباد کے ماہرین فنون لطیفہ کرتے تھے۔ یا کم از کم وہ واحد اور تنہا پینٹر تھا جس پر میری توجہ گئی تھی۔

''اس قدر ناگوار حالت اور حیثیت میں کیوں؟''

''انھیں لٹکانے کے لیے ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں ہے''۔ نگران نے معذرت خواہانہ انداز سے کہا۔

''لیکن یقیناً کوئی نہ کوئی جگہ ضرور ہوگی''۔

''نہیں، کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کا ہمیں افسوس ہے کیونکہ ہمارے خیال میں وہ ہندوستان کا سب سے جدید مصور ہے''۔

''یہ یہاں کتنے عرصے سے پڑی ہیں؟''

''کئی برس سے''

''اور آپ کا مطلب ہے پورے حیدرآباد میں کوئی ایک کمرہ ایسا نہیں ہے، جس کی ایک دیوار خالی ہو اور آپ اس پر اس مصور کی تصاویر کو لٹکا سکیں جسے آپ ہندوستان کا سب سے ماڈرن پینٹر گردانتے ہیں؟''
ثابت ہوا کہ ایسی کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہ ناقابلِ یقین تھی .... لیکن حقیقت تھی۔ معاملات کی ابوالعجبی پر ششدر و حیران، میں نے تصاویر کا جائزہ لینا شروع کیا اور تب ایک تکلیف دہ جھٹکا لگا .... کیونکہ گوشت پوست کا چغتائی خواہ کچھ بھی رہا ہو۔ یہ پوری شدت سے واضح تھا کہ .... جس زندگی کی اُس نے عکاسی کی تھی ...... وہ مغربی معیار کے مطابق ...... ایک بیمار اور نڈھال تجریدیت تھی۔

یہ دلیل پیش کی جا سکتی ہے کہ اس قسم کے فن پاروں کو پرکھنے کے لیے محض مغربی معیار کافی نہیں ہے۔ اس صورت میں بلاشبہ .... معیارِ حسن کی تنقید کی ایک متقابل کوشش میں کوئی حرج نہیں۔ بہرحال اس معیار کے مطابق بھی، وہ قابلِ تعریف تکنیکی مہارت کے باوجود، مجھے وہی پُرانی کہانی کہتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ المیہ داستان، جو ہندوستان اپنی ہزار ہا آوازوں میں سُناتا ہے۔

اس آرٹسٹ کی بھی سورج کی طرف پشت تھی اور وہ ٹکٹکی باندھے ماضی کے اندھیروں کو گھور رہا تھا۔ وہ قدیم دیومالاؤں کے ہیولوں کو تجسیم کر کے انھیں اپنے کینوس میں قید کرنے کی اندوہ ناک مشقت میں مصروف تھا۔ شان و شوکت کی چند شعاعوں کے ساتھ ...... جو عرصہ ہوا بجھ چکی تھیں۔ لیکن وہ ہیولے موم کے مجسموں کی طرح تھے اور وہ شان و شوکت شدت کے ساتھ ان پر حاوی تھی۔

چغتائی کے چیلوں میں .... جو بے شمار تھے۔ یہ رجحانات وحشت ناک مبالغے کے ساتھ دکھائی دیتے تھے۔

چغتائی، بر سلے سے کافی حد تک استفادہ کرتا ہے اور اس کے پیروکار اپنی تصویروں کو بر سلے کے دوبار تبدیل شدہ طرز سے مجرد دیتے ہیں۔ چغتائی سولھویں صدی کے چینی مصوروں سے فیض یاب ہوتا ہے اور اس مرتبہ بھی اس کے نقال اپنے کینوس پر بانسوں کا جنگل اُگا دیتے ہیں۔ لیکن جہاں چینیوں نے اپنے بانسوں

کو ہوا کی لَے پر نغمہ سرا بنایا، وہاں مصوری کے یہ طالب علم انھیں محض گرد سے اَٹا ہوا بناتے ہیں۔ یہاں .... وہاں .... اور ہر جگہ اجنتا کے غاروں کا اثر ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اجنتا کے مصوروں نے ایک عظیم روشنی کو دیکھا اور اس کی نمود میں کامیابی حاصل کی جبکہ ان کے جدید پیروکار محض اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور ایک ٹوٹے ہوئے چراغ کے گرد لڑکھڑا رہے ہیں۔

میں حد درجہ مایوسی کا شکار ہو گیا اور جتنی جلد ہو سکا اس مہربان بوڑھے نگران سے اجازت طلب کی اور اپنی تھکی ہوئی آنکھوں کو ایرانی مصوری کے چند ابتدائی نمونوں کے شیریں و خوشگوار رنگوں سے تسکین دینے لگا۔ مردہ حال سے زندہ ماضی کی طرف پلٹ آنے پر، شکر گزاری کے احساس کے ساتھ۔

اس سب کچھ کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ چغتائی کے فن پارے اس سے کہیں بہتر مقام کے مستحق تھے، جہاں اس وقت انھیں رکھا گیا تھا۔ یعنی اس بوڑھے نگران کے رہائشی کمرے کے دروازے کے باہر۔ کم از کم چغتائی جانتا تو تھا کہ اُسے کہنا کیا ہے اور وہ پوری فنی مشاقی کے ساتھ اپنی بات کہنے پر قادر بھی تھا۔ لیکن چھوٹے چغتائیوں کا گروہ ایسی کسی قابلیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

۶

خدا کے لیے یہ شکوے شکائتیں بند کرو اور کوئی مثبت بات کرو۔ ہو سکتا ہے کہ قاری یہ مطالبہ کر بیٹھے اور میں دل سے اس کے ساتھ اتفاق نہ کر سکوں۔ مثبت بات؟ لیکن کیسے؟ .... کیا؟ .... کہاں؟ .... یہ اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ ایک ہندوستانی کی رائے سُنیے .... "Cultural Heritage of India" میں ممتاز مصنف ڈاکٹر کمارسوامی لکھتے ہیں: ''بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ فنونِ لطیفہ میں فنی تنقید، معیار اور مقدار، باصلاحیت مصوروں کی تعداد، ہر لحاظ سے ہمارا موجودہ افلاس، دنیا کی تاریخ میں ایک منفرد مثال ہے''[1]۔

اس سے زیادہ مبسوط تبصرہ مشکل تھا، ہر چند ہم ان صفحات کو خود ہندوستانی مصنفین کے تنقیدی اقتباسات سے بھر سکتے تھے۔

خیر ہمیں اس سلسلے میں مقدور بھر کوشش کرنی تھی اور اگلی منزل جو ہمیں پکار رہی تھی ...... میسور تھی .... وہاں ہماری تلاش کا حاصل سوائے ایک آرٹ سکول کے کچھ نہ تھا ...... جہاں کا نگران کئی برس تک

---

(۱) کمارسوامی کی تحریر کردہ "The Cultural Heritage of India"، جلد سوم، صفحہ ۵۱۰۔

اجنتا میں رہ چکا تھا اور اُس کے جسم کی جھریاں بتا رہی تھیں کہ وہ خود بھی وہاں کندہ نقوش میں سے نکل کر آیا ہے۔ اس کے طلبہ کا کام بھی نمایاں طور پر اخذ شدہ تھا۔

بے شمار چھوٹے چھوٹے شہروں سے گزرتے ہوئے اور .... لا حاصلی کے سوا کچھ حاصل نہ کرتے ہوئے ...... ہم اتفاقاً مدراس آ پہنچے .... ہندوستان کا تیسرا بڑا شہر .... بے انتہا امیر .... ایک شاندار بندرگاہ ...... زندگی سے ہمہماتی ہوئی ....

معمول کے سوالات کیے گئے اور معمول کے جوابات موصول ہوئے ...... کسی بھی ہندوستانی یا انگریز نے کبھی کسی آرٹسٹ کے بارے میں یہاں بھی نہیں سنا تھا (کبھی سے مراد کوئی بیرا یا گھنٹی پر آنے والا ملازم یا ٹیکسی ڈرائیور نہیں بلکہ مشہور و معروف اور ممتاز شہری ہیں)۔ ان کے خیال میں یہاں آرٹ گیلری جیسی کسی بھی شے کا وجود نہیں ہو سکتا تھا۔ .... اگرچہ انھوں نے خوشدلی کے ساتھ اطلاع دی کہ کونمرا ہوٹل کے قریب ہی ایک اچھا فوٹوگرافر موجود ہے۔

ان یقین دہانیوں کے باوجود، میں ثابت قدم رہا۔ یہ میرے لیے ایک طرح کا جنون بن چکا تھا۔ معاملے کی یہ منفی نہج قطعی طور پر مضحکہ خیز نظر آتی تھی اور مجھے یقین تھا کہ کوئی چیز .... کسی جگہ .... ہونی ضرور چاہیے۔

اور تھی ....

وہ چودھری کا آرٹ سکول تھا۔

یہ ہم پر حادثاتی طور پر منکشف ہوا۔ ایک روز ہم کار میں شہر سے گزر رہے تھے کہ ایک پُرانی عمارت کے پاس سے گزرے جو اتفاق سے دیکھنے میں اتنی بھیانک نہیں تھی۔ یہ اتنی خوشگوار حیرت تھی کہ باہر نکل کر اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوا۔ اس مکان کے گرد ایک باغیچہ تھا اور ایک زینہ کسی ایسے مقام کی طرف جا رہا تھا، جو کسی سٹوڈیو سے مشابہ تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اندر کوئی آرٹسٹ موجود ہو؟

اور تھا .... میں سیڑھیاں چڑھا۔ دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلنے پر خود کو ایک لیکچر روم میں پایا، جہاں کلاس جاری تھی۔ کیونکہ کسی نے بھی میری وہاں موجودگی کا بُرا نہیں منانا۔ اس لیے میں وہاں ٹھہر گیا اور دیکھتا رہا۔ ان طلبہ کی کاوشوں پر ایک روایتی پردہ پڑا رہنے دیجیے۔ ہماری حساسیت پہلے ہی کافی مجروح ہو چکی ہے لیکن جب طالب علم رخصت ہو چکے تو میں نے چودھری سے ایک طویل، سیر حاصل گفتگو کی

اور اس کا کچھ کام بھی دیکھا جو بہت انقلابی تو نہیں تھا لیکن کم از کم جاندار ضرور تھا۔ چودھری کے پاس کینوس پر اتارنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور تھا اور وہ اس کے تکنیکی اظہار پر بھی قادر تھا۔ لیکن اس نے الفاظ کے ذریعے جو کچھ کہا وہ اس کی رنگوں کے ذریعے بیان کردہ باتوں سے زیادہ دلچسپ تھا۔ وہ اُسی کا لب لباب تھا جو اپنے اس باب میں تفصیل سے کہتا چلا آ رہا ہوں۔ ہندوستان فنی لحاظ سے ایک ریگستان تھا۔ یہاں آرٹ کی اہمیت کے بارے میں ایک نرم بہانہ سازی بھی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ، فنکاروں کا معیشت میں غیر نمایاں کردار ہو .... اگرچہ .... بلاشبہ .... فوٹوگرافروں کو بہت اعلیٰ درجے کی مخلوق سمجھا جاتا تھا ...... اور فن کاروں کی حیثیت اچھوتوں سے مختلف نہیں تھی[1]۔

۷

ہم اس تھکا دینے والی تلاش کو مختصر کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ تلاش کئی ماہ کے عرصے پر مشتمل اور پورے ہندوستان پر محیط تھی لیکن اس کے نتیجے میں ہمیں آرٹسٹ کی تعریف پر پورا اُترنے والا صرف ایک شخص دستیاب ہوا تھا۔ جامنی رائے۔ میں نے کسی رائے کو پہلی بار مسز نائیڈو کے کمرے میں دیکھا تھا اور اس کے بعد کلکتہ، لاہور اور دیگر شہروں میں ان کی کافی تعداد ملی۔ جامنی رائے کے معاصرین کی بیمار، دھندلی تصاویر دیکھنے کے بعد اس کی تصویروں میں کافی دھماکہ خیز امکانات نظر آتے ہیں اور وہ بے شمار منفرد اور تکنیکی مہارت کا حامل ہے۔ (اس کے ابتدائی کام پر وان گو کے اثرات ہیں) لیکن بنیادی طور پر بنگالی فوک آرٹ سے متاثر ہے جو بہت گہرے شوخ رنگوں اور مردانہ خصوصیات کا حامل ہے۔

وہ ایک دلچسپ آدمی ہے جس نے خود کو کاروباری کلکتہ کے مردہ ماحول میں گھرے ہوئے پا کر، اپنے لیے ایک مختلف کیریئر کا انتخاب کیا اور کامیابی کے حصول کا تہیہ کر کے، ایک دور دراز گاؤں میں رہائش اختیار کی۔ جہاں اس نے اپنی زندگی کو از سرِ نو ترتیب دیا اور اپنے فن کو نئی زندگی دی۔

اس نے یہ سب کس انداز سے کیا ....

''پہلی چیز اس نے یہ کی کہ اپنی پلیٹ کو تبدیل کیا۔ اس نے یورپ کے رنگوں کو خیرباد کہا

(۱) گاندھی کے مزاج میں بھی جدید ہندوؤں کی طرح آرٹ کے سلسلے میں روایتی قسم کی بے حسی پائی جاتی ہے۔ اس کے معاملات کی منصوبہ بندی میں فنونِ لطیفہ کا کوئی مقام نہیں۔ ممکن ہے وہ فنونِ لطیفہ کے بارے میں ویسا ہی بیان دے، جیسا جی کے چیسٹرٹن نے موسیقی کے سلسلے میں دیا تھا۔ ''یہ میری سمجھ میں اس قدر کم آتی ہے کہ ناگواری کا احساس تک نہیں دیتی''۔

اوران رنگوں کا استعمال شروع کیا جو فطرت کے مظاہر میں پائے جاتے تھے اور جنھیں دیہاتی استعمال کرتے تھے۔ گہرے زرد رنگ کے لیے اُس نے پوتر مٹی استعمال کی اور ہلکے زرد کے لیے ہڑتال۔ ہندوستانی لال رنگ اُس نے گیروی مٹی سے حاصل کیا۔ نیلا رنگ، نیل سے۔ سفید، کاک خوری اور سفید مٹی سے۔ سیاہ، ناریل کے جلے ہوئے چھلکوں سے اور ہانڈیوں کے پیندے سے"[1]۔

کسی بھی اور ملک میں رائے کا کام بے شمار طالب علموں کو متاثر کرتا اور وہ ایک دبستان کا درجہ حاصل کر لیتا جو وہ ہندوستان میں نہیں کر سکا۔ کیونکہ یہاں کسی بھی طرح کے مذہبی، سیاسی اور طبقاتی تعصبات سے ماورا ہو کر کام کرنا ممکن نہیں اور ایسا تجربہ کرنے والا کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ رائے کی پینٹنگز میں ایسا کوئی عنصر نہیں ہے جو آپ کو بتا سکے کہ وہ ہندو ہے، مسلمان یا عیسائی۔ وہ محض زندگی کے چہرے کو دیکھتا ہے اور اسے پینٹ کرتا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو اس کے معاصرین کے فہم سے بالاتر ہے۔ وہ معاصرین جن کے خیال میں آرٹ کو ہمیشہ سیاست یا مذہب کی پیداوار ہونا چاہیے۔

ہندوستان میں ایک اور آرٹ سینٹر ہے جو بے پناہ اہمیت کا حامل ہے اور جس کے ذکر کے بغیر یہ باب مکمل نہیں ہو سکتا۔ شانتی کیتن۔

شانتی کیتن کا مطلب ہے......"سکون گاہ"...... یہ دارجلنگ کے نزدیک پہاڑوں کے اوپر واقع ہے۔ اسے چالیس برس قبل رابندر ناتھ ٹیگور نے قائم کیا تھا اور اسے یونیورسٹی میں تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ یہ یونیورسٹی تو کبھی نہیں بن سکی مگر اس کے بھائی، ابانندر ناتھ ٹیگور نے اُسے ایک آرٹ سکول کی صورت میں کافی ترقی دی اور یہی آرٹ سکول آج بھی موجود ہے۔

ہندوستان بھر میں اس کی بڑی شہرت ہے اور اس کا کہنا مذکور، رابندر ناتھ ٹیگور سے وابستہ کسی بھی شے کی بڑی شہرت ہے۔ اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ ٹیگور دنیا کی عظیم ترین جینئس شخصیات میں سے ایک تھا اور ایک ہی سانس میں اس کا ذکر گوئٹے اور ملٹن کے ساتھ کرنے کے عادی ہیں تو آپ کو بلاشبہ شانتی کیتن جانے کی خواہش ہونی چاہیے اور اگر آپ کی رائے مجھ سے ملتی جلتی ہے اور آپ سمجھتے ہیں کہ ٹیگور محض ایک عام درجے کا دلکش شاعر تھا جس نے زیادہ تر ییٹس (Yeats) سے استفادہ کیا تھا تو............ شاید آپ وہاں نہ جائیں۔

اور اگر آپ کا مقصد واقعی جدید ہندوستانی آرٹ تک رسائی حاصل کرنا ہے تو آپ یقیناً وہاں نہیں جائیں گے۔ میں ابانندر ناتھ ٹیگور اور اس کے پیروکاروں کی تصاویر پر تبصرہ کر کے مزید وقت ضائع نہیں کروں گا.......... اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ بھی وہی قدیم کہانی دہراتے ہیں جو ہم اپنی اُس تلاش کے دوران مسلسل سنتے چلے آرہے ہیں۔ وہ بھی ٹکٹکی لگائے مسلسل ماضی کو گھور رہے ہیں اور ایک قسم کی غائب الدماغی کے عالم میں اجنتا کے نقوش کو نقل کر رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ان کے بارے میں ان کے سب سے بڑے حمایتی کی رائے بیان کی جائے۔

وکٹوریہ میموریل ہال کلکتہ کے ناظم پرسی براؤن اے۔ آر۔ اے۔ اپنی کتاب "Indian Painting" میں لکھتے ہیں: "انھوں نے ماضی کی قدیم تاریخی تصاویر، اجنتا اور سگریا کے نقوش اور تبت کے مذہبی کتبوں، مغل اور راجپوت دبستانوں کے منی ایچرز کو علیحدہ علیحدہ کیا اور ان پرنئی تحریکوں کے اثرات کو تلاش کیا ــــ ان فنکاروں کی صلاحیتیں بلاشبہ ایک عظیم سرمایہ ہیں.......... لیکن کیا یہ اتنی مستحکم بنیاد ہے، جس پر ایک قومی ورثے کی تجدید کے آثار دیکھے جا سکیں؟"

یقیناً، ایسا ہی ہوگا!

۸

یہ باب اس قدر منفی خصوصیات کا حامل رہا ہے کہ اپنے اختتام پر ایک زوردار مثبت تال کا متقاضی ہے۔ بہتر ہوگا کہ میں حال ہی میں "انڈیا اور آرٹ" کے موضوع پر دیے گئے اپنے لیکچر سے ایک اقتباس پیش کروں۔ یہ لیکچر میں نے بمبئی کی "سوسائٹی فار دی پروپیگیشن آف ایجوکیشن اینڈ کلچر" کی افتتاحی تقریب میں دیا تھا۔ اس حقیقت کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ لیکچر میں میرے ساتھ پروفیسر ہل شریک تھے جو رائل سوسائٹی کے صدر تھے۔ لہٰذا اس اجلاس نے معمول سے زیادہ پبلسٹی حاصل کی اور پورے ہندوستان میں میرے نظریات کو غیر متوقع مثبت ردِ عمل حاصل ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً ان کی کوئی اہمیت تھی۔

لفظ "آرٹ" کی اس کے وسیع تر معانی میں تشریح کی کوشش کے بعد، میں نے بیان کیا کہ یہ ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے آدمی کائنات کے انتشار کی کیفیت میں کچھ باقاعدگی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس طرح ستاروں سے، جو آسمان کے فرش پر بے حد لاپروائی سے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، کوئی نمونہ بنانے کی کوشش کی جائے اور اس باقاعدگی پیدا کرنے کے مقصد کے لیے آرٹ، سائنس یا مذہب کی نسبت

زیادہ بلاواسطہ طریقہ ہے۔ کیونکہ یہ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے خود ہی کافی ہے اور یہ نہ تو کوئی وضاحت پیش کرتا ہے اور نہ طلب کرتا ہے۔

میں نے اس مقصد کے لیے ایک آرٹسٹ کے طور پر ریمبراں کی یقینی مثال منتخب کی جس کا جینئس اتنا طاقت ور تھا، جس نے گھریلو استعمال کی معمولی اور بے کیفیت اشیا کو حُسن کے شعلے سے چمکا کر ایک مستقل اہمیت کا حامل بنا دیا تھا۔

(اس دال دلیے کے لیے قارئین سے معذرت)۔ لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ میں یہ گفتگو بمبئی میں کر رہا تھا، جہاں کے اعلیٰ طبقے کے لیے آرٹ کا مطلب تھا، کرسمس کارڈز پر برف میں روایتی رو بن کے بجائے مونالیزا کی تصویر چھاپنا۔

''ان کو ریمبراں کی قصاب کی دکان پر خصوصی طور پر توجہ دینی چاہیے کیونکہ صرف قصاب کی دکان ہی ایک ہندو آرٹسٹ کے لیے سب سے گھٹیا اور غلیظ جگہ ہو سکتی ہے''۔

میں نے کہا ''زندگی کا قصاب کی دکان کی طرح کا ایک کھردرا حصہ لیجیے۔ شہر کے کسی نادار علاقے سے، اس کے گوشت کے لوتھڑوں کے ساتھ، خون کے دھبّوں کے ساتھ اور ارد گرد بھنبھناتی مکھیوں کے ساتھ۔

اب اگر کوئی سائنس دان اس کے قریب سے گزرے گا تو سوچے گا کہ یہ کتنا مضرِ صحت ہے اور کتنے احمق لوگ ہیں جو اپنے پیسے کو وٹامن سے اس قدر عاری خوراک پر ضائع کرتے ہیں۔ کوئی پروہت وہاں سے گزرے گا تو قصاب کی وحشیانہ فطرت اور آدمی کی نہ ختم ہونے والی بھوک کے بارے میں سوچے گا.........

لیکن جب تین سو سال قبل ریمبراں اس کے پاس سے گزرا تو وہ رُکا اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ لطف اندوز ہوا۔ کیونکہ اس نے کوئی مختلف چیز دیکھی تھی۔ اس نے زندگی کا ایک اور رُخ دیکھا اور یہ رُخ بھی خوبصورت تھا۔ گہرے رنگوں اور دھندلے ڈیزائن والا..... پھر وہ بیٹھ گیا اور اُسے پینٹ کیا۔ تاکہ آج ہم قصاب کی اس دکان کو اُس کی آنکھوں سے دیکھ سکیں اور اس طرح سوچ سکیں کہ ہم جن بے شمار کھڑکیوں سے آسمانی مناظر دیکھتے ہیں، یہ بھی ویسی ہی ایک کھڑکی ہے''۔

میں نے کہا کہ اس سہل مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ انڈین آرٹ میں کیا خرابی ہے کہ یہاں کے آرٹسٹ قصاب کی دکان کی طرف نہیں دیکھتے۔ (یہ فنونِ لطیفہ پر تنقید کے ہندوستانی معیار کا ایک دلچسپ ضمنی پہلو ہے کہ بہت سے اخبارات نے اسے ویجیٹیرین ازم پر حملے کے طور پر پیش کیا)۔

میری آخری دلیل جو حقیقتاً اس فضولیات کی دوبارہ اشاعت کے لیے واحد معذرت ہے، یہ تھی ''یہ ہندوستانی نوجوان آرٹسٹوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنے برش کو ہندوستانی رنگوں کے پیالے میں ڈبو کر اپنے کینوس پر استعمال کرتے ہیں یا نہیں.......... مثال کے طور پر، مجھے اچھا لگے گا اگر ایک نوجوان ہندوستانی آرٹسٹ کسی مذہبی رسم کی ادائیگی کو پینٹ کرے اور یہ ظاہر نہ کرے کہ یہ رسم ہندو ہے، مسلمان ہے یا سکھ ہے۔ وہ جو بھی ہو لیکن اُسے محض رنگوں کے ایک نظارے کے طور پر پیش کیا جانا چاہیے۔ مورتی کا گلابی اور سنہری رنگ، اس کے ارد گرد بکھرے ہوئے کاسنی پھول، پجاریوں کے ہاتھوں پر سیندور کی لکیریں اور ہجوم کے لباس کے وہ تمام سر بین سے نظر آتے رنگوں جیسے رنگ جو گلی کوچوں میں ہمہمائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی شخص مون سون کو اس کے ناقابلِ یقین ڈرامے کے ساتھ پیش کرے۔ جب آسمان ایک سٹیج کے اضافی پردے کی طرح نظر آتا ہے۔ جیسے روشنیاں ڈوب رہی ہوں اور کھیل کا آغاز بس ہوا ہی چاہتا ہو۔

ان سب سے بڑھ کر میں چاہتا ہوں کہ ہندوستانی آرٹسٹ، ہندوستان کے المیے کو پینٹ کرے۔ کیونکہ جب کسی قوم کے المیے اس کے فنونِ لطیفہ کا حصہ بنتے ہیں تو تب ہی انھیں ایک صحیح تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تب وہ محض تلخیاں اور مایوسیاں نہیں رہتے بلکہ بہتری کی طرف ایک تحریک، ایک قوت بن جاتے ہیں۔

اگر ایک انتہائی مثال کو لیا جائے تو بنگال کے حالیہ فسادات سب سے زوردار موضوع تھا، جس سے نوجوان ہندوستانی فنکاروں کو سب سے زیادہ تحریک ملنی چاہیے تھی۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جو ہوگارتھ (Hogarth) یا ایک گویا (Goya) کی نظروں کا متقاضی تھا۔ اس نے ان کو ایک موقع فراہم کیا کہ ایسے موضوع کو پینٹ کریں جو پوری دنیا کے لیے افسوس اور شرم کا باعث تھا۔

میں یہ کسی قسم کی سنگدلی کے جذبے کے تحت نہیں کہہ رہا ہوں۔ کیونکہ میں نے خود ان دھتکارے ہوئے لوگوں کے ساتھ کئی دن گزارے اور کوئی صاحبِ دل اس تجربے کے بارے میں عام انداز سے بات نہیں کر سکتا۔ میں جو تجویز پیش کر رہا ہوں وہ دوسروں کی تکالیف کی نقل تیار کرنے کی بیکار خواہش نہیں ہے اور یقیناً اس لیے بھی نہیں کہ میں فن برائے فن کا قائل ہوں۔ ہرگز نہیں! میں فن برائے زندگی میں یقین رکھتا ہوں۔ ہندوستانی فن برائے ہندوستان، میں یقین رکھتا ہوں۔......اور ہندوستان کی خاطر میں یہاں کے فن کاروں کو دعوت دے رہا ہوں کہ وہ اپنے ہاتھی دانت کے سفید میناروں سے نیچے اُتریں اور کھلی ہوا میں سانس لیں اور جدید زندگی کے میدان میں قدم رکھیں۔ وہ یہ کر سکتے ہیں۔ وہ یہ کر چکے ہیں۔ اور ہمیشہ .... جب وہ یہ کر

چکتے ہیں تو ان کا فن حیرت انگیز اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔

اب تک میں آپ سے زیادہ تر، مایوس کن ناکامیوں پر بات کرتا رہا ہوں۔ تبدیلی کی غرض سے مجھے اس تصویر کو بدلنے کی اجازت دیجیے تاکہ ایک کامیابی کی مثال پیش کرسکوں۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں مجھے جس خوبصورت ترین اور اہم عمارت کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، وہ حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی ہے۔ جدید فنِ تعمیر کا شاہکار، جس سے آگے نکلنا نہ یورپ کے لیے ممکن ہے نہ امریکہ کے لیے۔......اور کیوں یہ عمارت اتنی عظیم الشان ہے؟ اس لیے نہیں کہ آرکیٹکٹ فن برائے فن کا قائل تھا، جس کا ہندوستان میں سیدھا سا مطلب ہے، فن برائے اجنتا۔ بلکہ ایسا اس لیے کہ آرکیٹکٹ جو طبقاتی کشمکش کے سبب ٹوٹ رہا ہے اور اس نے اس مسئلے کو نظر انداز کرنے، اپنے سٹوڈیو میں منہ چھپانے اور آنکھیں چُرانے کے بجائے، اس مسئلے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا ''بہت خوب۔ یہاں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔...... اور میں یہ رائے نہیں دوں گا۔ کاغذ پر بھی نہیں کہ دو ایک ہیں اور ایک جیسے ہیں۔ کیونکہ وہ نہیں ہیں......لیکن میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ دونوں کے ہاں حُسن موجود ہے......اور میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں دونوں طرف سے، دونوں اقسام کے حُسن کو استعمال کرسکتا ہوں۔......اور آپ دیکھ لیجیے۔ میں ان دونوں کو بہترین انداز میں استعمال کررہا ہوں۔

اور اس نے ان دونوں اقسام کے حُسن کو بہترین انداز سے استعمال کیا۔ اس نے ان میں شاندار اتحاد پیدا کیا۔ ہندوستانوں پر مشتمل سامنے کے حصے پر اُس نے مسلم محراب بنائی اور مسلم کھڑکیوں پر ہندو آرائش کی۔ اس انداز سے کہ وہ دونوں ثقافتوں کا شاہکار معلوم ہوتی ہیں۔ جن میں ہر ایک منفرد ہے، ہر ایک کا اپنا خاص کردار ہے لیکن اچانک محسوس ہوتا ہے کہ تمام تر انفرادیت کے باوجود ان کا سرچشمہ ایک ہے جس کا نام ہے حُسن!

ہندوستانی فنِ تعمیر کی تنہا مثال کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے چند ہفتے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس کی اصل سکیم کا زیادہ تر حصہ ایک بلجین موسیٹر جیسپٹر کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

☆☆☆

چھٹا باب

وقفۂ موسیقی

ایک آئیڈیل سفرنامے کو آوازوں سے پُر ہونا چاہیے۔ اس کے مکالموں کے پس منظر میں گلیوں کی چہل پہل یا سمندر کی موجوں کا شور ہونا چاہیے۔ محلوں کے سائے میں بے شمار بازگشتیں ہونی چاہئیں۔ راہداریوں میں قدموں کی آہٹیں اور چھتوں پر گرتی ہوئی بارش کی آواز۔

لیکن بیشتر سفرنامہ نگار بہرے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آسمانوں کی انتہائی حد تک مینا کاری کرتے ہیں لیکن انھیں پرندوں کے نغموں سے محروم کردیتے ہیں۔ وہ بے حد نفاست سے کسی معبد کی پیشانی سجاتے ہیں لیکن بیرونی دروازے پر لگی گھنٹیوں کو فراموش کردیتے ہیں۔

ہر چند یہ کوئی سفرنامہ نہیں ہے تاہم ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہم نے بہت سے سفر ڈال دیے ہیں۔ اس خیال سے کہ یہ زندگی کے قریب تر معلوم ہو۔

اب ہمیں اس حقیقت کا ادراک ہوتا ہے کہ اس تمام تر آوارہ گردی کے دوران ہم زیرِ سطح عجیب و غریب آوازوں سے دوچار رہے ہیں۔ جب چپڑاسیوں کا ٹولہ لکڑیوں یا اپلوں کی آگ کے گرد بیٹھ کر گاتا ہے تو یہ کھڑکی کے راستے اندر آجاتی ہیں۔ جب کسی مذہبی تہوار کے دوران گلابی اور سنہری مورتی کے گرد بھجن گائے جاتے ہیں تو یہ گلیوں میں گونجتی ہیں۔ اچانک کسی بدبختی کی خبر کی طرح ریڈیو سے پھوٹ پڑتی ہیں اور بعض اوقات شام کو، جب ہم شام کے دھندلکے میں کسی گاؤں کے قریب سے گزرتے ہیں تو دھان کے کھیتوں سے بانسری کی دُھن ہوا میں لہراتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا سفر موسیقی کی طرف ہوتا ہے اور والٹر پیٹر کے مشہور قول کے مطابق:

''تمام فنون، آخر میں موسیقی میں ڈھل جاتے ہیں''۔

اور اب وقت ہے کہ ہم اپنے کان کھول کر سڑکوں اور شاہراہوں پر نکلیں اور سُنیں کہ وہاں گونجتی ہوئی موسیقی کیا کہہ رہی ہے۔

ممکن ہے ہماری تلاش، ہمیں بعض عجیب مقامات اور تعجب خیز نتائج سے دوچار کرے، لیکن جب یہ مکمل ہوجائے گی تو ہم ہندوستان کے بارے میں کچھ ایسی باتیں جان چکے ہوں گے، جو دوسری صورت میں

ممکن ہے دھند لکے میں رہتیں۔

۲

پیلا ئمل نسبتاً بڑے دائروں میں ہے۔اس صورت میں کہ ہندوستانی موسیقی، زیادہ تر یورپ والوں کے لیے نہ صرف نا قابلِ فہم ہے بلکہ بڑی حد تک کراہت انگیز ہے[1]۔اس یقین کے ساتھ کہ کوئی بہترین چیز سُننے کو ملے گی ہم ایک بیش قیمت کار میں سوار ہوتے ہیں، جسے سفید اور نارنجی وردی میں ملبوس ایک دیو چلا رہا ہے۔

اور ایک عظیم الشان سفید محل میں داخل ہوتے ہیں۔

یہ محل ہز ہائی نس مہاراجا آف ایکس کی رہائش گاہ ہے۔جنھوں نے ازراہِ کرم ہمیں اپنا شاہی آرکسٹرا سنوانے کے لیے مدعو کیا ہے۔

مہاراجا شاید موسیقار قسم کا نوجوان آدمی ہے..........اور اس کی علامت یہ ہے کہ ہر چند اس کا ڈرائنگ روم شاہی تصاویر سے اَٹا ہوا ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں اس کا گرینڈ کنسرٹ سٹین وے بے داغ اور بے پردہ رکھا ہوا ہے۔اس کے علاوہ ہر جگہ، میزوں پر، کرسیوں پر، الماریوں پر، چاندی کے بھاری فریموں میں تصاویر کا ہجوم ہے۔ان تصاویر میں شاہی شخصیات ایک دوسرے کی جانب مشکوک نظروں سے دیکھ رہی ہیں۔

یہاں تک کہ محسوس ہوتا کہ فضا سرگرشیوں سے بھر گئی ہے۔

''میرا تاج تم سے بڑا ہے''۔

''یہ موتی تم نے میری خالہ سے ہتھیائے تھے''۔

''تمھارے سنجاب کی جھالریں ٹوٹی ہوئی ہیں''۔

لیکن سٹین وے اُسی طرح پاکیزہ اور استوار رہتا ہے۔

مہاراجا جب پہلی بار سامعین کے سامنے آیا تو اس نے دس منٹ تک یہ وضاحت کی کہ وہ موسیقی

(۱) صرف یورپ کے لوگ ہی اس طرح محسوس نہیں کرتے۔شہنشاہ اورنگ زیب نے اپنی روح کی گہرائیوں سے ایک مرتبہ کہا تھا ''ہندوستانی موسیقی کو اتنی گہرائی میں دفنا دینا چاہیے کہ اس کی قبر سے نہ اس کی آواز سنائی دے سکے، نہ بازگشت''۔

کے بارے میں جو کچھ نہیں جانتا، وہ قابلِ ذکر نہیں ہے..........نہ صرف یہ کہ وہ کلاسیکی موسیقی کے بارے میں کسی انسائیکلوپیڈیا کی سی معلومات رکھتا تھا بلکہ اُسے موسیقی کے نوادرات سے بھی حیرت انگیز آگاہی تھی۔

بیلینی کے مبہم حصے، کوپرین کے مدھم ٹکڑے اور اس کے ساتھ ساتھ جدید موسیقی کی تفہیم، پُر رغبت اور پُر اثر تھی۔ یہاں تک کہ وہ بنجمن برٹین، مائیکل ٹیٹ اور ایلن راتھورن سے بھی واقف تھا، اور یہ برطانوی عوام کی اکثریت کی معلومات کے لیے کافی سے بھی زیادہ ہے۔

اس بامعنی تنقیدی لوازمے میں صرف ایک خلا تھا۔اُس نے ہندوستانی موسیقی پر بات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب میں نے کہا کہ میں اس کی وجہ سمجھ نہیں سکا تو وہ محض مسکرا دیا۔

''بلاشبہ آدمی کو اس کی سمجھ آنی چاہیے'' میں نے اصرار کیا ''یہ کسی مغربی ذہن کے لیے بالکل ناقابلِ فہم ہے۔کیا خیال ہے؟''

اس پر بھی وہ مسکرا دیا۔

ایک آخری کوشش..........''کیا عالی جناب سمجھتے ہیں کہ..........؟'' لیکن عالی جناب جو بھی سمجھتے تھے..........یا نہیں سمجھتے تھے..........انھوں نے اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور ہاتھ کے اشارے سے موضوع تبدیل کر دیا۔

وہ راز اتنا ہی گہرا رہا جتنا کہ تھا۔ یہ بہت ہی لوبھ بھرا انداز تھا۔ جیسے کوئی مشرقی پہاڑوں سے آنے والی بازگشت کو سُننے کے بعد سکڑ سا جائے۔ وہ بازگشت، جو اپنے معانی آشکار کرنے سے پہلے ہی خاموشی میں گم ہو جاتی ہے۔

۳

مہاراجا سے ملاقات کے چند روز بعد مجھے محل سے ایک کارڈ موصول ہوا، جس پر لکھا تھا کہ اس رات ہندوستانی موسیقی کی ایک محفل برپا کی جا رہی ہے۔ہم اس محفل میں فوراً سے پہلے شرکت کریں گے۔

یہ محفل شاہی ایوانوں سے متصل ایک چھوٹے کمرے میں منعقد ہوئی۔ سامعین، لارڈ چیمبر لین، تقاریب کے مہتمم، پرائیویٹ سیکریٹری اور ایک نامعلوم شخصیت پر مشتمل تھی، جس کی انگلی میں ہیرے کے حجم سے اندازہ ہوتا تھا کہ واقعی کوئی بڑی چیز ہے۔

ہمارے سامنے آرکسٹرا کے تیرہ ارکان آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور اپنی برف جیسی سفید وردیوں میں کافی دلکش نظر آرہے تھے۔

اس آرکسٹرا کی دھنوں کے بارے میں ہمیں ضرور آگاہ کرنا چاہیے تھا کیونکہ تمام فنون کی طرح موسیقی کی بنیاد بھی ردھم ہے، جن ذرائع سے یہ ردھم ترتیب دیا جاتا ہے، وہ بہت سی مختلف آوازیں ہوتی ہیں جو مغربی موسیقی میں تو.......... اپنی اپنی جگہ خوبصورت ہوتی ہیں۔ بانسری کی لے خواہ خصوصیت کے ساتھ کچھ بھی نہ کہہ رہی ہو اپنی جگہ میٹھی ہوتی ہے۔ اس میں پرندوں کی چہکاروں کی سی نغمگی ہوتی ہے۔ تانپورہ کی ایک سادہ دھن، ڈھول کی موزوں دھمک، ٹرادی ویرس کی تار پر (G کی) ایک چھنک، ٹنین وے پر (C کا) ایک عام انداز۔ یہ تمام اپنی اپنی جگہ کانوں کو اچھے لگتے ہیں۔ بلاشبہ یہ سب موسیقی نہیں ہے لیکن مغرب والوں کے لیے، مثلاً ترام کی چنگھاڑ یا کوے کی کائیں کائیں کے مقابلے میں، موسیقی کا نعم البدل ضرور ہے۔

یہ مشاہدات ابتدائی پیچ گمرنا گزیر ہیں۔ کیونکہ یہ بالکل اچانک ہمیں یورپ اور ہندوستان کی موسیقی کے درمیان تفاوت سے دوچار کردیتے ہیں۔ جس معیار کی آوازوں سے ہندوستانی اپنی موسیقی ترتیب دیتے ہیں وہ قطعی معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں، ہمارے معیار کے مطابق ''خوبصورت آواز'' نام کی کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ یہاں کروسو کسی گلی کے بھکاری یا ہڈی فروش سے زیادہ نمبر حاصل نہیں کر سکتا، اس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں موسیقی کا کوئی اُستاد نہیں ہے اور آواز کی تربیت کے کوئی ادارے نہیں ہیں۔ جن چند ہندوستانی گلوکاروں نے کچھ شہرت حاصل کی، انھوں نے اس شہرت کو محض اپنے صوتی غدود سے کسی دُور دراز تعلق کی بنا پر حاصل کیا۔ یا پھر ان کی صورتیں۔ ان کی شخصیت.......... ان کے تبصرہ نگار.......... ان کی پبلسٹی.......... اور بلاشبہ دھرم کے سلسلے میں ان کی شہرت[1].......... اور یہ ایک سادہ لیکن بنیادی نکتہ ہے اور جب تک اس کی مکمل تفہیم نہیں ہوتی۔ ہندوستانی موسیقی لایعنی ہے۔ یہ حقیقت کہ میں مہاراجا کے آرکسٹرا میں شامل سازوں کی تفہیم میں ناکام رہا، درج ذیل بیان سے واضح ہو جائے گی۔

---

(۱) ہندوستانی موسیقی کے سلسلے میں یہ نکتہ ہربرٹ پوپلے، بی اے (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس) نے اُٹھایا ہے۔ جس میں ٹیگور جیسی شخصیت کا ایک فقرہ نقل کیا ہے۔ ٹیگور ایک ہندوستانی عورت کی گائیکی کا، جس کی تربیت انگلینڈ میں ہوئی تھی، ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ''ہندوستان میں گائیکی میں کسی بھی طرح کی نفاست کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آواز اور پیش کش کی دلکشی کے معاملے میں کسی طرح کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی۔ گلوکار اس پر شرمندہ نہیں ہوتے کہ ان کے مدھم اور تیور نُرے، بے سُرے اور غیر فطری ہیں اور ان کے تاثرات دہشت زدہ ہیں۔ یہ اپنی زیادہ تر مہارت کو کلاسیکی روایت کے اُصولوں کے مطابق ڈھالنے کو اپنی روحانی کامیابی سمجھتے ہیں''۔

یہ تحریر محفل موسیقی سے واپسی کے فوراً بعد لکھی گئی۔ آج میں اس میں قدرے ترمیم و اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں.......... ہم اسے اسی طرح رہنے دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہندوستانی موسیقی کا واضح تاثر پیش کرتی ہے۔

مہاراجا کے درباری ساز درج ذیل ہیں:

پانچ عدد ونیا: یہ گنوار قسم کی ایک بدنما چیز ہے۔ سبز وارنش پر نقرئی مینا کاری کے ساتھ آرائش کے لحاظ سے تو قدرے دیدہ زیب ہے۔ ذرا فاصلے پر، تیز ہوا میں بجتے ہوئے شاید یہ کسی جنگلی کے دل کو سکون بخش سکے لیکن یہ قطعاً اس طرح کی چیز نہیں ہے جسے اعصاب زدہ آدمیوں کے قرب و جوار میں بجایا جائے۔

دو عدد طنبورے: یہ بھی ایک ونیا قسم کی شے ہے جو بیٹھنے کے بجائے کھڑے ہیں۔

دو عدد مردنگم: یہ کسی حد تک ڈھول سے ملتے ہیں۔

ایک عدد طبلہ: یہ درحقیقت ایک اور مردنگم ہے، جو کسی حد تک دو ڈھولوں سے مشابہ ہے، جن میں ایک تیز ہے اور دوسرا دھیما۔

ایک عدد بانسری: سلیس طرز کی۔ شیریں و نغم آگیں۔ لیکن صرف اُسی صورت میں قابلِ سماعت جب ایک سو گز کے فاصلے سے سُنی جائے اور آدمی زبان کے اُتار چڑھاؤ سے واقفیت رکھتا ہو۔

دو عدد وائلن: کم از کم یہ وائلن ہی نظر آتے تھے۔ بہرحال دونوں کے ساتھ ہگل لگے ہوئے تھے اور ایک اور واضح فرق تھا۔ .... ان کے تار آنتوں کے ریشے کے بجائے، دھات کے تھے۔

یہ ہیرے کی انگوٹھی والے شخص کا کمال تھا کہ اس نے ان تاروں پر میری توجہ کو بھانپ لیا۔

''آپ ان تاروں پر متعجب ہیں؟'' اس نے بے حد نرمی سے پوچھا۔

''جی ہاں..... ایسا کیوں ہے؟''

اُس نے اپنا ہاتھ اُٹھایا'' ہماری مذہبی روایات.........'' اوراس کی آواز سرگوشی میں ڈوب گئی

''ہمیں آنتوں کے استعمال کی اجازت نہیں دیتیں۔''

سو......... یہ بات تھی۔ وہی پُرانی کہانی ......جس کے ہندوستانی تاریخ میں ہزاروں روپ ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں چربی والے کارتوسوں سے، آج کی قریبی مارکیٹ میں مقدس گائیوں کی قتل و غارت تک ...... حیرت انگیز طور پر یہ سب کچھ، خالص موسیقی کے معاملے سے کافی بعید نظر آتا تھا۔

یہ آلاتِ موسیقی جو اب ہم سے متصادم ہیں۔ تفصیلی طور پر دیکھا جائے تو صرف یہی دستیاب آلات ہندوستانی موسیقاروں کی دسترس میں تھے۔ آپ ان ہی اقسام کی تصاویر سولھویں صدی کے آغاز کے مغل منی ایچرز میں دیکھ سکتے ہیں۔ غالباً یہ ان کی بہترین اقسام ہیں اور کسی طرح کے نازک جذبات کی باقاعدہ تشریح کے دعوے دار نہیں ہیں۔

ایک پروگرام تقسیم کیا گیا۔ پہلا آئٹم تھا۔

''ہندوستانی بھورگا ہی.......... میلا نابا.......... اساوری تری لالا.......... تھیا گا راجا''۔ اس کا ''تری لالا'' حصہ جاندار معلوم ہوتا تھا۔ کون بجائے گا اُسے؟

آرکسٹرا پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا تھا کہ پہلے نمبر پر بیٹھا ہوا طنبورہ نواز مرکزِ توجہ ہے۔ وہ بے حد قدیم آدمی تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے گھنٹوں استراحت فرماتا رہا ہے۔ شاید یہ آدمی ''تری لالا'' بجانے والا ہے۔ وہ واقعی کچھ نہ کچھ ضرور کرنے والا تھا۔ کیونکہ وہ اپنا گلا صاف کر رہا تھا اور اپنے ناخن کتر رہا تھا اور خوفزدہ انداز میں پیچھے کی طرف سرک رہا تھا۔

ایک ملائم آواز نے خاموشی کو توڑ دیا۔

''کیا شروع کروانا چاہیے؟''

''ضرور ضرور''

اُس نے ایک اشارہ کیا اور اچانک ایک کہرام مچ گیا۔

چھوٹے سے کمرے میں پھٹ پڑنے والا شور اس قدر شدید تھا کہ چند لمحوں تک یہ اندازہ لگانا محال تھا کہ یہ آخر کہاں سے آ رہا ہے۔ انسان محض کرسی کے بازو سے چمٹ کر، پلکیں جھپک جھپک کر، افراتفری کے

اس طوفان کا منبع تلاش کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ کان اس بلے گلے کے عادی ہو گئے تو معلوم ہوا کہ اس مصیبت کا بڑا منبع قدیم آدمی کا حلق تھا۔ وہ ''تری لالا'' تھا۔

Tout Ce quily a de pluss Trilala

اور وہ ناقابلِ یقین ذوق و شوق اور جوش و خروش سے مذبح خانے کی تمام آوازیں اُگل رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف شدید خوف سے، جسے چھپانا میرے لیے ناممکن تھا، دیکھا...... آخر اتنی کمزور سی مخلوق بیک وقت باڑے کی تمام آوازیں کیسے نکال سکتی تھی؟ ذبح کیے ہوئے سوّروں، ہنہناتے ہوئے گھوڑوں اور زرزراتی ہوئی لڑکیوں اور بطخوں جیسی آوازیں...... سب کی سب اس کے گرگٹ جیسے گلے سے ایک ہی وقت میں اُبلتی ہوئی...... وہ اس بے سُرے پن کو سر کی مسلسل حرکت اور کندھوں کے مستقل جھٹکوں کے ساتھ جاری رکھے ہوئے تھا اور تمام وقت اس کی انگلیاں تاروں کو سختی سے جکڑے ہوئے تھیں۔ جس طرح وہ انھیں کھینچ کر قبضوں سے اکھیڑ لینا چاہتا ہو۔

یہ شورش جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی، اُسی طرح اچانک رُک گئی۔ قدیم آدمی کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور وہ ہمیں خبیث نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چیمبر لین نے میری طرف مڑ کر دریافت کیا۔

''پسند آیا؟''

''بالکل بالکل''

اُس نے پسندیدگی سے سر ہلایا۔ ''یہ تھیا گا راجا راگ ہے۔ وہ ہمارے ممتاز ترین موسیقاروں میں سے ایک تھا''۔

''کیا وہ.......... کیا وہ انتقال کر چکا ہے؟'' میں نے کوشش کی میرے لہجے سے زیادہ خوش اُمید کا اظہار نہ ہو۔

''ایک صدی پہلے اس کا انتقال ہو گیا تھا''۔

یہ البتہ اطمینان کی بات تھی۔

ان کو یقیناً مزید سوالات کی توقع رہی ہوگی''۔ کیا اس راگ کی کوئی خصوصی اہمیت ہے؟''

''یقیناً'' چیمبر لین نے جواب دیا۔ ''یہ بھگوان رام سے کی گئی ایک پرارتھنا ہے۔ تھیا گا راجا کے تقریباً تمام راگ بھگوان رام سے کی گئی دعائیں ہیں۔ اس راگ میں وہ کہتا ہے ''او رام! میری بنتی سنو......

میرے قریب آؤ۔او رام!" انسان یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر بھگوان رام اس قدیم آدمی کے کچھ اور قریب آئے تو ان کے پردۂ سماعت کو ایسا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا کہ مستقبل میں کی جانے والی کوئی بھی پرارتھنا ان تک نہیں پہنچ سکے گی۔

۴

کنسرٹ جاری رہا اور ہم سیدھے آئٹم "۲" کی افراتفری میں داخل ہو گئے جس کا عنوان تھا، "شری راگھاوندر، گولی یوناتھ رینکا پراون" یہ فوجی بمباری قسم کی ایک شے ثابت ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر مذبح خانے کا شور زیادہ شدومد سے سُننے میں آیا۔ لیکن اس مرتبہ یہ طبلہ نواز کے حلق سے اُمڈ رہا تھا جس کی آواز قدیم آدمی سے بھی زیادہ بھرائی ہوئی اور منتشر ہونے کے باوجود قابلِ رحم حد تک کمزور تھی۔

اس دوران وائلن مسلسل نوٹ.....A بجاتے رہے اور کچھ نہیں بس.A.A.A۔ اس قدر پاگل پن کے ساتھ، جیسے وہ بھول چکے ہیں کہ وہ وائلن ہیں اور خود کو بین سمجھ بیٹھے ہیں......گلوکار نے جو کچھ بھی کیا.....اور اس نے کیا کیا نہیں کیا۔ وائلن A کی ضد پر اڑے رہے۔ میرے اندر ایک ہولناک خواہش پیدا ہوئی کہ چیخ کر کہوں...... "بند کرو یہ بکواس...... تیزA...... دھیماA-B-C۔ کچھ بھی بجاؤ لیکن اسے بدلو"۔ بہر حال کچھ دیر کے بعد، نہیں معلوم کتنی دیر کے بعد، اس میں ڈھول شامل ہو گئے اور اس قدر شدت کے ساتھ کہ جیسے اس سیلاب میں باقی ہر شے کو ڈبو دیں گے۔

ڈھول، وائلن اور مویشیوں کی آوازیں جاری رہیں۔ گھڑی پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ طبلہ نواز کے حلق میں شیطان کو حلول کیے ہوئے، چوتھائی گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا ہے اور اس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ اُسے اس کے اثر سے نکلنے کے لیے ایک طویل عرصہ درکار ہوگا۔

اس کا کوئی تدارک ضرور ہونا چاہیے اور فوراً ہونا چاہیے۔ ورنہ میں کچھ کر گزروں گا۔ میں چیخنے چلانے لگوں گا اور اس کے بعد بین الاقوامی نوعیت کے مسائل پیدا ہو جائیں گے اور شاہی قید خانے اور دیگر ناخوشگوار چیزیں۔ خوش قسمتی سے، اسی لمحے، مجھے ایک خیال سوجھا.........لیکن قبل اس کے کہ اس کی وضاحت ہو، قارئین مجھے ایک اور پہلو کی وضاحت کے لیے معاف کریں۔ لیکن اگر انھیں حسنِ جمال کے فلسفے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو وہ اس تحریر کے اگلے حصے کو چھوڑ کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

۵

پہلے، کچھ اپنے دفاع میں......... گردوپیش کے شوروغوغا سے میری بیزاری محض، اچانک گونج اُٹھنے والے طوفان کا ردِعمل نہیں تھی......... نہ یہ کسی بھی طرح کی خود نمائی یا احساسِ برتری کے سبب تھی۔ بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ یہ اس ناخوشگوار وہم کے زیرِ اثر تھی کہ تمام مصیبت کی جڑ اس موسیقی میں نہیں، بلکہ میرے باطن میں ہے۔

یہ بات ناقابلِ یقین لگتی تھی کہ موسیقی اس قدر بھی وحشت ناک ہو سکتی ہے جس قدر کہ وہ محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا تھا۔ چار سو ملین ہندوستانی آخر سب کے سب غلط تو نہیں ہو سکتے تھے۔

بہر کیف......کئی مغربی نقادوں نے......بہت زیادہ نہیں......بہت ممتاز بھی نہیں۔ لیکن کم از کم کچھ معروف لوگوں نے ہندوستانی موسیقی کے بارے میں کافی ہمدردانہ انداز سے لکھا ہے[1]۔

علاوہ ازیں یہ بات زیادہ اثر رکھتی ہے کہ ہندوستانی عوام......... کسان...... چھابڑی والے...... بازاروں کا ہجوم......... یقینی طور پر موسیقی کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔ وہ ہمیشہ گاتے اور گنگناتے رہتے ہیں......اور اگر یہ موسیقی کوئی ایسی چیز ہے جسے وہ پسند کرتے ہیں تو یقیناً اس میں کوئی بات ہوگی۔

یقیناً میں ہی غلط ہوں!

انکسار کے اس مظاہرے کے بعد، میں اپنے آپ کو موسیقی پر رائے زنی کے لیے کم از کم کسی اوسط درجے کے صحافی کے برابر اہلیت کا حامل سمجھتا ہوں۔ یہ ہمیشہ سے میری پہلی محبت رہی ہے۔ اپنی کاپی بکس کے ضائع کیے جانے سے پیشتر بھی میں اس کی دھنوں کے امتزاج کا کافی شعور رکھتا تھا اور اخبارات تک رسائی سے کافی پہلے اس کا مکمل سکور پڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

میری خواہش ہے کہ کاش میرے لیے صیغہ واحد متکلم کے استعمال سے بچنا ممکن ہوتا۔ لیکن یہ

---

(۱) ان میں سے ایک، پیر لوٹی نے اپنی ڈائری کے پانچویں باب میں کافی مثبت تاثر پیش کیا ہے۔ L' lude ایک ہندوستانی شام موسیقی کے بیان کا طویل کاسنی راستہ ہے۔ بہر حال یقینی طور پر لوٹی موسیقاروں کی تخلیق کردہ آوازوں سے زیادہ ان کی شخصیتوں سے متاثر ہے۔ اس کی زیادہ تر نثر موسیقاروں کے عطر گلاب میں بسے ہوئے لباس......... ڈھول بجانے والے کی حسین آنکھیں...... پنکھے والے کی نحیف اعصاب زدہ انگلیاں...... "اس قسم کی چیزوں کی توصیف میں ہے۔ جب وہ موسیقی کے بیان کی کوشش کرتا ہے تو اسے سوائے ایک قسم کے پردے......... ایک شدید جذباتی نوحے...... کے سوا کچھ نہیں کہتا اور اس طرح ہمیں کچھ زیادہ حاصل نہیں ہوتا۔

معاملہ اس قدر ذاتی ہے کہ اس پر بات کرنے کے لیے دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ شاید قارئین اس کو خود پسندی کے بجائے تحریر کی ضرورت سمجھ سکیں۔

ہم کہاں پر تھے؟.......... او ہاں.......... ہندوستانی موسیقی کے بارے میں غلطی پر.......... اور اس کوشش میں کہ اعتراف کر سکیں کہ یہ غلطی ہمارے اندر ہے...... اس نقطے پر جہاں مندرجہ بالا خیال نے جنم لیا تھا...... میری جیب میں ایک مسودے کے کچھ صفحات تھے، جنھیں میں ہمیشہ اس خیال سے اپنے ساتھ رکھتا تھا تاکہ ہوا میں تیرتی ہوئی کسی بھی دھن کو گرفت میں لے سکوں۔ آخر بابا کار کا بھی کچھ حصہ ضابطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کیوں نہ کی جائے؟ یہ ایک انتہائی درجہ مشکل کام ہوگا لیکن اس کا کوئی متبادل بھی نظر نہیں آتا۔

اور ہو سکتا ہے.......... اس میں کچھ کامیابی بھی ہو جائے جو چیز کانوں کو نامعقول محسوس ہو رہی ہے ممکن ہے اس میں آنکھوں کو کوئی معقولیت نظر آئے۔ چنانچہ اب وہاں ایک بے حد تھکا دینے والا منظر تھا.......... فرش کی طرف مسلسل جھکنے...... موسیقاروں کے درمیان سمٹنے اور نوٹس لینے کا.......... ایک لمحے کے لیے میں ڈھول کی تال پر توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کرتا اور دوسرے ہی لمحے نغمگی کی بام مچھلی کی طرح چکنی، پھسلتی ہوئی لکیر کا تعاقب شروع کر دیتا۔ یہ ایک گرم اور گرد آلود کام تھا مگر لارڈ چیمبر لین اس کی تصدیق کرتا بالکل نظر نہیں آتا تھا۔

نصف گھنٹے کے اختتام پر، خاموشی کا حکم دیا گیا تاکہ مسودے پر لکھے ہوئے نوٹس کو پڑھا جا سکے۔ اب خاموشی طاری تھی اور سوائے سازندوں کی دھونکنی جیسی سانسوں کے، کوئی آواز نہیں تھی۔ چنانچہ پہلی مرتبہ یہ ممکن تھا کہ درپیش معاملات کا واضح طور پر جائزہ لیا جا سکے۔.......... اور مسودے کے مطابق.......... جو کچھ بھی درپیش تھا وہ محض ایک افراتفری تھی.......... ایک جنونی کی بکواس تھی...... جس کا ردھم ایک مایوس کن الجھن میں گڈمڈ تھا.......... اور جہاں تک موسیقی کی لائنوں کا تعلق تھا اگر کوئی نابینا کسی کاغذ پر اندھا دھند نقطے لگاتا تو وہ بھی اتنے ہی نتیجہ خیز اور معلومات افزا ثابت ہوتے...... ایک استثنا کے ساتھ.......... کہ قدیم آدمی جو اس ہنگامے میں قائدانہ کردار ادا کر رہا تھا۔ موسیقی کے جس حصے کو مسلسل چنگھاڑ تا رہا تھا، اس کے مسودے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس پاگل پن کا ایک خاص ضابطہ تھا اور اس کے سُر اس سے کافی حد تک مشابہ تھے۔ گو یہ ایک کریہہ مشابہت تھی، لیکن کم از کم کوئی تو ایسی چیز تھی جو کسی ضابطے کے تحت تھی۔

اگر ہم قدیم آدمی کو الگ کر سکتے؟ ڈھول کی دھمک اور طنبوروں کی زُوں زُوں سے۔ تاکہ وہ اپنے

بے خوف کا تنہا مظاہرہ کر سکتا؟.......... تو شاید یہ خطرناک تو ہوتا لیکن اس کے نتیجے میں ہم پر کچھ منکشف ہو سکتا۔ چنانچہ درخواست کی گئی.......... "کیا یہ محترم کچھ اور عنایت کریں گے؟"

قدیم آدمی کی آنکھیں چمک اُٹھیں...... اس نے ایک وحشیانہ سرخوشی سے اپنا منہ کھولا۔ "فقط ایک آدھ دھن".......... میں نے جلدی سے اضافہ کیا...... "ابھی جو کچھ گایا گیا اس کی ابتدائی سطریں......"۔

چیمبر لین نے اثبات میں سر ہلایا.......... قدیم آدمی نے تھوک نگلا اور گانا شروع کیا...... اب ان نوٹس کو کسی قدر صحت کے ساتھ سمجھنا ممکن تھا.......... یہ ایک آوارہ، منتشر فریاد تھی۔ پانچ.......... آٹھ کے چیتھڑوں میں ملبوس.......... میں نے اپنا ہاتھ اُٹھایا.......... قدیم آدمی نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ خاموشی اختیار کر لی۔

"اب اگر زیادہ زحمت نہ ہو تو کیا یہ دوبارہ اسے گا سکتے ہیں؟"

"یہی راگ؟"

"اگر ممکن ہو تو.........."

"بالکل یہی؟" "آپ کچھ اور سُننا پسند نہیں کریں گے؟"

"میں چاہتا ہوں کہ یہ اسے بالکل اسی طرح گائیں جیسے کہ پہلے گا چکے ہیں"۔

یہ درخواست قدیم آدمی کے سامنے پیش کی گئی.......... اس نے سر ہلایا اور دوبارہ گانا شروع کیا.......... اور اب.......... میں نے اچھی طرح غور سے سُنا.......... اس کی گائیگی میں بہت زیادہ فرق تھا.......... درست.......... یہ زیادہ تر، پانچ.......... آٹھ میں تھی مگر تین دُھنیں، دو.......... چار میں تھیں۔ جن کی وجہ فہم سے باہر تھی۔ اس کے علاوہ ہر لَے کے درمیان ایک اُتار آتا تھا، جس کے ابتدا میں کہیں آثار نہیں تھے۔

ایک مرتبہ پھر میں نے ہاتھ اُٹھایا اور ایک مرتبہ پھر خاموشی طاری ہو گئی.......... "کیا یہ بالکل وہی تھی جو پہلی مرتبہ گایا گیا تھا؟"

"بالکل وہی.......... کیا آپ نے اسے سُنا نہیں تھا؟"

او...... ہاں...... میں نے اُسے سنا تھا، اور میں نے اس کے علاوہ بھی کچھ سُنا تھا۔ میں نے ہندوستانی موسیقی میں نہاں راز کو سُنا تھا۔

۶

جو قاری اس فلسفۂ جمال سے اُکتا گیا ہے۔ ضرور اس سے دوبارہ جان چھڑانا چاہتا ہوگا۔ اگرچہ میں چاہتا ہوں کہ وہ اُسے برداشت کرنے کی کوشش کرے اور اس کا مطالعہ جاری رکھے۔ کیا وجہ ہے کہ فنون لطیفہ کا نقاد، جاسوسی کہانیوں کے مصنف جتنا دلچسپ نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ کسی فنکارانہ جرم کا سراغ لگا رہے ہیں تو نشانات اتنے ہی مبہم ہوں گے .... ولن اتنا ہی پاجی ہوگا اور ہیروئن ویسی ہی معصوم حسینہ ہوگی۔

ایڈگر ایلن پو کی بہترین جاسوسی کہانی ایک ادبی مقالہ تھا جس کا عنوان تھا ''شعر کی منطقی بنیاد'' اس میں بیان کیا گیا تھا کہ اسے "Theraven" (پہاڑی کوّا) لکھنے پر کس چیز نے آمادہ کیا اور جس انداز سے اُس نے اس عجیب وغریب پرندے کو اس کے دائمی ٹھکانے تک پہنچایا وہ انداز سانس روک دینے کی حد تک دلچسپ ہے۔ اگرچہ اس کے کُل آلات دوزُکنی، تین رُکنی اوزان، شعریت اور ٹیپ کے بند پر مشتمل تھے۔

سو اگر ہم اپنی حقیری دریافت کو اس راز کے سراغ کے طور پر لیں تو اس قدیم آدمی کے راگ کی دوسری گائیکی پہلی سے بالکل مختلف تھی۔ حالانکہ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ بالکل ویسی ہے۔ یہ تضاد ہمیں کس طرف لے کر جا رہا ہے؟

یہ ہمیں لے جا رہا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، سیدھا اُس راز کے قلب تک۔ اور وہ راز نہاں ہے لفظ ''فی البدیہہ'' میں۔ قدیم آدمی گائیکی میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس تقسیم کی تشریح نہیں کر رہا تھا، جسے موسیقار نے اپنے وقت میں طے کیا اور گایا۔ وہ اسے بے سوچے سمجھے الاپ رہا تھا اور اسی طرح باقی سب بھی۔ موسیقی کے یہ سب مظاہرین اپنی اپنی جگہ موسیقار تھے اور اگر اس میں کوئی الجھن محسوس ہوتی ہے تو ہمیں اس کے متبادلات کی مدد سے اسے سلجھانے دیجیے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے، جیسے اداکاروں کے ایک گروپ کو 'ہیملٹ' کا عمومی تھیم دیا جائے۔ ان کے کردار بتا دیے جائیں، کچھ نمائندہ مکالمے دیے جائیں اور کہا جائے کہ اپنا اپنا کام شروع کریں۔ نتیجے کا تصور آسانی کیا جا سکتا ہے۔ ہیملٹ کو کچھ اس انداز سے پیش کیا جائے گا۔

ہیملٹ: ٹوبی اور ناٹ ٹوبی، دیٹ از دی کوئیچن .... دیٹ از دی کوئیچن .... ٹوبی، ٹوبی، ٹوبی؟ ناٹ ٹوبی؟ ناٹ ٹوبی؟ ناٹ ٹوبی؟

(اوفیلیا داخل ہوتی ہے)

اوفیلیا: ہیر آر پینسیز (Pansies)، دے آر فار تھاٹس، پینسیز، پینسیز، دے آر فار تھاٹس (Thoughts)......

ہیملٹ: ویدر، ایہہ، ویدر، اٹس نوبلر ان دی مائنڈ، دی مائنڈ، دی مائنڈ، ٹو سفر۔

اوفیلیا: پینسیز، پینسیز، پینسیز .... "

ہمیں اس حماقت کو طویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر مقصد واضح ہوتا ہے تو اتنا ہی کافی ہے۔ ہندوستانی موسیقی ''فی البدیہہ'' ہے اور درحقیقت یہ کہنا کافی مشکل ہے کہ اسے کس طرح ایک سنجیدہ فن کا درجہ دیا جا سکتا ہے[1]۔ کچھ غیر معمولی حقائق پر غور کیجیے جو ہمیں اس راز کی گہرائی تک لے جاتے ہیں۔ یہاں کی ایسی چیز کا ایک ٹکڑا تک نہیں ہے، جسے ہندوستانی موسیقی کا نام دیا جا سکے.......... ایک ٹکڑا.......... جسے اُٹھا کر کوئی فنکار، ملک کے کسی بھی حصے میں، کسی بھی وقت گا سکے۔

آپ کسی دکان پر جا کر یہ مطالبہ نہیں کر سکتے کہ مجھے فلاں کا گیت فلاں کی موسیقی میں چاہیے۔ اس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی موسیقی شائع نہیں کی جاتی۔

سوائے چند مواقع کے جب اسے مختلف اقسام کے علاقائی خطِ تصویر میں لکھا گیا ہے جو سوائے موسیقی سے متعلق لوگوں کے، باقی سب کے لیے بے معنی ہے۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ کسی ایک موسیقار کے پاس جائیں اور ایک آدھ روایتی تھیم سیکھیں (جو عام طور پر اس قدر دقیانوسی اور مبہم ہوتے ہیں کہ انھیں بمشکل ہی تھیم کہا جا سکتا ہے) اور جب آپ انھیں سیکھ لیتے ہیں تو اپنی مرضی کے مطابق فی البدیہہ گا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ انھیں عام فائدے کے لیے تحریر نہیں کر سکتے۔

اس بنیادی حقیقت کا ادراک چکرا دینے والا ہے۔ ہندوستانی موزارٹ کون ہے؟ ایسا کوئی شخص نہیں ہے!

کون اس کی تفہیم کو آسان بنائے گا.......... کیا ہندوستانی مسٹراس؟

---

(۱) اس سلسلے میں دو ایک اہم استثنائی مثالیں ہیں۔ خصوصاً سنگت ناچ (ballet) کی موسیقی میں جس میں رقاصوں کی مخصوص حرکات کا تقاضا ہے کہ وہ سازوں کے پابند رہیں۔ سنگت ناچ میں ہندوستانی موسیقی کے اصول طے شدہ ہیں۔ لیکن چونکہ سنگت ناچ ہندوستانی موسیقی کے فقط ایک فی صد حصے کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے اس کی موجودگی سے ہماری عمومی رائے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

آپ کی تلاش رائیگاں ہے![1]

اگر آپ بہت خوش قسمت ہیں تو شاید اتفاق سے کسی موسیقار کا نام سُن لیں اور ایک مختصر لمحے کے لیے یہ سمجھ لیں کہ بالآخر ایک صحیح آدمی تک پہنچ گئے ہیں۔ ایک گوشت پوست کا بنا ہوا فنکار۔ جس کے کام کو جمع کر کے اس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

(۱) شاید یہ کہا جائے کہ ہندوستانی موسیقی کو یورپ کی کسوٹی پر پرکھنا زیادتی ہے۔ بہت بہتر...... اسے اس قوم کی کسوٹی پر پرکھیے جو ہندوستانیوں کے نزدیک کمتر قوم ہے۔ .... نیگرو۔ افریقیوں کی روحانی موسیقی کے مقابلے میں ہندوستانی موسیقی میں کچھ نہیں ہے۔ جن کی موسیقی کو وقت نے ایک حُسن اور استقلال کی صورت میں ترتیب دیا ہے۔ یہ ہزاروں برس تک انسان کے دل کو متاثر کرتی رہے گی۔ لیکن وقت نے ہندوستانی موسیقی پر یہ احسان نہیں کیا۔ چنانچہ یہ ہمیشہ اسی طرح سیال، بے شکل اور سرگرداں رہی ہے۔

ساتواں باب

آیورویدک دوائیں

(احمقانہ پرستش)

آیئے اب ذرا نیچے زمین پر چلتے ہیں۔

ہمارے سفر کا دوسرا مرحلہ تقریباً مکمل ہو گیا ہے۔ یہ سفر زیادہ تر ریگستان میں ہوا ہے۔ لیکن اگر ہم نے غور سے دیکھا ہوتا تو ہمارا دھیان ضرور اس عجیب و غریب خس و خاشاک کی طرف بھی جاتا جو بنجر علاقے میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ یہ ہندو قوم پرستی کی پیداوار ہے۔ یہ چیزیں ہندوستان کی مٹی سے وابستہ ہیں لیکن آزادی کا سورج طلوع ہونے کے بعد ہی انھوں نے مٹی سے اپنا سر اُبھارا ہے، پھلنے پھولنے لگی ہیں اور اپنے حقیقی رنگ و روپ کا اعلان کرنے لگی ہیں۔ یہ عالمی امور کے طالب علموں کے لیے نہایت دلچسپی کا باعث ہیں کیونکہ یہ دوسرے ممالک میں پائے جانے والے معاشرتی پھولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ آیئے ذرا ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم اپنے کام کا آغاز ان میں سے سب سے زیادہ عجیب و غریب جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں جن کو آیوروید کا نام دیا جاتا ہے۔

اگر کسی عام برطانوی یا امریکی شہری کو بتایا جائے کہ آتشک کا علاج صرف چائے کے ایک کپ سے ہو سکتا ہے، تو وہ یقین نہیں کرے گا کیونکہ جدید شہری تعلیم نے اسے بتایا ہے کہ جنسی امراض کا علاج اتنا سادہ نہیں ہوتا جتنا نزلہ زکام کا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ آتشک، کم از کم ابتدائی دو مرحلوں میں قابلِ علاج ہے لیکن اس کے لیے بھی ماہرانہ اور خصوصی علاج کی ضرورت ہوتی ہے اور مہینوں تک انجکشن لگوانے پڑتے ہیں اور اگر اس سے کہا جائے کہ چائے کے اسی کپ سے ٹی بی کا علاج بھی ہو جاتا ہے تو اس کی بے یقینی غصے میں تبدیل ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگرچہ میڈیکل سائنس روز بروز ترقی کر رہا ہے، لیکن یہ ترقی کی نہیں جادو ٹونے کی مثال ہے۔ اگر ہم اسے یہ کہیں کہ ہاضمے کی خرابی بلکہ ملیریا، سوزاک، سر کا بخار، امراض قلب، کالی کھانسی وغیرہ وغیرہ سب امراض کا علاج چائے کے اسی کپ سے ممکن ہے، تو وہ یقیناً چائے کا وہ کپ اس کے موجد کے منہ پر دے مارے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جو شخص اس طرح کے دعوے کر رہا ہے، وہ سوسائٹی کا دشمن ہے،

خواہ وہ خود اس دعوے پر یقین ہی کیوں نہ کرتا ہو۔

اس وقت جبکہ میں یہ لکھ رہا ہوں، چائے کا یہ کپ، بلکہ اس کا ایک چھوٹا ڈبا میرے سامنے رکھا ہوا ہے۔ یہ ابھی ابھی خوراک کا تجزیہ کرنے والوں کے پاس سے واپس آیا ہے۔ ان کے مطابق یہ بالکل بے ضرر ہے اور جن بیماریوں کے علاج کے لیے اس کی سفارش کی جاتی ہے، ان میں سے کسی ایک کا بھی علاج نہیں کر سکتا۔ اس چائے کی بنیاد ایک جڑی بوٹی ہے جو جنوبی افریقہ کے "مانے" سے ملتی جلتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں پودینہ، الائچی، لونگ اور چند عام پھولوں کی پتیاں شامل ہیں۔ اس میں ہوسکتا ہے کہ ہاضمے کو ٹھیک کرنے کی کچھ خصوصیات پائی جاتی ہوں لیکن اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

اگر میں نے کسی مشکوک شہرت کے کیسٹ کی دوکان سے یہ چائے خریدی ہوتی اور میں یہ کہتا کہ میں اس دکاندار کو جھوٹے دعوے کرنے والی دوائیں بیچنے کے الزام میں جیل بھجواؤں گا، تو اس ساری کہانی کا لطف ختم ہوجاتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ چائے میرے پاس اس طرح آئی بلکہ مجھے آیورویدک برادری کے عظیم رکن، ایک نہایت باعزت فرد نے، جو اس کی طلسماتی طاقتوں پر پختہ یقین رکھتا تھا، بڑے تپاک سے پیش کی تھی۔

سو یہ ہے اس چائے کی کہانی، اچھی ہے یا بُری اس کا فیصلہ آپ خود کریں گے اور اگر ہم مندرجہ ذیل حقائق سامنے رکھیں تو یہ داستان مزید اچھی یا بُری ہوسکتی ہے۔

اوّل یہ کہ چائے کا یہ کپ آیورویدک جس میں ستارہ شناسی، جادوٹونا، مذہب اور مغربی طریق علاج سے صدیوں قبل علاج کے قدیم رازوں کو ازسرنو دریافت کرنے کے بلند بانگ دعوے شامل ہیں، کے معالجوں کی احمقانہ پرستش کی ایک بین مثال ہے۔

دوم یہ ہے کہ آج کل یہ چائے بڑی مقدار میں استعمال ہورہی ہے اور اس کے خریداروں میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ آیورویدک طریق علاج جدید ہندوستان میں جنگل کی آگ کی مانند پھیل رہا ہے۔ نئے ہسپتال جس قدر تیزی سے ممکن ہو قائم کیے جارہے ہیں جن میں ہرروز ہزاروں طالب علم داخلہ لے رہے ہیں۔ ہندوستان کے کئی علاقوں میں تو آیورویدک ڈاکٹروں کی تعداد ایلوپیتھک یا مغربی طریق علاج کے ڈاکٹروں کی نسبت بیس فی صد سے تیس فی صد زیادہ ہے۔

سوم یہ ہے کہ عطائیت میں اس بے پناہ اضافے کا باعث صرف ہندوستانیوں کا قوم پرستی کا جذبہ ہے۔ انھوں نے طریق علاج کو بھی سودیشی (اپنے وطن کی بنی ہوئی چیزیں استعمال کرنا) میں شامل کرلیا ہے۔ ایک ہندوستانی سمجھتا ہے کہ آیورویدا، کچھ بھی ہو، برطانوی نہیں ہے خالصتاً ہندوستانی ہے لہٰذا اس کی حمایت کرنی چاہیے۔ ہندوستانی ذہن میں جادو کی جانب یہ جھکاؤ سائنس میں بھی نظر آرہا ہے اور اگر ہم اس کا پرچار کرنے والوں پر دھوکا دہی کا الزام عائد کریں تو کچھ غلط نہیں ہوگا کیونکہ ان میں سے کم از کم چند کو تو یہ معلوم ہوگا کہ آیورویدک نظام علاج کے دعوے بے بنیاد ہیں۔ اس کے علاوہ خود ان کو اگر ہلکے سے سردرد سے بڑھ کر کوئی بیماری ہوجائے تو وہ فوراً کسی "مغربی[1]" ڈاکٹر سے مشورہ کرنے میں ذرا سا تامل نہیں کرتے۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ وہ اپنے اعتقاد کی اس کمی کو مشتہر نہیں کرتے کیونکہ یہ ان کی تجارت کے لیے نقصان دہ ہے لیکن وہ ملک کے لاکھوں کروڑوں ناواقف لوگوں کو ایسی دوائیں دیتے رہتے ہیں جو قطعاً بے اثر ہوتی ہیں۔

۲

یہاں آیورویدا کے اُصولوں کو تفصیل سے بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے لیے تو کئی جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔ اس "سائنس" (اگر اسے سائنس کہنے سے اس کی شان میں اضافہ ممکن ہو) کا متن قدیم ویدوں میں پایا جاتا ہے جو سنسکرت میں ہیں، جس پر دو ہزار سال سے زیادہ عرصے تک برہمنوں کی اجارہ داری رہی ہے اور برہمن ابتدائے تاریخ سے لے کر اب تک دنیا کے سب سے زیادہ قدامت پرست لوگ ہیں۔ لہٰذا یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ آیورویدا نے خالص تحقیقی خطوط پر ترقی نہیں کی۔ البتہ صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں باہر سے توہمات کا ملبہ شامل ہوتا گیا جس کا اصل ویدوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس میں ستارہ شناسی کی فضول باتیں بڑی تعداد میں شامل ہوگئی ہیں۔ اس نے دو قدیم معالجوں کو، جن کے نام چراکا (Charaka) اور سسروتا (Susruta) تھے، اپنی وضاحت کا اختیار بھی دے

(۱) اس کی ایک کلاسیکی مثال خود گاندھی نے فراہم کی ہے۔ گاندھی نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ یورپین ڈاکٹروں کی مخالفت کی اور ان کے ہسپتالوں کو گناہ پھیلانے والے ادارے قرار دیا لیکن خود انھیں جب اپنڈی سائٹس کی شکایت ہوئی تو ایک انگریز سرجن سے آپریشن کرایا اور اپنے آیورویدک معالجوں کو نظرانداز کردیا۔

دیا۔ان دونوں کی کتابوں کا عربی میں الرازی نے ترجمہ کیا اور آج کل ان کتابوں کو میڈیکل لٹریچر میں آثار قدیمہ کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر وہ چیز جس پر ایک بھولا بھالا کسان یقین کر سکتا تھا، آیورویدا میں شامل کر لی گئی۔اس طرح آیورویدا کسی چڑیل کی ہانڈی بن گئی اور اس میں اُبالے جانے والے مشروب میں مذہب کے ذائقہ کے ساتھ کالے جادو، جنوں اور پریوں کی مقامی کہانیوں کا چٹخارہ بھی شامل ہو گیا۔ یہی نہیں مغربی ڈاکٹروں کی چند سنی سنائی، ادھر اُدھر کی باتیں بھی اس میں شامل ہو گئیں۔لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یہ مشروب زیادہ تر زہریلا اور مغربی خیالات کے مطابق کلیتاً فریب اور دھوکے پر مبنی ہے۔

یہ ہے وہ طریق علاج جو قوم پرستی کے نام پر نسلِ انسانی کے پانچویں حصے، کی صحت کی ضمانت فراہم کرنے کی طرف تیزی سے گامزن ہے۔

۳

آیورویدا کی حقیقت معلوم کرنے کا مختصر طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اس میں کیا چیزیں نہیں ہیں۔ کیونکہ جو کام کرنے کی یہ کوشش ہی نہیں کرتا وہ ان کاموں سے زیادہ اہم ہیں جو یہ کرتا ہے جو کام آیورویدا نہیں کرتا ان کی چند روشن مثالیں یہ ہیں:

۱۔ آیورویدا میں خردبین کے استعمال کو نفرت سے دیکھا جاتا ہے اور یہ علم جراثیم کو بالکل نظرانداز کرتا ہے۔لہٰذا آیورویدا میں تشخیص مرض محض قیاس آرائی پر مبنی ہوتی ہے۔

۲۔ یہ جراحی (سرجری) کو یکسر مسترد کرتا ہے اور سرطان کے مریض کا علاج بھی گولیوں سے کرتا ہے۔

۳۔ اس کو انجکشن کا، خواہ وہ انٹرامسکلر (Intramuscular) ہوں یا انٹراوینس (Intravenous) علم ہی نہیں ہے۔آیورویدا میں آتشک کے مریضوں کو زبردستی کچا سنکھیا کھانا پڑتا ہے، جس سے ان کے لمبوترے جراثیم (Spirochete) تو بہت خوش ہوتے ہیں لیکن جگر چھلنی ہو جاتا ہے۔

۴۔ آیورویدا میں صرف سادہ سی بدبو دور کرنے کے سوا کوئی جراثیم کش دوا نہیں ہے۔ یہ ہیضے کو پھیلنے سے روکنے کے لیے دروازے پر پھولوں کا ایک گچھا ٹانگنے پر اکتفا کرتا ہے۔

۵۔ آپ کو یہ بتانے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ آیورویدا کو بے ہوش یا سُن کرنے والی دواؤں کا قطعاً علم ہی نہیں ہے اور جس وقت انھیں درد میں افاقہ کرنے کے لیے کسی دوا کی ضرورت پیش آتی ہے تو یہ کچی افیون پر انحصار کرتا ہے۔

۶۔ یہ بے شمار ایسی دواؤں کو دیدہ و دانستہ مسترد کرتا ہے جو مغربی نظام علاج میں اپنی افادیت تسلیم کرا چکی ہیں اور مسترد بھی، اس علاج کے حق میں کرتا ہے جس کی افادیت کو خوش خیالی سے زیادہ درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ آیوروید انمونیا کے مریضوں کے لیے برطانوی دوا سلفونامائیڈ (Sulphonamide) یا ذیابیطس کے مریضوں کے لیے کینیڈا کی دوا انسولین (Insulin) استعمال کرنے کی بجائے مریض کی موت گوارا کرتا ہے۔

آیورویدا میں جن چیزوں کا فقدان ہے، ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن میرے خیال میں عام قاری کے لیے یہ چند فقرے کافی ہوں گے۔

تاہم آیورویدا کے ساتھ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم اس بات کا اعتراف کر لیں کہ جس طرح مغربی افریقہ کے ''وچ ڈاکٹروں'' (جادو ٹونے سے علاج کرنے والے معالج) نے بعض ایسی جڑی بوٹیاں دریافت کر لی ہیں جو مقامی بخار جیسے امراض کا علاج کر سکتی ہیں۔اسی طرح آیورویدا نے بھی صدیوں میں بعض عام بیماریوں کے لیے سادہ سے علاج دریافت کر لیے ہیں اور اس کام میں اُس کے ناکام ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ قبض کا علاج کر سکتے ہیں، ملیریا کے بخار کو وقتی طور پر کم کر سکتے ہیں۔اس کے پاس طاقت کی بعض اچھی دوائیں ہیں۔ زکام کا بہت اچھا علاج موجود ہے اور پیچش کے لیے ایک خفیہ نسخہ ہے جو اکثر بہت کامیاب ثابت ہوتا ہے۔دو چیزوں میں تو آیورویدک ڈاکٹروں نے پہل کی تھی اور مغربی طب کو پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے ٹی بی کے علاج میں سونے کا استعمال کیا تھا۔اسی طرح انھوں نے کوڑھ کے علاج کے لیے ایک تیل تیار کیا تھا، جس کا نام مجھے یاد نہیں آ رہا۔انھوں نے یہ ایجادات صدیوں پہلے کر لی تھیں اور اگر وہ ان پر مغربی تحقیق کے خطوط پر کام کرتے تو دنیا بہت سی تکلیفوں سے بچ سکتی تھی۔لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا آیورویدا عام نہیں، بلکہ برہمنوں کی خفیہ اجارہ داری تھی اور انھیں یہ وہم تھا کہ اگر طریق علاج کو عام کر دیا گیا تو اس کی ساری خوبیاں ختم ہو جائیں گی۔ (یا یہ کہ عام ہونے کی صورت میں ہماری آمدن ختم ہو جائے گی)۔لہٰذا انھوں نے ہمیشہ دواؤں کی بوتلوں کو سربہ مہر، اپنی جڑی بوٹیوں کو مقفل، اور اپنی مقدس کتابوں پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی۔ہندوستانی طب میں وقت آگے بڑھنے کی بجائے وہیں رُکا رہا۔

ہم نے آیورویدا کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کو مختصراً لیکن صحیح طور پر بیان کر دیے ہیں لیکن ہم نے اس ''سائنس'' کی ایک شاخ کو فراموش کر دیا، جس میں اس نے خصوصیت سے ترقی کی ہے۔ یہ کوئی اتنی

باعزت شاخ نہیں ہے لیکن آیورویدا میں اس کا کردار اس قدر نمایاں ہے کہ اس کا ذکر لازمی ہے۔

۴

شہوت انگیز ادویات تیار کرنے کے میدان میں آیورویدا کی بلاشرکت غیرے حکمرانی ہے۔

اس وقت میری میز پر آیورویدک دوائیں فروخت کرنے والی ہزاروں فرموں میں سے ایک کا کیٹلاگ پڑا ہوا ہے۔ ایسے ادارے بے شمار ہیں، اور ڈاک کے ذریعے ہزاروں کا کاروبار کرتے ہیں۔ ان کو موصول ہونے والے تعریفی خطوط کی طویل فہرست اس بات کی ثبوت ہے کہ ایک عام ہندوستانی، ڈاکٹری میں بھی، مذہب اور جادو کی جانب جھکاؤ کو نہ صرف پسند کرتا ہے بلکہ ان دواؤں کا مطالبہ کرتا ہے اور ان کے لیے پیسے خرچ کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

تاہم جنسی بھوک بڑھانے کے اس دعوے میں نہ تو کوئی بات صوفیانہ یا طلسماتی ہے اور نہ ہی غالباً یہ دعوے بعید از قیاس ہیں۔

ایک مرہم کے بارے میں لکھا ہے کہ ''اس کا استعمال نوجوانوں میں گھوڑوں جیسی طاقت پیدا کر دیتا ہے۔'' اس طرح گھوڑوں کی خصوصیات حاصل کرنے کے تصور سے مغربی باشندے حیران و پریشان ہو جاتے ہیں لیکن ایک ہندو نہیں۔

ایک شربت کے بارے میں تحریر ہے کہ ''اس سے آپ کی خواہش کا فوارہ اس طرح پھوٹنے لگتا ہے جس طرح کھلے آسمان میں روشن سورج طلوع ہوتا ہے'' اور اگر ایک ڈالر کے عوض یہ کافی نہیں ہے تو اس شربت کے بارے میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ''اس کے استعمال سے آپ کے دماغ کو ٹھنڈک ملے گی (ان بظاہر متضاد خصوصیات کا یکجا ہونا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے)۔

ایک سفوف ہے جس کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ ''ہم بلاخوف کہہ سکتے ہیں کہ یہ خون کو بلو کر مکھن نکال دیتا ہے۔'' یقیناً ''بلاخوف'' کا لفظ ٹھیک ہی استعمال ہوا ہے۔ ایک اور سفوف بہت بوڑھے مردوں کے لیے ہے جو ان کی ''کمزوریوں کو اس طرح بھگا دے گا جس طرح مشرق کے اُفق پر طلوع آفتاب کے ساتھ ہی اندھیرے بھاگ جاتے ہیں۔'' جب میں سوچتا ہوں تو میرے ذہن میں ان بوڑھے لوگوں کی طاقت کی جو تصویر اُبھرتی ہے وہ کچھ دلکش نہیں ہوتی۔

''موج میلے میں آپ کی امداد کے لیے'' کے عنوان کے تحت خون کی حرارت بڑھانے والے

مرکبات کے ناموں کا ایک سیلاب ہے جو لوگ یہ مرکبات استعمال کرتے ہوں گے ان کا حشر کیا ہوتا ہوگا، اس خیال سے ہی دل لرز جاتا ہے۔ ایک مرکب کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اس کا استعمال ناکارہ سے ناکارہ فرد میں ''نفسانی خواہشات'' بجلی کے کوندے کی طرح بیدار ہو جاتی ہیں۔ اس کو پڑھ کر ہر شخص سوچے گا کہ اس مرکب کو استعمال کرنے والا جلد یا بدیر تھانے پہنچ جائے گا۔ لیکن اسی مرکب کے بارے میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ''اس سے زندگی کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر بہت بلند ہو جاتا ہے'' ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس شخص کے بارے میں مجسٹریٹ کا فیصلہ اس قدر خوف ناک تو نہیں ہوگا۔

میں نے ان باتوں کا تذکرہ محض آپ کی تفریحِ طبع کے لیے نہیں کیا بلکہ ان کی گہری اہمیت کے پیش نظر کیا ہے۔ ہندوستان میں جہاں اس برعظیم کے وسیع علاقوں پر موت کا سایہ منڈلا رہا ہے، جہاں ہزاروں صنعتیں آہستہ آہستہ دم توڑ چکی ہیں، وہیں شہوت انگیز دواؤں کی تجارت میں سال بہ سال اضافہ ہو رہا ہے اور قومی آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ ان دواؤں کی خریداری پر خرچ ہو رہا ہے۔

یہ خیال نہایت پریشان کن ہے، ایسا لگتا ہے جیسے گلے میں پڑا ہوا پھندا تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

۵

بیسویں صدی کے وسط میں ہزاروں ڈاکٹر جو بظاہر عزت دار لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک ایسا طریق علاج استعمال کر رہے ہیں جو جادو ٹونے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اس صورت حال کے امکانات اتنے زیادہ غیر معمولی ہیں کہ میں نے آیورویدک ہسپتالوں، ڈسپنسریوں اور اس کی تعلیم دینے والے اداروں کا مطالعہ کرنے کے لیے موقع ملتے ہی ان کا دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے تمام انسانی اداروں کی طرح اُن کو بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف پایا۔ ان میں سے چند خاص طور پر حیدرآباد کے ادارے، واقعی تعریف کے قابل تھے، کیونکہ وہ آیورویدا کی اندھی تقلید کرنے کی بجائے اتنی دیانت داری کا مظاہرہ کرتے تھے کہ انھوں نے آیورویدا کے ساتھ مغرب سے لیے ہوئے سبق بھی اپنے نصاب میں شامل کر رکھے تھے۔ لیکن عام طور پر ان اداروں کی حالت نہایت خوفناک تھی۔ انہی متوسط اداروں کے دوروں سے میں نے ایک آیورویدک ادارے کے دورے کی یہ تصویر تیار کی ہے۔

ابھی ہم ادارے کے صحن میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو اس ادارے کے اصلی روپ کی غمازی کر رہا تھا۔ ادارے کا ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور زمین پر لیٹ کر اس ڈاکٹر کے پیروں کو (جن

میں اس ڈاکٹر نے کھڑاویں پہن رکھی تھیں) دیوانہ وار چھونے لگا، جو ہمیں ادارے کے مختلف حصے دکھا رہا تھا۔ (یہ ہندوستانیوں کا من بھاتا طریقہ ہے جس سے وہ دوسرے شخص کے لیے عزت اور اپنے انکسار کو ظاہر کرتے ہیں۔ نچلی جاتوں کے بہت سے لوگ تو کسی ہندوستانی پولیس والے سے کسی جگہ کا پتہ پوچھنے سے قبل اسی طرح اس کے سامنے زمین پر لیٹ جاتے ہیں)۔ چند منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ وہی ملازم ڈسپنسری میں دواؤں کے مرکب تیار کر رہا تھا۔ ہم سوچتے ہیں کہ کیا اس نے اتنی دیر میں ہاتھ دھو لیے ہوں گے۔ لیکن اس کے ہاتھوں پر ایک نظر ڈال کر ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نے ہاتھ نہیں دھوئے۔

لیکن اس ذرا سی بات پر نازک مزاجی کا مظاہرہ کرنا ہی بے وقوفی ہے۔ کیا آیوروید ا کی کتابوں میں یہ درج نہیں ہے کہ "جب ہم آریائی سادھوؤں کی طبی ثقافت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم خوشی میں خود کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ہم اس بات پر فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہم ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں جس کی زمین ان کے پیروں کی دھول سے پوتر (پاک) ہو گئی ہے۔"

اس ادارے میں پیروں کی دھول بہت ہوگی۔ یہی نہیں دوسری مٹی بھی بہت ہوگی تاہم یہ بات جواب طلب ضرور ہے کہ اس مٹی سے کوئی چیز پاک ہو سکتی ہے۔ فی الحال تو یہاں مٹی کی بہتات، آیوروید ا کی مقبولیت کو خراجِ تحسین پیش کر رہی ہے۔

دروازے پر پروفیسر نخبر کران بے شمار مریضوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ڈاکٹروں کی میزوں کے گرد جمع ہیں اور کہتا ہے "یہ سب کچھ سودیشی کے نتائج میں سے ایک ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ہم آزادی کی جانب گامزن ہیں۔" جس وقت پروفیسر نے سودیشی کا لفظ کہا تو اس کی آواز بالکل کسی مذہبی دیوانے کی مانند سنائی دے رہی تھی۔

جب ہم ان بے چارے مریضوں کے سوجے اور داغ دار چہروں کی طرف دیکھتے ہیں تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ لوگ آزادی کے علاوہ کئی دوسری چیزوں کی طرف بھی گامزن ہیں۔ یہاں چھوت کے امراض میں مبتلا مریضوں کو دوسرے مریضوں سے الگ رکھنے کی کوئی کوشش بھی نظر نہیں آتی۔ ہمارے سامنے پانچ چھ نوجوانوں کے ننگے شانوں اور سینے پر زخم نظر آ رہے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ آتشک کے دوسرے مرحلے میں پہنچ چکے ہیں۔ ان بدقسمت لوگوں کو علاج کے طور پر چائے کا ایک کپ پلایا جائے گا یا انھیں چٹکی بھر خام سنکھیا کھلا کر انھیں صحت مند قرار دے دیا جائے گا۔

ہمارے جی میں آتا ہے کہ اُٹھ کر ان سے کہیں کہ "خدا کے لیے ان فریبی لوگوں کے پاس سے بھاگ جاؤ۔ یہ علاج چھوڑ کر کسی مغربی طریق علاج کے ڈاکٹر کے پاس جاؤ جو اس مرض کی اصل حقیقت سے تمھیں آگاہ کرے اور تمھیں اور تمھارے بچوں کو اس مرض کے خوفناک انجام سے نجات دلائے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کیا جائے۔ یہ انتہائی نازک صورت حال ہے۔ آیورویدک ڈاکٹر تمام مغربی تحقیق کاروں کو نہایت شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کے طریق کار کی صحیح تصویر حاصل کرنے کے لیے ان کے کام میں دلچسپی ظاہر کرنے بلکہ ان کے ساتھ کھلی ہمدردی ظاہر کرنا بہت ضروری ہے اگر ہماری طرف سے انھیں تنقید کا شبہ بھی ہو جائے تو وہ بالکل خاموش ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں۔ ہم ان کی ہر بات پر واہ واہ کرنے پر مجبور ہیں حالانکہ ان کی باتیں سُن کر "شرم شرم" کے نعرے لگانا نسبتاً آسان ہے۔

لیکن یہاں تو ہمیں بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ پروفیسر نے اس کا اہتمام کر رکھا ہے۔ ہمارے سارے دورے میں ان کے مشتاق لبوں سے الفاظ کا ایک دریا بہتا رہا۔ وہ الفاظ جن میں وہ یہ دعوے کرتے رہے کہ آیوروید ا میں دنیا کا ہر معجزہ کر دکھانے کی صلاحیت ہے، ماسوا مردے کو زندہ کرنے کے بلکہ وہ تو اس دعوے کے قریب قریب ہی پہنچ جاتے ہیں۔

۶

اسی اثنا میں ہمیں ہار پہنانے کی باری آ گئی۔ ہمیں ہاروں سے لادنے کا یہ فریضہ وہاں کے طالب علم انجام دے رہے تھے۔ جونہی ہم ایک لیکچر روم میں داخل ہوتے طالب علموں کی ٹولیاں کھڑی ہو جاتیں، ہمیں خوش آمدید کہنے کے لیے گیت گاتیں اور پھر ہماری گردن میں ہار پہناتی تھیں۔ ہمیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم یہودا کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں یہ ہار نہ پہنائے جاتے تو ہمیں یقیناً بہت خوشی ہوتی خاص کر اس وجہ سے کہ ان پھولوں میں بے شمار کیڑے مکوڑے تھے جو نکل نکل کر ہماری کمر پر رینگ رہے تھے۔ لیکن اب اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس تمام عرصے میں بھی ان لوگوں کی احمقانہ پرستش پر مبنی باتیں جاری رہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آیوروید ا میں دل کے امراض کا.......... خون کے امراض کا.......... دماغ کی بیماریوں کا مکمل علاج موجود ہے۔ لیکن اگر کم سے کم سخت الفاظ بھی استعمال کیے جائیں تو یہ ساری باتیں عمومی اور غیر واضح ہیں۔

اگر آپ اس تصویر میں حقیقت پسندی کا ذرا سا عنصر بھی شامل کرنا چاہیں تو ایک طالب علم سے بات چیت کچھ اس انداز کی ہوگی۔

''کیا آیوروید امیں ذیابیطس کی دوا موجود ہے۔''

''اوہ۔ ہاں''

''کیا وہ انسولین سے ملتی جلتی ہے؟''

''اوہ......نہیں''

''کیا یہ دوا انسولین جتنی مؤثر ہے؟''

کوئی جواب نہیں۔ خاموشی

''میں نے پوچھا کہ کیا یہ دوا انسولین جتنی کارگر ثابت ہوتی ہے۔''

''شاید نہیں''

''کیا اس سے مرض پر کچھ اثر پڑتا ہے''

''بات یہ ہے کہ.........''

ہم اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''جب تک انسولین ایجاد نہیں ہوئی تھی تو ذیابیطس، خاص طور پر اس وقت جب مریض کی عمر بیس برس سے کم ہو، لاعلاج تھا اور عموماً جان لیوا ثابت ہوتا تھا۔ کیا یہ بات درست نہیں ہے؟''

''ہونہہ.........شاید''

''میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا یہ بات درست نہیں ہے۔''

یہاں ان کا سپرنٹنڈنٹ غالباً بیچ میں دخل دے گا اور آپ سے کہے گا کہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ آیوروید ا ذیابیطس کے سلسلے میں ''شاید'' اتنی مؤثر نہیں اور اگر مریض پر ہمارے علاج کا اثر نہیں ہوتا تو ''شاید'' ہم اسے ''کہیں اور'' جانے کا مشورہ دے دیں۔

اور یہ سمجھنے کے لیے آپ کو طب کے وسیع علم کی ضرورت نہیں کہ جس وقت تک ایک آیورویدک معالج، اپنے علاج سے مایوس ہوگا، اس وقت تک مریض ذیابیطسی کوما (*diabetic coma*) میں جا چکا ہوگا، جس سے وہ کبھی بھی جاگ نہیں سکتا۔ تاہم یہ سب کچھ کہنے سننے کا کیا فائدہ؟

اب ذرا دو آیورویدک ماہروں کے ساتھ آتشک کے موضوع پر میری بات چیت کا ریکارڈ بھی ملاحظہ فرما لیجیے (یہ مجھے چائے کا کپ پیش کرنے سے پہلے کا واقعہ ہے)۔

''ہاں ہاں، ہمارے پاس آتشک کے نہایت حیرت انگیز علاج موجود ہیں۔ ایک نہیں کئی علاج اور ہم اس میں سنکھیا بھی استعمال کرتے ہیں۔''

''لیکن میں نے تو سنا تھا کہ آپ لوگ انجکشن نہیں دیتے۔''

''ہاں......ہم لوگ انجکشن نہیں دیتے۔ ہم انھیں سنکھیا کھلاتے ہیں۔''

''سنکھیا کھلاتے ہیں؟''

''ہاں......نیوسالوران لیکن ظاہر ہے کہ اس کی مقدار نہایت قلیل ہوتی ہے''

''اور آپ کو ایک مریض کو مکمل طور پر صحت یاب کرنے میں کتنا عرصہ لگتا ہے؟''

''دو یا تین مہینے''

اس کے اس غیر معمولی بیان پر میں اپنی حیرت پر قابو نہ پا سکا۔ اس پر دوسرے ماہر نے جو عمر میں بڑا تھا، فوری طور پر اسے ٹھیک کر دیا اور کہا ''دو تین ماہ نہیں، دو تین برس''۔

لیکن نسبتاً کم عمر ماہر پر اس لمبے چوڑے فرق کا کوئی اثر نہیں پڑا اور وہ کہنے لگا ''ہم بالآخر مریض کا علاج کرتے ہیں'' اس کے بعد اس نے مجھے کسی شخص کے نوکر کا قصہ سنایا جو آتشک کے دوسرے مرحلے میں تھا لیکن ان کا علاج کرانے سے تین ماہ میں اس کا خون ویسر مین [1] (*Wasserman*) ٹیسٹ میں منفی ردعمل ظاہر کرنے لگا تھا۔

اس ماہر کی اس بات کو تسلیم کر بھی لیا جائے، اگرچہ یہ ناممکن ہے، تب بھی یہ مریض کی مکمل صحت یابی کا تو کوئی ثبوت نہیں ہے۔

میں نے اس مرض کی تباہ کاریوں اور مغرب کے میڈیکل سائنس کی ان کوششوں کا کافی تفصیل سے مطالعہ کیا ہے، جو اس مرض پر قابو پانے کے لیے کی گئی ہیں۔ میں بھی ایک طویل عرصہ ہوا اسی نتیجے پر پہنچا تھا

---

(۱) آیورویدک ڈاکٹر ویسر مین کے طریق تشخیص کو، جو بنیادی طور پر مغربی طب کا حصہ ہے، کیوں استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ایسا کرتے ہیں۔

جس پر سی۔ مک لارن(C.MacLaurin) پہنچے تھے۔ انھوں نے یورپی تاریخ کا مطالعہ میں ساری صورت حال کا لب لباب ان تباہ کن الفاظ میں بیان کیا ہے۔ "انسانیت کے لیے سب سے بڑی دو لعنتیں، جنگیں اور آتشک ہیں۔"[1]

یہ مک لارن ہی تھے جنھوں نے ابتدائی طور پر مجھے اس لعنت کے پیچھے لگنے پر مجبور کیا تھا جس کی سیاہ کاریوں کا علم نہ صرف، معاصر تاریخ دان کے لیے بلکہ ناول نگاروں، صحافیوں، پادریوں غرضیکہ ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جو انسانوں کے قلوب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

جنگ عظیم نے اس بیماری کے بارے میں عوام کے علم میں اضافے کو اور زیادہ ضروری بنا دیا تھا۔ برطانیہ کی بندرگاہوں میں اس مرض کا شکار ہونے والوں کی تعداد میں سو فی صد تک اضافہ ہو گیا تھا۔ اسلحہ ساز فیکٹریوں میں بھی اعداد و شمار کچھ کم چونکا دینے والے نہیں ہیں اور آئرلینڈ سے بڑی تعداد میں مزدوروں کی آمد نے اس لعنت کے شعلوں کو اور بھڑکا دیا تھا۔ آئرلینڈ میں بدقسمتی سے چرچ کی پالیسی، عوام میں جنسی بیداری پیدا کرنے کی سخت مخالف ہے۔

ہم صحافیوں میں سے کئی نے چپ کی اس پالیسی کے خلاف سال ہا سال جنگ لڑی ہے۔ وہ لمحہ میرے لیے انتہائی خوشی کا لمحہ تھا جب میں نے جنگ عظیم کے ابتدائی دنوں میں، ایک بڑے اور بااثر اخبار کے ایڈیٹر کو اس مرض کے بارے میں ایک مضمون شائع کرنے پر راضی کیا تھا۔ یہ مضمون اس لحاظ سے اپنی نوعیت کا پہلا مضمون تھا کہ اس میں "آتشک" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا، اس کو "ایک خاص نفرت انگیز بیماری" کے بزدلانہ لقب سے ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔

لہٰذا آیورویدک ڈاکٹروں کا اس مرض کے علاج پر غیر ذمہ دارانہ یقین میری برداشت سے بھی باہر تھا۔ میں نے ان کی باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی چند غیر واضح جملے، مثلاً واقعی" اور "بہت دلچسپ" کہے، اور گرمی کا بہانہ کر کے ان سے اجازت لے کر چلا آیا۔

ہندوستان میں قوم پرستی کے عروج سے آیورویدک نظام علاج کو بہت بڑھاوا تو ملا ہی تھا اس کے ساتھ ساتھ آیورویدک ڈاکٹروں نے قیمتی اور حسین چیزوں کے استعمال سے بھی بہت فائدہ اُٹھایا۔ وہ کہتے ہیں "ہم موتی پیس کر استعمال کرتے ہیں۔"

(۱) پوسٹ مارٹم۔ مصنفہ سی میک لارین (جوناتھن کیپ)

جی میں آتا ہے کہ اس کے جواب میں کہا جائے کہ "بلاشبہ آپ یونی کارن[1] (Uni-Corn) کا نافہ بھی استعمال کرتے ہوں گے"، لیکن ہم خاموش رہتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نظام علاج میں ہیرے جواہرات بہت زیادہ استعمال ہوتے ہیں۔ لعل، یاقوت، زمرد اور سینکڑوں کمتر قیمتی پتھر۔

میں نے خود ان کے اس مشہور مرکب کا ایک چمچہ پی کر دیکھا تھا، جو پسے ہوئے موتیوں کو چینی اور عرق گلاب میں ملا کر ایک خمیرہ کی شکل میں تیار کیا جاتا ہے، اس کے استعمال کے بعد لمحہ بھر کو میرا ذہن جھنا گیا لیکن اس کے علاوہ اور کوئی بُرا اثر ظاہر نہیں ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ دل کے لیے نہایت مفید ہے۔ وہ انار، انجیر اور گلاب کی پتیوں سے بھی ایک خوشبودار مرکب تیار کرتے ہیں۔ میں نے اسے بھی چکھ کر دیکھا لیکن ریشم کے کیڑوں سے تیار کیے جانے والے مرکب کو چکھنے سے معذوری ظاہر کی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ریشم کے وہ کیڑے ابھی زندہ ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود میں آیورویدا کے ڈاکٹروں کو ایک چیز کی سند ضرور دے سکتا ہوں۔ ایک دفعہ جب میں بنگال میں تھا تو ایک بزرگ آیورویدک ڈاکٹر نے، یہ سُن کر کہ میں ان کی "سائنس" میں دلچسپی لیتا ہوں، مجھے خط لکھا اور مجھے دوا کی ایک بوتل بھیجنے کا وعدہ کیا جس کے استعمال سے "میرا بڑے سے بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

کچھ عرصہ بعد وہ بوتل مجھ تک پہنچ گئی۔ میں نے اس کو کھول کر لیبل پر لکھی ہوئی ہدایات پڑھیں۔ اُف خدایا۔ نہیں نہیں۔ یہ میرے ساتھ بہت بڑی زیادتی تھی۔

اس بوتل میں شہوت بڑھانے کی دوا تھی۔ یہی نہیں دوا بھی اس قسم کی تھی جو انسان میں گھوڑے جیسی طاقت پیدا کر دیتی ہے۔"

میں اس بوتل کو کھڑکی سے باہر پھینکنے والا ہی تھا کہ میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ میں نے سوچا کہ یہ بوتل (اپنے ملازم) حسین کو دے دوں۔ وہ جتنی سُستی سے میری پتلون پر استری کرتا تھا۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا، کہ اگر اس کو تھوڑی سی طاقت مل جائے، تو اُس کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

اگلے روز جب حسین میرے گھر آیا تو اس نے بتایا "رات کو میں نے آپ کی دی ہوئی دوا کی بوتل

(۱) یونی کارن ایک فرضی جانور ہوتا ہے، جس کا جسم گھوڑے کا اور اس سر پر ایک سینگ ہوتا ہے۔ (مترجم)

پی تھی۔"

"حسین! تم نے ساری بوتل ایک ہی دفعہ پی لی!"

"ہاں صاحب...... بڑی اچھی دوا ہے صاحب"

اس نے میری پتلون میرے سامنے رکھ دی۔ اس پر یقیناً آج بہتر طریقے سے استری کی گئی تھی۔ لیکن اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس کی رات کی کہانی سنا رہے تھے۔

لہٰذا اتنی تنقید کے بعد آیورویدا کے حق میں بھی کچھ نہ کچھ تو کہا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

آٹھواں باب

قیدی

ٹیلی فون کی دوسری جانب اس عورت کی آواز نہایت دلکش، از کار زمانہ سے بے نیاز، موسیقی اور شادمانی سے لبریز تھی۔

"جب آپ پہلے آئے تھے تو میں جیل میں تھی۔" اس نے کہا" اسی لیے آپ سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ لیکن اب میں باہر آ گئی ہوں۔ کم از کم اس وقت تو باہر ہوں۔ تو آپ چائے پر تشریف لائیے۔ کب؟ آج ی، تو بس پھر آپ ساڑھے پانچ آ جائے گا۔"

میں نے ٹیلی فون بند کیا اور سامنے پڑے ہوئے ٹیلی فون پیڈ پر لکھا۔ "جیل۔ نائیڈو۔ شاک" اس تحریر سے میرا مقصد بالکل سادہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ان الفاظ سے مجھے جو شاک لگا ہے اس کو ہمیشہ یاد رکھوں" میں جیل میں تھی" یہ الفاظ مسز سروجنی نائیڈو جیسی مہذب اور مسحور کن خاتون کے منہ سے نکلے تھے؟ ہندوستان میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی بیان کیا ہے اس طرح کے شاک سے انسان کے حواس ایک لمحہ کے لیے تو سُن ہو جاتے ہیں لیکن چند ہفتے کے بعد اس طرح کے واقعات آپ کے لیے حیرانی کا باعث نہیں رہتے۔ ہم انھیں تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ زندگی کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود" میں جیل میں تھی" کے الفاظ مجھے آج تک حیرت میں ڈال دیتے ہیں، خاص طور پر اس دلکش، سُریلی اور اگر وہ مجھے معاف فرمائیں تو جوان آواز میں کہے گئے ہوں۔

مسز نائیڈو سے ملنے کو جانے سے قبل ہم ذرا اردگرد کا جائزہ لے لیں تو بہتر ہوگا۔ ہم اس وقت حیدر آباد میں ہیں، جہاں سے آپ کو یاد ہوگا کہ ہم نے ہندوستانی آرٹ کی تلاش کا آغاز کیا تھا۔ اس عرصے میں بہت کچھ تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ ہم میں، ہندوستان میں، بلکہ ساری دنیا میں۔ لیکن ان کا تذکرہ کرنے کا یہ وقت نہیں۔ فی الحال صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ یہ اکتوبر کا مہینہ ہے، ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے لارڈ لن لتھ گاؤ *(Lord Linlithgow)* کا طویل اور تشویش ناک دور ختم ہونے والا ہے اور سیاسی صورت حال پر خاموشی چھائی ہوئی ہے، تاہم بنگال کے قحط کی صدائے بازگشت کبھی کبھی سنائی دیتی ہے۔ اس سانحہ کا جائزہ ہم بعد میں کسی موقع پر جا کر لیں گے۔

مسز نائیڈو کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے میں ہندوستانی سیاست میں ان کی اہمیت کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر امبیدکر کے بعد وہ پہلی اہم سیاسی شخصیت ہیں، جس کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا۔

میں نے دیدہ و دانستہ ہندوستان کے سیاست دانوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے کیونکہ جب تک ہم ہندوستان کے عوام کو اچھی طرح نہیں سمجھتے، اس وقت تک لیڈروں کا تذکرہ کرنا فضول ہے۔ ہندوستانی عوام اور ان کے ماحول کے بارے میں حقیقی علم کی کمی ہی ہندوستان کے بارے ہر مباحثے کو غیر حقیقی بنا دیتی ہے، خواہ وہ برطانیہ کے دارالعوام میں ہو یا امریکی اخبارات میں۔ دنیا میں کوئی منظر شاید ہی اتنا مضحکہ خیز ہو جتنا کہ بزرگ انگریز آزاد خیالوں کی جانب سے مغربی جمہوریت کے اُصولوں کو ایک ایسے ملک میں منطبق کرنے کی کوششیں، جہاں جمہوریت کے پنپنے کے امکانات بس اتنے ہی ہوں جتنے کہ سکاٹ لینڈ کے پھولوں کے تھر کے صحرا میں کھلنے کے۔ اسی طرح دنیا میں شاید ہی کوئی چیز اتنی بے ڈھنگی ہو جتنی دیہی زندگی کے بارے میں لکھنے والی مس پرل بک، اور دوسرے امریکی مصنفوں کا ہندوستانی ''عوام'' کے بارے میں باتیں کرنا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے اصل رہنے والے گوند، بمبئی کے ایک بکس والا، ایک پنجابی چپڑاسی، ایک مدراسی وکیل، ٹریونکورٹ کے ایک اچھوت، ایک سکھ جنگجو، سود پر قرضہ دینے والے ایک پٹھان، مسٹر گاندھی اور ہز ہائی نس دی آغا خان کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں ہے۔ ہندوستان کی سیاست کی پیچیدگیوں پر کسی ایسے شخص کی بحث جو نہر سویز کے مشرق میں کسی ملک میں گیا ہی نہ ہو، اسی قدر بے کار اور فضول ہوگی جس طرح لندن کاؤنٹی کونسل کے امور کے بارے میں اس شخص کی رائے جو مغرب کی طرف کراچی سے آگے نہ گیا ہو۔

تاہم اب ہمیں اس پس منظر کا تھوڑا بہت اندازہ ہو گیا ہے، جس میں ہندوستانی سیاست کی اہم شخصیات کام کرتی اور خود بھی اس کا حصہ ہیں۔ ان ہستیوں میں مسز نائیڈو بہت ممتاز ہیں اور ہمیشہ سے نمایاں ہیں۔ ۶۴ سالہ مسز نائیڈو نے بہت بھرپور زندگی گزاری ہے۔ وہ کانگریس (انڈین نیشنل کانگریس) کی سب سے پہلی خاتون صدر رہ چکی ہیں۔ جہاں کہیں بھی، جنگ شدید ترین ہوتی، وہ وہاں موجود ہوتیں۔ اپنی پھول دار بارڈر والی ساڑھی لہراتی ہوئی اور برطانوی راج کے خلاف اپنی زنانہ سرکشی کا مظاہرہ کرتی ہوئی۔ انھوں نے لاٹھی چارج سہے اور گاندھی کی سیاسی زندگی کے ہر نازک موڑ پر ان کا ہاتھ تھاما۔ اپنے خاصے بڑے خاندان کی ذمہ داریاں پوری کیں اور ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ نہایت مسحور کن شاعری کرنے کے لیے بھی وقت نکالا۔ ان کی زندگی کو دیکھ کر انسان کی شدید خواہش ہوتی کہ پیٹر (Pater) کے الفاظ میں کہے کہ ''ان کے لیے یہ تمام چیزیں بانسری کے نغمات کی طرح تھیں۔'' لیکن نہیں اس طرح ہم زیادہ ہی آگے نکل جائیں گے۔ تاہم یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ انھیں دیکھ کر اب بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک جوان خاتون ہیں۔ ان میں دلکشی ہے اور انھیں اس کا علم بھی ہے۔

۲

ٹھیک پانچ بجے وہ سابقہ قیدی ایک دیوان پر آلتی پالتی مارے ہوئے بیٹھی، نہایت بے ساختگی سے اتنی ذہین اور پُر مغز گفتگو کر رہی تھیں کہ لیڈی آکسفورڈ کی بہترین گفتگو کی یاد تازہ ہو گئی، جو وہ اس زمانے میں جب پیلے ٹیولپ (Tulip) کے پھول دو شلنگ کے ایک درجن مل جاتے تھے اور شیری کسی واقعے کو منانے کے لیے خاص مشروب نہیں بلکہ محض ایک شراب تصور کی جاتی تھی۔

''میرا گھر بالکل ایک سرکس ہے۔'' انھوں نے خبردار کیا اور یہ ضروری بھی تھا کیونکہ میری کرسی کے پیچھے سے اچانک ان کی ایک نہایت نحیف سی بیٹی نمودار ہوئی اور کہنے لگی ''آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ جب میں نے آکسفورڈ میں آپ کو سُنا تھا تو آپ موٹے اور ذہین تھے۔ اب آپ میری طرح دبلے ہو گئے ہیں اور بات چیت بھی نہیں کر رہے'' پھر ایک اور بیٹی جو اتنی دبلی نہیں تھی، کمرے میں یہ اعلان کرتی ہوئی داخل ہوئی ''اگر آپ سامراج کے خلاف لیکچر سننے کے لیے آئے ہیں تو آپ بالکل صحیح مقام پر آئے ہیں۔''

''بیٹے خاموش ہو جاؤ'' مسز نائیڈو نے ٹوکا، دیکھو ابھی تو مسٹر نکولس (Nicols) نے چائے بھی نہیں پی ہے۔''

پھر ان کا ایک بیٹا نظر آیا جو بظاہر یوگا کے مراقبے میں غرق تھا۔ پھر ایک اور سیاہ داڑھی والا بیٹا دکھائی دیا جو ایک آیورویدک ڈاکٹر نکلا۔ وہ ایک کرسی پر دراز ہو کر آیوروید کے عمومی اصول رٹ رہا تھا۔ مثال کے طور پر ہمارے اندر نظام شمسی کے پانچ مرکز ہیں۔ پہلا ہماری منطقی طاقت، دوسرا بصارت، تیسرا جگر، چوتھا تخلیقی قوت اور پانچواں، ہمارا، ہماری کمر کا نچلا حصہ "Solar Plexus" ہے۔ اس وقت میں کھیرے کے سینڈوچ کے ساتھ نبرد آزما ہو رہا تھا جو ہاتھوں سے پھسل رہا تھا، لہٰذا ہو سکتا ہے کہ میں نے اس کی تمام باتیں سلسلہ وار بیان نہ کی ہوں لیکن اس کی باتیں تھیں کچھ ایسی ہی۔ وہاں اور بھی کئی لوگ تھے۔ ان میں مسز نائیڈو کے شوہر بھی شامل تھے جو اس شور شرابے سے زچ ضرور ہو رہے تھے لیکن ہنسی خوشی کے ساتھ۔ اس شور شرابے میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب ہر دوسرے لمحے کوئی نوکر ایک لفافہ لیے کمرے میں داخل ہوتا ہے، جس میں قحط ریلیف فنڈ کے لیے چندہ ہوتا تھا۔ مسز نائیڈو خوشی کے ایک نعرے کے ساتھ ہر لفافہ کھولتیں اور اس میں سے نوٹ نکال کر ہوا میں لہراتی تھیں۔ ''یہ مسٹر ایکس نے بھیجا ہے۔ بہت اچھا آدمی ہے۔ اپنی استطاعت سے بہت زیادہ امداد دی ہے اور یہ مسز وائی نے بھیجے ہیں۔ اگر وہ سمجھتی ہیں کہ دس روپے دے کر ان کا پیچھا چھوٹ

جائے گا تو وہ غلط سمجھتی ہے۔ اسے ذرا ٹیلی فون کرکے چائے پر آنے کی دعوت دو۔"

اور پھر وہاں ایک سیامی بلی بھی تھی، اتنی خوبصورت اور دلفریب کہ مجھے اپنی ساری ذہنی صلاحیتیں استعمال کرکے، اس کی جانب سے توجہ ہٹانی پڑی۔

۳

بالآخر یہ سرکس ختم ہوگیا اور سارے کھلاڑی چلے گئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے جانے کا مجھے احساس بھی نہیں ہوا کیونکہ وہ سب مجھے خدا حافظ کہے بغیر وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔ اب صرف وہاں میں تھا اور اس سرکس کی سب سے بڑی کھلاڑی مسز نائیڈو۔

"اب فرمایئے آپ کس چیز پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"جیل پر.......... اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو"۔

"مجھے کاہے کو اعتراض ہوگا۔ میرے لیے اس میں شرم کی کوئی بات نہیں ہے.......... بلکہ یہ کہنے میں بھی کہ اس کا کچھ حصہ تو بڑا تفریحی تھا۔"

ہم یہاں کانگریسیوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کے وجوہ و اسباب پر بحث سے گریز کریں گے (یہ گرفتاریاں ۸-اگست ۱۹۴۲ء کو ہوئی تھیں)۔ ایسا کرنے سے کبھی ختم نہ ہونے والی بحث شروع ہو جائے گی۔ لیکن جب تاریخ اس بارے میں اپنا قطعی فیصلہ سنائے گی تو وہ برطانوی حکومت کے حق میں ہوگا۔ اگر یہ گرفتاریاں عمل میں نہ لائی جاتیں تو ایک ہفتے کے اندر اندر سارا ہندوستان خونیں انتشار کا شکار ہو جاتا۔ جاپانی فوجیں ہندوستان میں داخل ہو جاتیں اور ہر طرف آتشزدگی اور قتلِ عام کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور جنگ عظیم نہ جانے کتنے عرصے اور جاری رہتی۔ مسز نائیڈو ظاہر ہے کہ اس خیال سے متفق نہیں ہو سکتیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کانگریسیوں کی اکثریت معصوم بھیڑوں کی طرح ہے، ان کے عزائم قطعاً تخریب کارانہ نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی یہ بات ان کی اپنی ذات کے لیے بالکل درست ہو۔ لیکن ہم اس بات میں نہیں پڑتے۔ میں ان کو صرف ایک مہذب اور دلربا خاتون سمجھنا، جو اپنے عقیدوں کی بنا پر قید کر دی گئی تھیں، زیادہ دلچسپ رہے گا۔

یہ ۷-اگست ۱۹۴۲ء کی رات کا واقعہ ہے۔ بمبئی (ممبئی) میں چند گھنٹے قبل کانگریس کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں گاندھی سے لے کر نیچے تک تمام رہنماؤں نے شرکت کی تھی، اور کئی دھواں دار تقریریں کی گئی تھیں۔ فضا میں گھن گرج پیدا ہو رہی تھی اور مسز نائیڈو کے نسوانی احساسات نے اس گھن گرج کی آواز کو

محسوس کر لیا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ "اس روز شام کو ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ میں نے پٹیل [1] سے کہا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہمیں گرفتار کر لیا جائے گا۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ بھلا ہمیں کیوں گرفتار کیا جائے گا۔"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ہمیں جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ آج رات کو یا پھر کل۔" وہ مجھ سے بار بار پوچھتے رہے کہ آخر ہمیں کس لیے حراست میں لیا جائے گا اور مجھے یاد ہے کہ میں نے انھیں جواب دیا تھا "کیونکہ ہم اگر ناک بھی صاف کرتے ہیں تو اس سے انگریزوں کی صفوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔"

انھوں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "اسی روز رات کو یا یوں کہیے کہ اگلے روز صبح ہی صبح گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ میں معمول کے مطابق سونے کے لیے لیٹی کہ پھر وہی خیال اتنی شدت سے آیا کہ میں بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی، ٹھنڈے پانی سے غسل کیا اور اپنا سامان پیک کرنے لگی اور یقین مانیے کہ صبح چار بجے دروازے کی گھنٹی بجی، اور وہ لوگ آ گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میں تیاری مکمل کرکے ان کا انتظار کر رہی ہوں تو وہ اس قدر حیران ہوئے کہ مجھے ہنسی آ گئی۔

وہ کہنے لگے "میڈم آپ کو کیسے علم ہوگیا؟ ہمیں تو خود ایک گھنٹہ پہلے آپ کو گرفتار کرنے کے احکام ملے ہیں۔"

"بس، مجھے احساس ہوگیا تھا۔" میں نے جواب دیا اور انھیں میری بات تسلیم کرنی پڑی۔ کیونکہ اس بات کا کوئی امکان تھا ہی نہیں کہ مجھے اپنی گرفتاری کی پیشگی اطلاع مل سکتی۔ گھر پر ساری رات پہرہ لگا رہا تھا اور ٹیلی فون کی تاریں کاٹ دی گئی تھیں۔"

انھوں نے بتایا کہ "جب ہم پولیس سٹیشن پہنچے تو دن نکل رہا تھا۔ میں خود کو خوش و خرم محسوس کر رہی تھی۔ مجھے اتنا وقت مل گیا تھا کہ میں ٹھیک طرح سے کپڑے تبدیل کر لوں۔ ویسے بھی اب تو جیل جانا معمولات زندگی میں شامل ہو چکا تھا۔ لیکن دوسرے کئی لوگ بہت پریشان تھے۔ ان کے لیے یہ اچانک گرفتاری شدید حیرت کا باعث تھی۔ گاندھی جی اس وقت، جب پولیس انھیں گرفتار کرنے پہنچی، اپنی دعاؤں میں مصروف تھے۔ ویسے پولیس والوں نے بھی ادب آداب کی پوری طرح پابندی کی اور جب تک انھوں نے اپنی پوجا ختم نہیں کر

(۱) سردار پٹیل، جو پارٹی کے صدر اور کانگریس کی آٹھ وزارتوں کے ملاڈ کیٹر رہے۔

لی اس وقت تک باہر ہی ٹھہرے رہے۔ لیکن میرے خیال میں پنڈیل پوجا میں مصروف نہیں تھے اور دوسروں کے چہروں کو دیکھ کر بھی یہی اندازہ ہوتا تھا۔"

"ہم چالیس قیدی تھے، اور ہمارے لے جانے کے لیے ایک خاص ٹرین کا اہتمام کیا گیا تھا جو خاصی خوبصورت اور آرام دہ تھی۔ سی-آئی-ڈی کے سربراہ میرے پاس آئے۔ وہ بہت متفکر نظر آ رہے تھے۔ کہنے لگے "مجھے اُمید ہے کہ یہاں کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوگی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" میں نے جواب دیا۔ پھر وہ مجھ سے کہنے لگے "کیا آپ اس ٹرین میں مسز گاندھی کے ساتھ بیٹھ کر انھیں خاموش رکھ سکیں گی۔" مجھے یہ بات سُن کر پھر ہنسی آ گئی۔ میں نے ان سے کہا "گاندھی جی کے ساتھ بیٹھنا میرے لیے یقیناً عزت اور فخر کا باعث ہوگا لیکن انھیں خاموش رکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ وہ کھڑکی سے باہر کودنے کی کوشش کریں گے، نہ ٹرین کو روکنے کے لیے زنجیر کھینچیں گے اور نہ ہی اس طرح کی کوئی دوسری حرکت کریں گے اور واقعی گاندھی جی اس سفر میں ایک چوہیا کی مانند خاموش بیٹھے رہے۔ انھوں نے تو غصے کا اظہار بھی نہیں کیا۔ صرف بار بار یہ الفاظ دہراتے رہے۔ "یہ سب کچھ احمقانہ ہے، انتہائی احمقانہ۔ عین اس موقعے پر جب میں وائسرائے سے مذاکرات کرنے والا تھا۔"

انھوں نے اپنا بیان جاری رکھا "میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ ہمیں نہ جانے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ یہ احساس کچھ عجیب سا ہوتا ہے کہ صبح صبح آپ کو گھر سے نکال کر ایک نامعلوم منزل کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ میں اُمید کر رہی تھی کہ مجھے اسی جیل میں لے جایا جائے گا جہاں مجھے دس سال قبل قید کیا گیا تھا۔ وہاں میں نے ۱۰۸ یا شاید ۱۰۹ درخت لگائے تھے اور انھیں دوبارہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، وہ ہمیں آغا خان کے نام نہاد محل میں لے گئے۔"

"نام نہاد کیسے؟" میں بیچ میں بول پڑا۔

"کیونکہ یہ محل نہیں لگتا، خاص طور پر آغا خان کا محل .... ارے! آپ اخروٹ لیجیے یا چیری کے ساتھ بنی ہوئی کوئی چیز!!"۔

انھوں نے میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے مجھ سے کہا:

"نہیں کچھ نہیں۔ شکریہ"

وہ ایک ہی سانس میں بولتی جا رہی تھیں "ویسے یہ حقیقت ہے کہ ہم وہاں بڑے آرام سے رہے۔ وہاں کمروں کی فضا بہت خوشگوار تھی، خوراک بھی عمدہ تھی، اور انگریز بھی ہمارے ساتھ نہایت شائستگی سے پیش

آتے تھے مگر "یہاں پہنچ کر ان کی آنکھوں میں ایک خطرناک چمک پیدا ہوگئی" وہ یہ نہیں سمجھتے کہ قید کے عیش و آرام پر ہم آزادی میں بھوک اور گندگی میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہم دنیا سے بالکل کٹے ہوئے تھے۔ باہر سے ایک مکھی بھی اندر نہیں آ سکتی تھی۔ ہم سوائے ایک ڈاکٹر کے کسی سے نہیں مل سکتے تھے اور وہ ڈاکٹر بھی ہمیں کچھ ایسی خوف زدہ نظروں سے دیکھتا تھا جیسے ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ اس کے سامنے ہی مر جائیں گے، یا ہوا میں تحلیل ہو جائیں گے یا کوئی اور شرمناک حرکت کریں گے۔ ہمیں تین ہفتے تک دنیا سے بے خبر رکھا گیا۔ کوئی خبر ہم تک پہنچنے نہیں دی گئی۔ ہر قسم کے اخباروں پر پابندی تھی۔ ہمارے پاس کوئی ریڈیو نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ہمارے گھر والوں تک کو یہ نہیں بتایا گیا کہ ہم کس جگہ قید ہیں۔ ہمیں اس طرح پہرے میں رکھا جاتا تھا جیسے کہ ہیرے جواہرات کو تجوریوں میں بند رکھا جاتا ہے...... ارے آپ چائے کا ایک اور کپ نہیں لیں گے؟"

"نہیں۔ بس۔ شکریہ" میں نے جواب دیا۔

"یہ ٹھنڈی بھی ہے اور کالی بھی، لیکن چائے ہے۔ بہرحال اگر آپ کو نہ پینے پر اصرار ہے.......... اچھا تو میں کیا کہہ رہی تھی۔"

"جیسے ہیرے جواہرات کو تجوریوں میں رکھا جاتا ہے۔"

"ہاں۔ تجوریوں میں ہیرے جواہرات کی طرح .... اور اس کے بعد......"

ہم ان کی داستان کے باقی حصے کو یہیں چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ قید کی زندگی، خواہ وہ مسز نائیڈو کی درخشندہ شخصیت کے گرد کیوں نہ گھومتی ہو، یکسانیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہاں اس میں گاہے گاہے کچھ روشن لمحات آ جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک لمحہ اس وقت آیا جب سی-راجگو پال اچاریہ، جو خود بھی کانگریس کے صدر رہ چکے تھے، گاندھی سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ اس سے پہلے آخری بار جب راجگو پال اچاریہ گاندھی سے ملنے آئے تھے تو وہ "The Hound of Heaven" پڑھ رہے تھے اور مسز نائیڈو ان کے پاس بیٹھی اس نظم کی تشریح کر کے انھیں سمجھا رہی تھیں۔ چنانچہ اس دفعہ راجگو پال اچاریہ ان سے ملنے کے لیے آئے تو سب سے پہلے یہ پوچھا "وہ کتے کی نظم آپ نے ختم کر لی کہ نہیں؟"

مسز نائیڈو نے مجھے جو باتیں سنائیں ان میں سب سے زیادہ ڈرامائی قصہ گاندھی کے اس مشہور برت کا تھا، جو انھوں نے فروری ۱۹۴۳ء میں رکھا تھا۔ اس برت کے بارے میں بہت سی تلخ باتیں کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر کہا جاتا تھا کہ مہاتما گاندھی کی صحت کا چارٹ (نقشہ) سیاسی صورت حال کے ساتھ بدلتا رہتا تھا۔ جب کبھی ایسا نظر آتا تھا کہ وائسرائے گھٹنے ٹیکنے لگا ہے تو گاندھی کی حالت بھی تیزی سے خراب ہونی

شروع ہو جاتی تھی اور جس وقت یہ چیز نمایاں ہوتی تھی کہ وائسرائے اپنی بات پر ڈٹا ہوا ہے تو گاندھی کی صحت بہتر ہونے لگتی تھی۔ میں اس طرح کی الزام تراشیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ یہ متعصبانہ اور قطعاً غیر ضروری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گاندھی کا برت بالکل بلا جواز تھا۔ یہ کھلا بلیک میل تھا، اور اس کے نتائج خواہ کچھ بھی نکلتے، ان سے ملک کی عمومی صورت پر کوئی اثر نہ پڑتا، ماسوا اس کے کہ مسائل اور زیادہ الجھ جاتے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس سیاسی اذیت پسندی سے ہماری نفرت، ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اس کو فریب کاری کا نام دیں۔

مسز نائیڈو نے اس سلسلے میں ہمیں بالکل مختلف کہانی سنائی۔ انھوں نے بتایا کہ گاندھی برت کا ساتواں دن ختم ہونے سے پہلے ہی تقریباً تقریباً مر چکے تھے۔ ان کی حالت صبح سے خراب تھی اور وہ مسلسل موت کی جانب جا رہے تھے۔ تمام کانگریسی لیڈر ان کی موت کے خوف سے ان کے بستر کے گرد جمع تھے۔ جوں جوں رات قریب آ رہی تھی ان کی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور سورج ڈوبنے کے وقت ہمیں محسوس ہوا کہ گاندھی کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کی نبض پہلے بے قاعدہ ہوئی اور پھر رک گئی۔ مسز نائیڈو کا کہنا تھا کہ گاندھی کس طرح دوبارہ زندہ ہوئے، ان کے نحیف بدن نے موت کا حملہ کس معجزے سے پسپا کیا اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ اس لمحے کی یاد ہی نہایت دل خراش اور کربناک تھی۔ وہ صرف اتنا کہہ سکیں کہ شاید گاندھی میں زندگی کی خواہش اس قدر مضبوط اور ارادہ اس قدر قوی تھا کہ انھوں نے موت پر غلبہ حاصل کر لیا۔ شاید ان کا خیال درست ہو کیونکہ ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو وادیٔ مرگ میں دور تک جانے کے بعد بھی واپس آ گئے ہیں۔

۴

میں نے اب تک جو کچھ بھی بیان کیا ہے، اس کا ایک غور طلب پہلو یہ ہے کہ مسز نائیڈو نے جن باتوں کا تذکرہ نہیں کیا وہ اُن باتوں سے کہیں زیادہ اہم ہیں، جن کا انھوں نے ذکر کیا ہے۔

انھوں نے میرے ساتھ نہایت بے تکلفی اور راست بازی کے ساتھ باتیں کی تھی۔ انھوں نے ''برطانوی سامراج'' سے اپنی نفرت کو چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اگر انھیں جیل کے نظام سے، جس کا اطلاق ان کے علاوہ دوسرے نسبتاً کم خوش قسمت لوگوں پر بھی ہوتا تھا، کسی قسم کا گلہ شکوہ ہوتا تو وہ یقیناً اس کا ذکر کرتیں۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔

اس بات کا تو خیر ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کی جانب سے یہ الزام لگایا جاتا کہ ان پر قید کے دوران فی الواقع تشدد کیا گیا تھا۔ یہ الزام تو انگریزوں کی حکومت کے کسی بدترین مخالف نے بھی سنجیدگی سے ہم پر عائد نہیں کیا کہ ہم نازیوں کے ان طریقوں کی تقلید کرتے ہیں جو وہ کنسنٹریشن کیمپوں (Concentration Camps) میں اپنے مخالفوں کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔[1] لیکن ہمیں یہ تو بتایا جا سکتا تھا کہ نچلے سرکاری ملازم ہمارے ساتھ تہذیب سے پیش نہیں آتے، پریشان کرتے ہیں۔ ہمیں کھانا اچھا نہیں ملتا تھا۔ ہمیں ذہنی طور پر ہراساں کیا جاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسز نائیڈو نے ایسا کوئی الزام عائد نہیں کیا۔ چنانچہ ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اس طرح کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا ہوگا۔

جب برطانیہ پر تنقید کرنے والے، ہندوستان میں قیدیوں کی بھرمار کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جب وہ ہمارے اعلان کردہ اصولوں اور ان پر عمل درآمد کا شرانگیز تقابل کرتے ہیں تو وہ بہت سی اہم چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جیلوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے تخریب کاری کا اعتراف کر رکھا ہے، اور اگر وہ جنگ میں ملوث کسی دوسرے ملک میں ہوتے تو انھیں فوراً گولی مار دی جاتی۔

ان میں سے پہلی اہم بات جس کو ہمارے نقاد نظر انداز کر دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو دیدہ و دانستہ قید ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کو قید کرنا نہیں بلکہ جیل خانوں سے باہر رکھنا ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ ہر شخص محسوس کرتا تھا کہ وہ اگر قید ہو جائے تو ہیرو بن جائے گا۔ جیل جانا ایک فیشن بن گیا تھا۔ یہ بھی ہائیڈل برگ کے طالب علم کے جسم پر زخم کے نشان کی طرح ایک امتیازی نشان بن گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جیل جانے کے معاشی فائدے بہت تھے۔ سیاست دان کے لیے تو جیل جانا لازمی تھا اور ایک صحافی کے لیے بھی یہ تقریباً ضروری سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ چھوٹے موٹے لوگوں کے لیے بھی جیل میں گزارا ہوا وقت بہت کارآمد ثابت ہوتا تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں ایسے آجروں کی کمی نہیں تھی جو ایسے ''بااعتماد'' نوجوانوں کو آگے بڑھ کر ملازمتیں دینے کو تیار ہوتے تھے۔ ان کا اپنا حقیقی مفاد اسی میں تھا کہ ان کے وطن سے

---

(۱) انگریزوں کے خلاف، جسمانی تشدد کرنے کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ فسادات اور شہری ہنگاموں کے دوران بھی ایسے واقعات بہت کم ملتے ہیں۔ ایک یا دو ناخوشگوار واقعات کو چھوڑ کر، جن میں، امرتسر (جلیانوالا باغ) کا قصہ بہت زیادہ مشہور ہے۔ باقی واقعات میں سر پھٹنے یا ہاتھ پاؤں ٹوٹنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوا اور وہ بھی زیادہ تر ہندوستانی پولیس والوں نے کیا تھا جو اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور مخالف کے حملے سے خود کو بچانے میں مصروف ہوتے تھے۔

برطانوی سرمایہ کار اپنا پیسہ نکال لیں۔

کانگریس کے دیانت دار سیاست دان بھی اس بات سے انکار نہیں کرتے اور وہ انکار کریں بھی تو کس لیے۔ برطانوی راج کو پریشان کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہوسکتا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ ملک کی ہر عمارت میں فوجی بھرے ہوئے تھے، اتنی بڑی تعداد میں رضا کار قیدیوں کے لیے جگہ نکالنا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں اتنے زیادہ قیدیوں کی تعداد کا حوالہ دینے سے بیرونی ممالک میں برطانیہ کی ساکھ پر بھی بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ مغربی مبصر اتنے بڑے پیانے پر اذیت پسندی کے اس مظاہرے سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ شاید ہندوستانیوں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں بچا تھا۔ اگر ہم اس بات کو مان بھی لیں (میں ذاتی طور پر اسے تسلیم نہیں کرتا) تب بھی دنیا کے کسی دوسرے ملک کے نوجوانوں میں اس قسم کے کردار کا مظاہرہ ناقابل یقین ہے۔ یہ طریقہ نہ صحت مندانہ ہے نہ تخلیقی۔ تاہم اس پر ہندومت کی چھاپ بہت گہری ہے۔ اسی قسم کے کردار کا مظاہرہ، ہندوؤں کی طرز زندگی میں آپ کو جگہ جگہ نظر آئے گا۔

ایک اور اہم پہلو جس کو ہمارے ناقد نظر انداز کر دیتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کی ایک بڑی تعداد اس طبقے کے لوگوں کی تھی، جو اتنے غریب تھے کہ انھیں جیل کی زندگی مقابلتاً عیش و آرام کی زندگی دکھائی دیتی تھی۔ ان کی سیاسی وابستگی کسی بھی جماعت کے ساتھ نہیں تھی۔ گاندھی، جناح، نہرو ان ناموں کی ان کی زندگی میں قطعاً کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انھیں صرف یہ پتہ تھا کہ وہ بھوکے اور بے گھر ہیں۔ عام حالات میں وہ جیل جانے سے کتراتے اور اُس سے طاعون کی طرح بچنے کی کوشش کرتے۔ جیل کا نام ہی برائی کی نشان دہی کرتا ہے اور وہ جب جیل سے رہا ہو کر باہر آئیں گے تو معاشرہ انھیں مسترد کر دے گا اور وہ پہلے کی نسبت زیادہ شدید نفرت کا نشانہ بن جائیں گے۔ لیکن اب حالات مختلف تھے۔ وہ حالات کی اس تبدیلی کو سمجھنے سے قاصر تھے، لیکن انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ اب جیل ایک عزت کا مقام سمجھی جاتی ہے؛ ان کے بزرگ اور ان سے بہتر انسان بھی اب جیل جانے کے لیے شور مچا رہے تھے اور جیل میں انھیں معلوم تھا کہ صاف ستھرے بستر اور اچھی خوراک کے علاوہ فکر فردا سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

اب جیل میں ان کے بھوکے پیٹ کو خوراک کے ساتھ ساتھ انھیں شہیدوں کا درجہ بھی ملے گا۔ اس کا نتیجہ نکلنا ناگزیر تھا۔ انھوں نے پتھر برسائے، چاقو لہرائے اور چہروں پر مسکراہٹیں سجائے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں جیلوں میں داخل ہو گئے۔

☆☆☆

حصّہ سوم

پہلا باب

ہیل ہندو!

یہ ہندوستان کے بارے میں پیش کی جانے والی پہلی کتاب ہے جس میں گاندھی تیسرے ایکٹ میں سٹیج پر نمودار ہوتے ہیں۔ عام طور پر وہ پردہ اُٹھنے کے ساتھ نمودار ہو جاتے ہیں اور اس وقت تک کھیل پر چھائے رہتے ہیں جب تک پردہ آخری بار نہیں گر جاتا اور اگر وہ مختصر عرصے کے لیے سٹیج پر نظر نہیں بھی آتے تو بھی ہم اُن کو شور مچاتے ہوئے سُن سکتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے بتائیں کہ ''گاندھی اور ہندوستان الگ الگ تو نہیں ہیں۔'' ''ہمیں شروع ہی سے بار بار یہی سمجھایا جاتا ہے۔ لہٰذا سچ ہی ہوگا۔''

لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ بات قطعاً جھوٹ ہے۔ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ان کو انتہائی شدت کے ساتھ مسترد کرتی ہے۔ وہ گاندھی کو اپنا سب سے خطرناک دشمن تصور کرتے ہیں اور وہ ایسا کرنے میں بالکل حق بجانب ہیں۔ جس طرح لاوال (Laval) آزاد فرانسیسیوں کے لیے فرانس نہیں ہے اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے گاندھی ہندوستان کی علامت نہیں ہے۔ (لاوال، فرانس کے سربراہ تھے جنھیں جرمنی نے فرانس پر قبضہ کرنے کے بعد مقرر کیا تھا) لیکن مسلمانوں کا نقطۂ نظر آپ تک نہیں پہنچتا کیونکہ نہ تو مسلمانوں کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ وہ پروپیگنڈے پر خرچ کرسکیں اور نہ ہی ان کے پاس اپنی تشہیر کرنے کے لیے گاندھی کی ذہانت ہے۔ لیکن انھیں بھی اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کا حق ہے اور ہم بعد کے ایک باب میں ان کی بات بھی سُنیں گے۔

اس سے پہلے ہم ہندوؤں کے سیاسی سٹیج کے اس بوڑھے اداکار پر روشنی ڈالتے ہیں اگرچہ اس میں تھوڑی بہت تاخیر ضرور ہوگئی ہے۔ ہم ان سے ملاقات تو نہیں کرسکتے، کیونکہ ہندوستان میں میرے قیام کے دوران وہ جیل میں نظر بند تھے۔ یہاں ''جیل'' کا لفظ کچھ زیادہ مناسب نہیں کیونکہ وہ آغا خان کے محلوں میں سے ایک محل میں نظر بند تھے۔ جہاں سے وہ کاغذ کے ایک پرزے پر دستخط کر کے کسی وقت بھی باہر نکل سکتے تھے۔ اس کاغذ کے پرزے پر دستخط کرنے سے نہ وہ اپنی روح کو کسی کے حوالے کرتے اور نہ اپنے یا کسی دوسرے سے بے وفائی کے مرتکب ہوتے، اور نہ ہی وہ ہندوستان کی آزادی کے مقصد پر، اچھا یا بُرا کسی قسم کا

ذرا سا اثر ڈالتے۔ ان سے تو صرف اتنے سے عہد نامے پر دستخط کرنے کو کہا گیا تھا کہ میں جنگی کوششوں کو سبوتاژ نہیں کروں گا، اپنے ملک کو جاپانیوں کے حوالے نہیں کروں گا اور برطانوی اور امریکی فوجوں کی پیٹھ میں چھرا نہیں گھونپوں گا۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی بجائے انھوں نے جیل میں رہنے اور اپنی انا اور شان و شوکت کو چمکانے کو ترجیح دی۔ اور ان کے ہزاروں پرستاروں نے اپنی باتوں کی اگربتیاں جلا کر مسئلے کو اور اُلجھا دیا۔ ان اگربتیوں سے اُٹھنے والے دھوئیں نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، حتیٰ کہ امریکہ اور برطانیہ کے قانون ساز ادارے بھی اس دھوئیں سے نہ بچ سکے۔ اس دھوئیں نے ان کی پارلیمنٹ اور سینٹ کے ارکان کے حلق میں بھی خراش پیدا کی اور انھوں نے ایسی ایسی فضول باتیں کیں جن کا تاریخ جمہوریت میں کوئی ثانی نہیں۔

گاندھی پر تنقید کرنے والوں کی ہمیشہ سے تقریباً یہ روایت رہی ہے کہ وہ گاندھی کے بارے میں اپنی باتوں کو ہر طرح کے مشروط جملوں کے استعمال سے اپنی تنقید کو نرم سے نرم کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ لکھتے ہیں کہ "ہمارے خیال میں گاندھی کی پالیسی کام نہیں کرے گی .... لیکن ہمیں احساس ہے کہ ایسا ان کے مہاتما (Saint) ہونے کی وجہ سے ہے۔ یا پھر وہ کہتے ہیں "ہمیں ان کے واقعات کے تجزیے سے اختلاف ہے۔ لیکن ہم ایک لمحے کے لیے بھی اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ انھیں سچائی کا کس قدر خیال ہے۔" مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس مختصر سے انسان سے خوفزدہ ہیں کہ کسی لمحے بھی وہ خلا سے نمودار ہو جائے گا اور انھیں مار ڈالے گا۔

میں ان لوگوں کے نقش قدم پر نہیں چلوں گا۔ میرے پاس مسٹر گاندھی کے لیے کوئی اگربتی نہیں، ماسوا اس ذرا سے ٹکڑے کے جو انسان نہ چاہتے ہوئے بھی کسی دوسرے ڈکٹیٹر کے بدنما پیروں میں پھینکتا ہے، اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کا ناراضگی کے ساتھ اعتراف کرنے کے لیے۔ گاندھی نے ایک نہایت خطرناک لمحے میں برطانیہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا فیصلہ کیا، جو فرانس پر، ایک ایسے وقت جب اس کی فوج ہتھیار ڈالنے کے قریب تھی، میسولینی کے حملے سے بہت مشابہ ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر گاندھی ایک مثالی ہندو سیاست دان کے سوا کچھ بھی نہیں تھے۔ وہ بے انتہا خوشامد پسند، تنگ نظر، جاہل اور دوسروں کی بات برداشت نہ کرنے والے شخص ہیں۔ اس بات کو بہت اچھالا گیا ہے کہ انھیں سچائی کا بہت خیال تھا۔ اس سلسلے میں میں ان سے صرف یہ کہوں گا کہ وہ ڈکشنری میں اس لفظ کا مطلب دیکھ لیں۔ اس کے بعد اگر وہ دانا ہیں، تو اس موضوع کو تیزی سے تبدیل کر دیں گے۔

میں اس موضوع کو تبدیل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ مجھے علم ہے کہ گاندھی کے چیلے میری اس کتاب کو اپنے حملوں کا نشانہ بنائیں گے۔ لہٰذا ہم اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر لمحہ بھر کے لیے یہ بھی دیکھتے چلیں کہ گاندھی نے مدر انڈیا (Mother India) پر کس طرح کے حملے کیے تھے کیونکہ انھیں یہ کتاب پسند نہیں آئی تھی۔ جب مدر انڈیا شائع ہوئی تو اس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کی گھن گرج روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور اس طوفان کے اُترنے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ گاندھی کو اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا۔ انھوں نے کتاب کے بارے میں ساڑھے چھ کالم کا تبصرہ لکھا جو "دی ڈرین انسپکٹرز رپورٹ" (The Drain Inspector's Report) کے عنوان سے شائع ہوا۔ ایک ایسا شخص جس کو "سچائی" کا اس قدر زیادہ خیال ہو، اس کے قلم سے ان الفاظ کا نکلنا کچھ بھی نہیں تو حیرت انگیز ضرور ہے۔[1] انھوں نے نہایت جذباتی الفاظ میں اس کتاب کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے۔ یہ کتاب "جھوٹ در جھوٹ" پر مبنی ہے۔

"میرے خلاف ایک جرم ہے" .... اور میں امریکی اور برطانوی باشندوں کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب پر ہرگز یقین نہ کریں۔"

انھوں نے سب سے زیادہ سخت تنقید کتاب کے اس حصے پر کی جو ان کے ایک انٹرویو کے بارے میں ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے دنیا کے نام ایک پیغام دیا تھا۔ "مجھے کچھ یاد نہیں" کہ میں نے ایسا پیغام دیا تھا جیسا کہ مس میو (Miss Mayo) نے مجھ سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت صرف ایک شخص موجود تھا جس نے میرے نوٹ لیے تھے اسے بھی قطعاً یاد نہیں ہے کہ میں نے وہ باتیں کہی تھیں جو اس کتاب میں مجھ سے منسوب کی گئی ہیں۔"

بدقسمتی سے .... بلکہ ہندو جارج واشنگٹن کے لیے نہایت بدقسمتی سے اس امر کا ناقابلِ تردید تحریری ثبوت موجود ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پیغام، جو گاندھی اور ان کے ساتھی یک دم، اور اتنی آسانی سے بھول گئے، نہ صرف دیا گیا تھا بلکہ اس پر نظرثانی بھی کی گئی تھی، گاندھی نے خود اس کے متن کی منظوری دی تھی، ان کے سیکریٹری نے اسے ٹائپ کیا تھا۔ گاندھی نے اس پر دستخط کیے تھے، اور پھر ایک خط کے ہمراہ اسے مصنفہ کے نام روانہ کیا تھا اور شومئی قسمت دیکھیے کہ یہ خط "Dear Friend" کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔

---

(۱) اس واقعے کی مکمل تفصیلات کے لیے دیکھیے: After Mother India، مصنف Harry H Field، (Jonathan Cape, London)

اور ہم سے اُمید رکھی جاتی ہے کہ ہم ان تمام باتوں کے بعد اس امر پر یقین کر لیں کہ گاندھی کو یاد نہیں رہا۔ اچھا چلیں ہم یہ بھی مان لیتے ہیں، لیکن اس قدر آسانی سے بات کو بھول جانے کے بعد "Washington Stakes" کے لیے ان کا دعویٰ بہت کمزور پڑ جاتا ہے۔ (۱)

"The Drain Inspector's Report" میں، جو گاندھی کے تصورِ حق کے طلبہ کے لیے عجائب گھر میں رکھے جانے کے قابل ہے، انھوں نے اور بھی بہت سارے غلط بیانات دیے ہیں۔ ان بیانات میں انھوں نے نہ صرف مس میو کو چیلنج کیا ہے بلکہ خود تاریخ کو بھی چیلنج کیا ہے۔ مس میو کی کتاب کا سب سے زیادہ پُر اثر حصہ وہ ہے جس میں انھوں نے پرنس آف ویلز کے بمبئی پہنچنے پر شاندار استقبال کا ذکر کیا ہے۔ تمام اخبارات، نہ صرف ہندوستان بلکہ امریکہ اور برطانیہ کے اخبارات اس استقبال کے حالات اور تصاویر سے پُر تھے۔ وہ استقبال اس قدر شاندار تھا کہ اس سے ایک عمدہ نیوز سٹوری تیار کی جا سکتی تھی۔ ٹائمز آف انڈیا نے، جس کو ایک غیر ذمہ دار اخبار نہیں کہا جا سکتا، اور جو ان تین اخباروں میں شامل تھا جن کا مسٹر گاندھی روز مطالعہ کرتے تھے، اس واقعے کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

''پولیس تقریباً بے بس ہو گئی تھی۔ اس کے لیے اُس ہجوم کو روکنا ممکن نہ تھا جو شہزادے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی رگوں میں شاہی خون تھا اور بادشاہ الہیاتی طاقتوں کا حامل ہوتا ہے، ٹریفک کا سارا نظام معطل ہو گیا تھا۔ ہجوم نے ان کی کار کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور تالیاں بجائی، اور نعرے لگانے شروع کر دیے۔ تالیوں کی اس قدر آواز بمبئی میں اس سے پہلے کبھی نہیں سُنی گئی ہوگی۔ یہ عالم تھا کہ گاندھی کیپ پہننے والے بھی، اپنی ٹوپیاں بے ساختہ ہوا میں لہرا رہے تھے۔ شہزادے سے محبت اور ان کے ساتھ وفاداری کے اس مظاہرے میں موٹروں والے امیر لوگ، چیتھڑوں میں ملبوس غریب، ہندو، مسلمان، پارسی، یورپین سبھی لوگ شامل تھے۔ ہجوم اتنا زیادہ تھا کہ شہزادے کی موٹر کار نے آخری سو گز کا فاصلہ کوئی دس منٹ میں طے کیا۔

(۱) اس تباہ کن خط کی فوٹو، جس پر گاندھی کے دستخط بھی ہیں "آ فنر مدر انڈیا" کے صفحہ ۲۹ پر چھپی ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں مصنف کا کہنا ہے کہ "مسٹر گاندھی کی درخواست پر، جو مجھے ان کے ایک کارندے نے اس انٹرویو کے بعد پہنچائی تھی، گاندھی کا پیغام، ٹائپ کرنے کے بعد ان کے پاس دوبارہ بھیجا گیا تھا تا کہ وہ اس پر نظرِ ثانی اور کسی طرح کی وضاحت کرنا چاہیں تو کر لیں۔ کچھ عرصے بعد مس میو کو اس کی ٹائپ کی ہوئی کاپی، جسے گاندھی نے درست قرار دیا تھا، اور جسے انھوں نے خود دوبارہ ٹائپ کرایا تھا، ایک خط کے ساتھ موصول ہوئی تھی۔"

جس وقت یہ غیر معمولی واقعہ پیش آیا، اس وقت ساری دنیا کے کیمرے شہزادے کے دورے کے اس نقطۂ عروج پر فوکس ہوئے ہوئے تھے .... لیکن گاندھی نے اپنے چھوٹے چھوٹے مگر تیز کان زمین کے ساتھ لگائے ہوئے تھے اور ان کی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھیں اُفق کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کے کان ذرا ذرا سی آہٹوں پر اور آنکھیں شہزادے کی ہر نقل و حرکت پر لگی ہوئی تھیں۔ کس لیے؟ کیونکہ وہ شاہی آمد کے بائیکاٹ کا منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ لہٰذا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انھیں اس استقبال کا علم نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہمیں یہی باور کرانا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں وہ ان واقعات کو یکسر مسترد کر دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> ''وہ ایک استقبال کا بیان کرتی ہیں جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ یہ پرنس آف ویلز کا استقبال تھا لیکن ہندوستان کو اس استقبال کا کوئی علم ہی نہیں ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ یہ استقبال کیا گیا ہوتا اور ہمارے علم میں نہ ہوتا۔''

لہٰذا اس موقعے پر گاندھی کی بات پر یقین کرنے کے لیے ہمیں یہ فرض کرنا ہوگا کہ انھیں یا تو لمبے عرصے تک بے ہوش رکھنے کی دوا دے دی گئی ہوگی یا پھر وہ کسی طویل مراقبے میں ہوں گے۔

گاندھی ہندوؤں کا ایک روایتی حربہ استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے مخالف کے منہ میں ایک ذرا سا لفظ ڈال کر اسے جھوٹا قرار دیتے ہیں (میں نے ایک باب میں جس کا عنوان ہے "اخبار نویس" ان کی اس عادت کا تذکرہ کیا ہے)۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی طرف سے ایک لفظ "ہمیشہ" کا اضافہ کر دیا۔ مسٹر گاندھی کا کہنا ہے "انھوں نے میرے ساتھ ملاقات کا بھی تذکرہ کیا ہے اور اپنے قاریوں کو بتایا ہے کہ میرے پاس ہمیشہ دو سیکریٹری ہوتے ہیں جو میرے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ لکھ لیتے ہیں .... ان کا یہ بیان سچ پر مبنی نہیں ہے۔"

شاید یہ بیان سچ پر مبنی نہ ہو...... لیکن مس میو نے کبھی ایسا بیان دیا ہی نہیں۔ یہ بیان تو مسٹر گاندھی نے دیا ہے۔ اس میں "ہمیشہ" کا لفظ ان کی اپنی ایجاد ہے۔ مس میو نے نہایت شائستگی سے مسٹر گاندھی کو ایک خط لکھا اور ان کی توجہ اپنے لکھے ہوئے لفظوں میں اس نازک ردوبدل کی جانب مبذول کرائی۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ گاندھی نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''دی ڈرین انسپکٹرز رپورٹ'' کے بارے میں میں پھر کہتا ہوں کہ یہ گاندھی کے ذہن کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں کے لیے عجائب گھر میں رکھا جانے والا ایک نمونہ ہے، یہ بات ٹالنے، دھوکا دہی اور

جھوٹی باتیں دوسروں سے منسوب کرنے کا ایک شاہکار ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی نمائندہ تحریر ہے جو ''سچ'' کے لفظ کی اس قدر گردان کرتا ہے کہ بالکل طوطا لگنے لگا ہے اور جس نے دنیا کو یہ غلط تاثر دے رکھا ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے جو تاج پہن رکھا ہے، اس میں جھوٹے کام کی چمک نہیں بلکہ وہ خدا کے نور کا ہالہ ہے۔

۲

لیکن ہم یہاں گاندھی پر ایک انسان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے بحث کریں گے، اور اس فاشٹ تنظیم، کانگریس کا جائزہ لیں گے جسے انھوں نے تخلیق کیا ہے، اور جو ان کی انگلیوں پر ناچنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔

معاصر تاریخ ایک عجیب و غریب تضاد کا شکار ہے، کانگریس مغرب کے آزاد خیال لوگوں کی پسندیدہ جماعت ہے۔ اگر ان لوگوں کو بتایا جائے کہ وہ خود بھی فاشیوں کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں تو وہ خوف کے مارے بے ہوش ہو جائیں گے۔ لیکن یہ بات سچ ہے کہ جدید دنیا میں کانگریس وہ واحد جماعت ہے جو خالص فاشزم کے اُصولوں پر، کوئی سمجھوتہ کیے بنا، سو فی صد عمل پیرا ہے۔

سب سے پہلے یہ کہ کانگریس اصولاً فاشزم پر عمل کر رہی ہے۔ نازیوں کا یہ دعویٰ کہ ان کی نسل سب سے بہتر ہے، اور اس کو خالص رکھنا بہت ضروری ہے، برہمنوں کے اس دعوے کی ہو بہو تصویر ہے کہ برہمنوں کی ذات سب سے اونچی ذات ہے اور ذات پات کے نظام کو ہمیشہ قائم رہنا چاہیے جس طرح ہر نازی خود کو دوسروں سے بالاتر ایک سپر ہیرو تصور کرتا ہے۔ اسی طرح ہر برہمن خود کو ''بھودیوا'' تصور کرتا ہے، جس کے معنی ہیں ''زمین پر خدا'' اور کانگریس عملی طور پر برہمنوں ہی کی جماعت ہے۔

دوسری بات یہ کہ کانگریس عملی طور پر بھی ایک فاشٹ تنظیم ہے۔ اس میں گاندھی کی ڈکٹیٹرشپ چلتی ہے۔ اس سلسلے میں ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کو نمائندہ مثال قرار دینا بہت دشوار ہے۔ شاید اس کی سب سے واضح مثال برطانوی حکومت کی جانب سے ذمہ دار صوبائی حکومتیں قائم کرنے کی کوششوں پر گاندھی کا ذاتی غصہ ہے۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت صوبائی حکومتوں کو بڑی حد تک خود مختاری دی گئی لیکن کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے جس پر گاندھی کا غلبہ ہے، اس ایکٹ کو نامنظور کر دیا۔ کیونکہ وہ صوبائی حکومتوں کو گاندھی کی مرضی کے تابع رکھنا چاہتی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح اٹلی میں کارپوریشنیں مسولینی کے تابع ہیں۔ ان حکومتوں میں سے کوئی آزادی کے بارے میں سوچتی بھی تو اس کو فوراً

برطرف کر دیا جاتا۔

تیسری بات یہ کہ کانگریس خود اس کا اعتراف کرتی ہے کہ وہ ایک فاشٹ تنظیم ہے جس کے بعد اُن مغربی آزاد خیالوں کا رویہ اور بھی عجیب و غریب دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ پھر سے اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے۔ جس طرح بہت سے لوگ ''مین کیمف'' (Mein Kamph) کو اس نظر سے نہیں دیکھتے، جس طرح وہ نظر آتی ہے، اور اپنے آپ کو اس بات کا پابند کر لیتے ہیں کہ یہ دنیا کے لیے ایک الٹی میٹم ہے، بالکل اسی طرح وہ لوگ کانگریس کے کھلے اعلانات کو اس شکل میں تسلیم نہیں کرتے جس میں وہ پیش کیے جاتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کانگریس کی آوازیں ایک نہیں دو ہیں۔ ایک مشرق کے لیے دوسری مغرب کے لیے۔ اور ان میں سے مغرب کے لیے آواز نرم تر ہوتی ہے۔

آیئے اب ہم اپنے اس بیان کو کہ کانگریس خود فاشٹ تنظیم ہونے کو تسلیم کرتی ہے، ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

میرے سامنے ایک کتاب ہے ''دی آئرن ڈکٹیٹر'' (The Iron Dictator) اس کے گرد پوش پر ایک نہایت شورش انگیز تصویر بنی ہوئی ہے، جس میں ایک خونخوار چہرہ اُسی تصنع کے ساتھ نظر آ رہا ہے جو میسولینی (Mussolini) اس وقت اختیار کرتا تھا، جب وہ چاند کو فتح کرنے کی شیخیاں بگھار رہا ہوتا تھا۔ یہ تصویر ایک پورٹریٹ ہے۔ بڑی اچھی پورٹریٹ، اس شخص کی جو اس کتاب کا موضوع ہے، سردار پٹیل۔

سردار پٹیل کانگریس کے صدر ہیں۔ جان گنتھر (John Gunther) نے انھیں ''کانگریس کا جم فارلے (Jim Farley) اور پارٹی کو قابو میں رکھنے والا بے رحم تنظیم کار'' قرار دیا تھا۔ کتاب کے مصنف نے یہ عنوان بڑے فخر سے پیش کیا ہے اور اس کے ساتھ اپنا تحتی عنوان بھی شامل کیا ہے۔ ''گاندھی کا عظیم ترین جرنیل'' یہاں ''جرنیل'' کا لفظ قابلِ غور ہے۔ ایک دھیمی آواز والے امن کے پیامبر کے نام کے ساتھ ''جرنیل'' کا لفظ سُن کر یقیناً آپ کو بھی حیرت ہوئی ہوگی۔ گاندھی، جم فارلے، پارٹی کا سربراہ، جرنیل یہ سب ایک کشتی میں کس طرح سوار ہو سکتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے۔

ہندوستان میں ''دی آئرن ڈکٹیٹر'' کی بڑی مانگ ہے۔ تقریباً ہر بک سٹال پر یہ کتاب دستیاب ہو جاتی ہے۔ کانگریس کے پُرجوش حامیوں نے مجھے کئی بار اس کتاب کو پڑھنے کی سفارش کی۔ یہ کتاب کانگریس کے ذہن کی تقریباً اسی طرح ترجمانی کرتی ہے جس طرح روزن برگ کی تھیوریاں، نازیوں کے فلسفے کی نمائندہ

تصور کی جاتی ہیں۔

ہم اس کتاب کو کھول کر صفحہ ۹۳ پڑھتے ہیں جس میں اس بات کی تفصیل درج ہے کہ "گاندھی کا یہ عظیم ترین جرنیل" اپنے سیاسی حریفوں سے کس طرح نمٹتا تھا جو لوگ کانگریس کی پارٹی لیڈر شپ کے کہنے پر چلنے میں ذرا سا تامل دکھاتے ہیں۔ اُن کا سب یہی حشر ہوتا ہے۔ یہاں ان کا دشمن بمبئی کا ایک مشہور وزیر نریمان تھا؛ جو پٹیل کے خیال میں کچھ زیادہ ہی نظریات پسند تھا۔ لہٰذا پٹیل نے اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ کتاب کا مصنف لکھتا ہے۔ (ظاہر ہے کہ پٹیل سے منظوری لینے کے بعد)۔

> "پٹیل کا طریق کار جمہوریت پر مبنی نہیں تھا بلکہ جمہوریت کے خلاف ردعمل تھا جو شخص بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے، اس کو ختم کرنا بہت ضروری ہے.......... جو شخص ان کی بات کو تسلیم کرتا وہ ان کی تنظیم کا حصہ بن جاتا لیکن ان کے ساتھ اختلاف کرنے والے کو وہ نکال دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مخالفوں کو ہمیشہ نہایت بے رحمی سے، مگر احتیاط کے ساتھ راستے سے ہٹا دیا۔"

بے رحمی اور احتیاط ان دو لفظوں کا ایک ساتھ نامبارک استعمال اس سے پہلے کہاں سنا تھا؟ کیا اس سے ہٹلر کی زندگی کا کوئی واقعہ تو آپ کے ذہن میں نہیں اُبھرتا؟ ہم بھول گئے تو مصنف خود ہمیں یاد کرا دیتا ہے۔

نریمان نہ صرف پٹیل کے نظریات سے اختلاف رکھتا تھا بلکہ (جرمنی کے) دھاوا بولنے والے فوجیوں ارنسٹ (Ernst) اور روہم (Roehm) کی طرح اس کے پٹیل کے ساتھ ذاتی اختلاف بھی تھے۔ دھاوا بولنے والی فوج کے ان رہنماؤں کو ہٹلر نے گولی سے اُڑا دیا تھا لیکن نریمان کو گولی نہیں ماری گئی، انھیں صرف راستے سے ہٹا دیا گیا۔

بڑے کام آنے والے الفاظ میں "راستے سے ہٹا دیا گیا" جوں جوں ہم کانگریس کے طریق کار کی تفتیش میں آگے بڑھیں گے ہمارا واسطہ ان الفاظ کے ساتھ پڑتا رہے گا۔

اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ ہم نازیوں کی ڈکٹیٹر شپ اور کانگریس کی ڈکٹیٹر شپ میں مشابہت کو نظرانداز نہ کر جائیں، مصنف کھلے الفاظ میں لکھتا ہے "ان دونوں میں کبھی نظریاتی اختلاف نہیں رہا۔ فرق صرف طریق کار اور ان چیزوں کے بارے میں ہے جن پر زور دینا ضروری ہوتا ہے۔" اس کے بعد وہ اس کی مثال پیش کرتے ہیں اور پٹیل کے سب سے مشہور حریف (سبھاش) چندر بوس کا قصہ بیان کرتے ہیں۔

"پٹیل اور بوس میں اتنا ہی اختلاف تھا جتنا ہٹلر اور روڈولف ہس (Rudolf Hess) میں۔

ان دونوں حضرات میں سے ہم میں سے زیادہ تر لوگ، بے دلی سے سہی ہس (Hess) کے حق میں ووٹ دیں گے۔ لیکن ہم کانگریس کے رکن تو نہیں ہیں۔

اس بلند و بالا، لڑائی پر آمادہ، بے رحم سیاست دان کی صحیح تصویر پیش کرنے کے لیے، جو گاندھی کا سب سے بڑا رفیق کار بھی تھا، ہمیں اس ساری کتاب کو حوالے کے طور پر پیش کرنا پڑے گا۔ انھوں نے اپنی شخصیت اور ایک ذمہ دار سیاست دان ہونے کا اظہار، صرف ایک جملے میں کیا ہے جو انھوں نے اپنی گرفتاری سے کچھ دیر قبل کہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کرپس مشن (Cripps mission) ہندوستان کے دورے پر آیا ہوا تھا۔ اس وقت جاپانی فوجیں طوفان کی طرح ہندوستان کی سرحد کی جانب بڑھ رہی تھیں اور ہندوستان کی سرحدوں کے اندر بہت سی مخالفانہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ "آرام سے لیٹ جاؤ تاکہ وہ ہمیں اپنے پیروں تلے کچل سکیں۔" "اُٹھو اور لڑو"؛ "مقابلہ کرو"؛ "مقابلہ نہ کرو"۔ بے چارہ کرپس، کیا کرتا۔

تب ان تمام آوازوں سے بلند تر ایک آواز اُبھری۔ پٹیل کی آواز۔ کانگریس کے آخری عظیم اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے یہ زوردار تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ "برطانیہ کسی بھی طاقت کو اقتدار منتقل کر دے۔ مسلم لیگ کو، ہندو مہاسبھا کو، حتیٰ کہ ڈاکوؤں اور مجرموں کو بھی۔ ہم ڈاکوؤں کی حکومت کو برطانوی حکومت پر ترجیح دیں گے۔"

ان کی تقریر کا لہجہ ہو بہو گوئرنگ (Goering، جرمنی کے نازی وزیر) کے لہجے سے ملتا تھا اور اس پر عوام کا جوش و خروش بھی اسی طرح کا تھا، جیسا نازیوں کا ہوتا تھا۔ برطانیہ کے وہ نیک نیت، جذباتی لوگ، جو ساری دنیا میں اپنے وطن کے چہرے پر کالک ملتے ہیں، اس بات پر شاید کچھ نہ کچھ پریشان ضرور ہوئے ہوں گے کہ ان کو ڈاکوؤں سے بھی کمتر سمجھا گیا ہے۔ ڈاکو تو لوگوں کا گلا کاٹتے ہیں، بچوں کو گلا گھونٹ کر مار دیتے ہیں، اندھیرے میں عورتوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور چھپ کر چوریاں کرتے ہیں۔ ہمیں اُمید تھی کہ سر سٹیفرڈ کرپس (Sir Stafford Cripps) ان باتوں سے بالاتر ہوں گے۔ لیکن ہندوستان کے چیمپئن .... مسٹر سورن سن (Sorenson) رکن پارلیمنٹ اور "بے باک ناول نگار" مس ایتھل مینن (Miss Ethel Mannin) کا خیال شاید اس سے مختلف ہے۔

ویسے یہ کتنے افسوس کی بات ہے۔

لیکن انھوں نے شاید پٹیل کو اس طرح گرجتے ہوئے سنا ہی نہ ہو۔ ڈاکوؤں کے لیے اُن کی محبت کی خبر ان تک پہنچی ہی نہ ہو۔ پٹیل کی تقریریں عام طور پر شائع نہیں ہوتیں۔ کم از کم مغرب کے آزاد خیال اخباروں میں۔ کانگریس کا پروپیگنڈا کرنے والے (جو گوئبلز[1] کو بھی سبق سکھا سکتے ہیں) اس بات کا پورا اہتمام کرتے ہیں کہ اخبارات، خصوصاً مغرب کے اخبارات میں کوئی اس طرح کی خبر شائع نہ ہونے پائے۔ کیونکہ اگر گاندھی کو اپنے عظیم ترین جرنیل جیسے خونخوار نظر آنے والے شخص کے ساتھ دکھایا جائے، تو اس سے گاندھی کی شخصیت کے بارے میں غلط تاثر پیدا ہوگا۔ لہٰذا گاندھی کی تصاویر ہمیشہ بکریوں کے ساتھ، چھوٹے بچوں کے ساتھ، کسی تالاب کے کنارے جس میں کنول کے پھول کھل رہے ہوں، کھینچی جاتی تھیں کیونکہ یہ بے زبان چیزیں، گاندھی کے حقیقی روپ کی غمازی نہیں کرسکتی تھیں۔

۳

ہندوستان میں فاشزم کے آثار اتنے نمایاں ہیں کہ اگر آپ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں تو آپ کو ہر جگہ، فاشسٹ ممالک اور ہندوستان میں ناقابلِ تردید حد تک مشابہت نظر آئے گی۔ اس کے لیے کانگریس کے ریکارڈ یا اس کے حربوں کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ان کی وردی کا مسئلہ ہی لے لیجیے۔ آپ کو نظر آجائے گا کہ ہندوستان کی کھدر دھوتی اور گاندھی کیپ، نازیوں کی قمیص اور سواس تیکا کا چربہ ہیں۔ کانگریس کی تمام تقریبات میں کوئی قدامت پسند کانگریسی اس کے سوا کسی اور لباس میں نظر نہیں آئے گا۔ خواہ وہ مغرب کا تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ ذاتی طور پر دھوتی کو ایک گھناؤنا اور شرمناک لباس سمجھتا ہو، جس کو پہن کر اپالو بیلڈ ویر (Apollo Belrvedere) بھی ایک چڑی مار نظر آتا ہے۔ لیکن ایک کانگریسی اس روایت کے ساتھ چپکا رہتا ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دھوتی اس کے ساتھ چپکی رہتی ہے اور برسات کے موسم میں تو نہایت بُری طرح چپکتی ہے۔

شمال مغربی سرحدی صوبے میں گاندھی کا ثانی، ایک نہایت لمبا تڑنگا شخص خان عبدالغفار خان ہے۔ ہندوستان میں اس کا نام ہی "سرحدی گاندھی" مشہور ہے۔ جب وہ کانگریس کے ساتھ شامل ہوا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے تمام پیروکاروں کو سرخ قمیص پہنا دیں۔ سرحدی گاندھی کے ان سرخ پوشوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ نرم مزاجی اور عدم تشدد کے اوتار ہیں۔ لیکن جس وقت چھ چھ فٹ کے یہ مذہبی

(۱) گوئبلز (Goebbels) نازی جرمنی میں پروپیگنڈے کا انچارج وزیر۔ (مترجم)

دیوانے، ہزاروں کی تعداد میں، چند پریشان حال انگریز پولیس والوں کے سامنے، جن کے پاس بانس کے ڈنڈوں کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں ہوتا، ڈٹ کر بیٹھ جاتے ہیں، تو اس وقت ان کی نرم مزاجی کی اہمیت صرف نصابی رہ جاتی ہے۔

ہندو بھی کانگریس کے جھنڈے کو، جس میں تین رنگ ہوتے تھے، سبز، پیلا اور سفید، اُسی جوش سے سلام کرتے ہیں جس طرح جرمنی میں سواس تیکا کو۔ حالانکہ یہ صرف ایک پارٹی کا جھنڈا ہے۔ مسلمانوں نے کئی بار اس جھنڈے کو اتنے ہی غیض وغضب کے ساتھ پھاڑ کر پھینکا ہے، جس طرح جرمنی میں کمیونسٹوں نے سواس تیکا کو پھاڑ کر پھینکا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مغرب کے چند گمراہ لوگ کانگریس کے ترنگے کو ہندوستان کا جھنڈا سمجھتے ہیں۔

ہندوستان میں "گاندھی جی" کا لفظ، جرمنی کے "ہیل ہٹلر" کا متبادل شمار ہوتا ہے۔ "جی" کا لفظ، ویسے تو پیار کی علامت ہے، لیکن آج کل یہ ہندوؤں کی قدامت پسندی کا نشان بن گیا ہے۔ جرمنی میں اگر کوئی شخص "ہیل ہٹلر" نہ کہے تو وہ اپنے لیے مصیبت مول لیتا ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں گاندھی کے نام کے ساتھ اگر آپ "جی" کا لفظ شامل نہ کریں تو آپ کی شامت آجاتی ہے۔

ابھی چند روز پہلے میں کچھ ہندوستانی طلبہ سے خطاب کررہا تھا۔ میں نے گاندھی کو گاندھی کہا تو ہجوم کی مشتعل آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ "گاندھی جی گاندھی جی!" .... لیکن میرے پاس ان کی بات کا صحیح جواب موجود تھا۔ میں نے کہا کہ سر ونسٹن چرچل، میرے رہنما ہیں میں ان کو اتنا بڑا انسان تصور کرتا ہوں کہ انھیں صرف "چرچل" کے نام سے یاد کرتا ہوں اور میں نے گاندھی کو بھی یہی خراج تحسین پیش کیا ہے۔

لیکن میرے اس خراج تحسین کو پسند نہیں کیا گیا۔

"گاندھی اور ہٹلر میں بہت ساری چیزیں مشابہ ہیں......"

جنوری ۱۹۴۱ء میں جرمنی ریڈیو نے ریسن سے ہندوستان کے لیے خاص پروگرام نشر کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ "جرمنی کے عوام، مہاتما گاندھی کی بھی اتنی ہی عزت کرتے ہیں جتنی ایڈولف ہٹلر (Adolf Hitler) کی۔ ہر ہٹلر (Herr Hitler) کے بھی وہی اصول ہیں جو مہاتما گاندھی کے ہیں۔ ...."[1]

(۱) یہ بات میں نے کتاب "آزادی یا فاشزم" سے نقل کی ہے جو ہندوستان کی ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی نے نئی دہلی سے ۱۹۴۲ء میں شائع کی تھی۔

لیکن اس بات کو زیادہ سنجیدگی سے لینے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہٹلر اپنی سہولت کے مطابق مارکس یا ٹالسٹائی کے اُصولوں کو بھی اپنے اصول قرار دے سکتا ہے اور ہمیں اس بات کے لیے ہٹلر سے گواہی لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ان دونوں ڈکٹیٹروں کے درمیان اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ اس پر زور دینا بیکار ہے۔

ساری دنیا ہٹلر کی زندگی کے اس واقعے سے واقف ہے، جب وہ عوام کے پیار سے بچ کر (جن کے لیے اس نے اپنی گہری نفرت کا برملا اظہار کیا تھا) برچ ٹیس گاڈن (Berchtesgaden) میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ وہاں انھوں نے تنہائی میں خوشی حاصل کی اور اپنی مشہور زمانہ ''جبلتوں'' کی چھوٹی سی آواز سنی، جس کو بعد میں انھوں نے اُن احکام میں تبدیل کر دیا، جن کی تعمیل لازمی تھی۔

اب آپ ہٹلر کی اس تصویر کا موازنہ ذیل کی تحریر سے کیجیے۔

رومین رولینڈ (Romain Rolland) جو گاندھی کی نہایت جذباتی انداز میں وکالت کرنے والوں میں سے ایک ہیں، لکھتے ہیں: ''مہاتما، عوام سے، جو اُن سے محبت کرتے ہیں، بہت تنگ آئے ہوئے ہیں۔ دراصل وہ لوگوں کی بڑی تعداد پر یقین ہی نہیں کرتے۔ وہ تنہائی میں خوش رہتے ہیں، کیونکہ وہ اس میں وہ چھوٹی سی آواز سن سکتے ہیں جو انھیں احکام جاری کرتی ہے۔

لوگوں کی تعداد پر یقین نہ رکھنا۔ تنہائی میں پناہ حاصل کرنا، ایک پاک ''آواز'' اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے کی ضرورت۔ یہ رجحانات ہمیں کس منزل کی طرف لے جاتے ہیں؟ جمہوریت یا فاشزم۔ اس سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں وہ تو صاف ظاہر ہے۔

گاندھی کئی بار یہ کہہ چکے ہیں کہ ''خدا نے مجھے اپنے آلۂ کار کے طور پر چنا ہے۔'' گاندھی نے یہ بات ایک بار نہیں کئی بار کہی ہے۔ [1] اسی طرح ہٹلر اور مسولینی نے بھی کہا ہے۔ لیکن چرچل یا روزویلٹ (Roosevelt) کے بارے میں یہ بات ریکارڈ پر نہیں ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی ایسا دعویٰ کیا ہو............ لیکن ہم میں سے زیادہ تر لوگ خاموش رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ ان سمجھدار سیاست دانوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، جو خدائی کا دعویٰ کرتے ہوں اور خود گاندھی بھی اس بات کو تسلیم کریں گے کہ وہ نہایت سمجھ دار اور ہوشیار سیاست دان ہیں............ لیکن وہ اس بات کو اپنے انداز میں بیان کریں گے۔

(۱) ملاحظہ ہو ''گاندھی ان انڈیا - این انتھالوجی (Gandhi in India - An anthology) مطبوعہ ترپاٹھی لمیٹڈ، بمبئی۔

اس بات پر ان کا اصرار کہ وہ غلطی سے بالاتر ہیں، اس چیز کا واضح ثبوت ہے۔ دنیا بھر کے ڈکٹیٹروں کا پہلا اور آخری جواز یہی ہوتا ہے۔

لوئیس چہاردہم (Louis XIV) نے کہا: 'L'etat c'est moi'.

ہٹلر کہتا ہے: ''جرمن قوم میں ہوں۔''

مسولینی کہتا ہے: ''ڈیوس (Duce) ہمیشہ ''درست ہوتا ہے''

گاندھی کہتا ہے: ''ہندو ذہن میں ہوں۔''

ان تمام باتوں میں کوئی ذرا سا بھی فرق ہے؟ میں وہ واحد شخص نہیں ہوں جو اس سوال کا جواب چاہتا ہو۔ مسلمان بھی اس سوال کا جواب چاہتے ہیں۔ ہندوؤں کے اس سیاسی بت کو جس طریقے سے مافوق الفطرت اہمیت دی جا رہی ہے، اس سے مسلمانوں کے دلوں میں خدشات پیدا ہو رہے ہیں: اگر کسی کو ان خدشات پر شک ہو، اسے میں مسلم لیگ کی چند مطبوعات کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دوں گا۔ مثال کے طور "Nationalism in Conflict in India"، جس میں حالات کا تخلیقی انداز میں نہایت عمدگی کے ساتھ تجزیہ کیا گیا ہے۔ [1] اس میں مصنف نے موجودہ حالات کا ان الفاظ میں تجزیہ کیا ہے:

''نازی تنظیموں اور کانگریس میں اس قدر مشابہت پائی جاتی ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جرمنی میں ہٹلر کی اسی طرح عزت اور اطاعت کی جاتی ہے۔ انھیں ایک ہیرو سے بڑا درجہ دیا جاتا ہے۔ انھیں قوم کا نجات دہندہ بلکہ ایک دیوتا تصور کیا جاتا ہے۔ یہاں مسٹر گاندھی کا یہی حال ہے۔ وہ ہندوؤں کے سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ روحانی گرو بھی ہیں۔ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں جو کچھ بھی کہتا ہوں اس کا اختیار مجھے خدا کی جانب سے ملا ہے۔ ان پر تنقید کرنے والا کوئی شخص کانگریس کا رکن نہیں رہ سکتا۔ بہت سے نمایاں کانگریسی لیڈروں کو اس وجہ سے پارٹی چھوڑنی پڑی کہ ان کی باتیں مہاتما کی طبیعت پر گراں گزری تھیں۔ مسٹر ناریمان، ڈاکٹر کھارے، مسٹر سبھاش چندر بوس، مسٹر رائے اور مسٹر گوپال اچاریہ سب کے سب کانگریس میں بے انتہا بااثر عہدوں پر فائز رہے لیکن کانگریس میں ایک فرد واحد، مسٹر گاندھی کے

(۱) مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس، دریا گنج، نئی دہلی۔ ۱۹۴۳ء

ساتھ اختلاف رائے کے بعد انھیں پارٹی سے نکال دیا گیا۔"

۴

آخر کار بہت تاخیر سے ہندوستان کے چند بہترین دماغوں کو کانگریسی حکومت کے حقیقی خدوخال نظر آنے لگے اور اس کے پیچھے منڈلاتے ہوئے فاشزم کے خطرے کا احساس ہو گیا لیکن شاید یہ سب کچھ بہت دیر سے ہوا۔

جس طرح نازی تحریک کے آغاز میں بہت سارے شایستہ جرمن لوگ بھی اس اُمید میں کہ شاید اس طرح قوم کی تعمیر نو میں مدد مل سکے، تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ بالکل اسی طرح کانگریس کی تحریک کو بھی ابتدا میں بہت سارے معقول ہندوستانیوں کی حمایت حاصل رہی۔ کیونکہ انھیں قرار واقعی یہ توقع تھی کہ اس طرح آزادی........ اور آزادی سے بڑھ کر اتحاد اور سماجی ترقی کی منزلیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔

جب جرمن آزاد خیال نازی پارٹی کی طرف سے بدظن ہوئے تو انھیں دھکے مار کر پارٹی سے نکال دیا گیا اور........ ماسوا ان چند لوگوں کے جو جرمنی سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے........ گولی ماردی گئی۔ جب ہندوستانی آزاد خیال لوگ کانگریس کی طرف سے بدظن ہونے لگے، تو انھیں بھی اسی طرح پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔ لیکن انھیں گولی نہیں ماری جا سکی کیونکہ ہندوستان میں ابھی تک برطانوی قوانین نافذ ہیں۔ ان لوگوں کی آوازیں ہم آج بھی سُن سکتے ہیں۔

آیئے ہم چند آوازیں سنتے ہیں، جو ہندوستانیوں کو فاشزم کی طرف جانے والے اس راستے سے اپنے ہم وطنوں کو خبردار کر رہی ہیں، جس پر چلنے کے لیے ان کے قدم بے قرار ہیں۔

ان میں سے ایک آواز ایم۔ این۔ رائے کی ہے۔

رائے کے لیے ساری پُرانی سیاسی تشبیہات استعمال کی گئی ہیں کبھی انھیں "Stormy Petrel" (ایک چھوٹا سا سمندری پرندہ) کہا گیا، کبھی ایک طفل نادان کا لقب دیا گیا جو دوسروں کی باتیں دہراتا رہتا ہے اور اسی طرح کی دوسری تشبیہات استعمال کی جاتی ہیں۔ ابتدا ہی سے انھیں روس سے گہری دلچسپی تھی۔ انھیں کمیونزم کے تجربے سے گہری دلچسپی تھی اور ان کو یقین تھا کہ وہ تجربہ بعینہٖ ہندوستان میں دہرایا جا سکتا ہے۔ یہ بات تو واضح نہیں کہ انھوں نے روس کو کیوں چھوڑا، اگرچہ یہ بات ظاہر ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس سے بدظن ہو گئے تھے۔ لیکن ہمیں جس بات سے تعلق ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۳۰ء میں وہ ہندوستان کے منظر پر نمودار ہوئے تو

ان کی شخصیت کے گرد سحر اور رازوں کا ہالہ تھا اور یہاں ان کے آتے ہی مخالفت کا ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا۔ شہر کی گردن کے بالوں سے لے کر برہمن کی چوٹی تک سب میں خارش شروع ہو گئی۔

ان کی مخالفت کی دو وجوہ ہیں۔ اوّل تو یہ کہ وہ سو فی صد دیانت دار ہیں اور سو فی صد دیانت دار سیاست دان ہندوستان میں ہیروں سے بھی زیادہ کمیاب ہیں۔ اور دوم یہ کہ وہ ایک سوشلسٹ ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ تمام مذہبی اور سیاسی جنگوں کے پس منظر میں وہ معاشی ڈھانچہ ہے، جو قابل نفرت ہے، کرم خوردہ ہے اور لڑکھڑا رہا ہے۔ وہ اس ڈھانچے کو گرا دینا چاہتے ہیں۔ جبکہ کانگریس اسے مضبوط کرنے کی خواہاں ہے۔

انھیں "ہندوستان کے کارل مارکس" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں ان کے لیے یہ نام بھی اتنا ہی مناسب رہے گا جتنا کوئی نام لیکن ان کی شخصیت میں میں اتنی بجلیاں بھری ہوئی ہیں کہ ان کو کوئی نام دینا، بجلی کے کوندے پر نام کی تختی آویزاں کرنے کے مترادف ہے۔ اپنی اسی شخصیت کا اظہار وہ ایک چھوٹے سے لیکن بااثر گروہ کے ذریعے کرتے ہیں، جو ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انڈی پنڈنٹ انڈیا (Independent India) اس پارٹی کا سرکاری اخبار ہے، جو نئی دہلی سے شائع ہوتا ہے۔ وہ اس اخبار میں شائع ہونے والے مضامین کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھتے رہتے ہیں اور گاندھی ازم، کانگریس اور فاشزم کے درمیان خفیہ معاہدے پر نہایت بے رحمی سے مسلسل وار کرتے رہتے ہیں۔ اس معاہدے کی اگرچہ پرزور تردید کی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قطعاً ناقابل تردید ہے اور دونوں تحریکوں کے بنیادی ڈھانچے میں بسا ہوا ہے۔

وہ کسی شخصیت کو معاف نہیں کرتے۔ ہندوستان کے نمبر دو سیاست دان اور گاندھی کے یقینی جانشین، جواہر لال نہرو کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> "اصولی طور پر فاشزم کا مخالف ہونے کے باوجود، نہرو ہندوستانی فاشزم کے لیڈر کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور مزاجاً اس کام کے لیے ان سے بہتر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک "قوم پرست سوشلسٹ" ہیں، لہٰذا انھیں نہ قوم پرست کہا جا سکتا ہے اور نہ وہ سوشلسٹ کہلانے کے قابل ہیں۔ وہ بین الاقوامیت کا دعویٰ بڑی بلند آواز میں کرتے ہیں جس سے ان کی قوم پرستی کی نفی ہو جاتی ہے اور ان کے قوم پرستانہ جوش و خروش سے ان کے سوشلزم کے دعوے کی تردید ہو جاتی ہے۔ گاندھی اگر

کانگریس کے روحانی گرو ہیں تو نہرو اس کے ایک بااثر لیڈر ہیں، اس طرح گویا وہ
ہندوستانی فاشزم کے لیڈر ہیں۔"[1]

نہرو کے بارے میں اس قسم کی رائے کے اظہار سے ان لاکھوں افراد کو یقیناً دھچکا لگے گا جنھوں نے ان کی خودنوشت داستانِ حیات پڑھی ہے جو سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں کی صف میں شامل ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد نہرو کی جو تصویر ذہن میں اُبھرتی ہے وہ برطانوی سامراج کے ظلم وتشدد کے شکار ایک حساس اور مہذب شخص کی تصویر ہوتی ہے۔

سی آر راجگوپال اچاریہ، ان چند نمایاں سابق کانگریسی رہنماؤں میں سے ایک ہیں، جو ۱۹۴۳ء میں جیل میں نہیں تھے۔ انھوں نے سال کا زیادہ تر حصہ گاندھی اور جناح کے درمیان کسی قسم کی مصالحت کرانے کی ناکام کوشش میں صرف کیا تھا۔ مدراس میں میری "سی آر" کے ساتھ لمبی ملاقات ہوئی اور وہ مجھے نہایت سمجھ دار شخص نظر آئے، ایسے شخص جن کو میں کسی ایسے مقدمے میں، جس میں واقعات کی گول مول تشریح کرنی ہو، یقیناً اپنا وکیل بناتا۔ بلاشبہ وہ برہمنوں سے بڑے برہمن ہیں، شراب نوشی پر پابندی کے دیوانگی کی حد تک حامی، اور گاندھی کے استعاروں کے سب سے قابل تشریح کنندہ۔ انھوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ ان کی گفتگو کو شائع نہ کیا جائے اور میں ان کی رائے کا احترام کروں گا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں ان کی تقریروں کا حوالہ بھی نہ دوں، جو انھوں نے عوام کے سامنے کی تھیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنی ایک حالیہ تقریر میں انھوں نے نہایت کھلے لفظوں میں فریڈرک (Frederick)، فان مولٹکے (Von Moltke) اور ہنڈن برگ (Hindenburg) کے جرمنی کے لیے اپنے احترام کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے نوجوان ہندوستان کے سامنے "جرمن فوج کی سائنسی بنیادوں پر تنظیم کے شاندار نتائج" کی تعریف کی اور سوال کیا کہ اگر جرمنی پہلی جنگ عظیم کے بعد بیدار ہو سکتا ہے، اور اپنی عظمت رفتہ "دوبارہ حاصل" کر سکتا ہے (جرمنی کے نازی غار میں گرنے کو بیان کرنے کا یہ طریقہ بھی عجیب وغریب ہے) تو ہندوستانی قوم پرستی اس کے نقش قدم پر چل کر کیوں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

رائے کا کہنا ہے کہ "گوئٹے (Goethe)، لیسنگ (Lessing) اور بیتھوون (Beethoven) کا جرمنی

(1) ملاحظہ ہو "فریڈم یا فاشزم" (Freedom or Fascism) مصنفہ ایم-این- رائے۔ ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی۔ دسمبر ۱۹۴۲ء۔

نہیں، نہ ۱۸۴۸ء کے باغیوں کا، اور نہ ہی ہیکل (Haeckel)، ہیلم ہولٹز (Helmholtz)، کاخ (Koch)، ورچوف (Virchow) یا پلانک (Planck) کا جرمنی، بلکہ قیصر (Kaisers) اور ہٹلر کا جرمنی ہمیشہ ہندوستانی قوم پرستوں کی محبت کا مرکز رہا ہے۔ اس عجیب وغریب ہمدردی کے برعکس ہندوستانی قوم پرستوں کو، انقلابی روایت کی عظیم سرزمین، فرانس کے ساتھ ذرا بھی ہمدردی نہیں ہے۔"

وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"پرشیا کے باشندوں (Prussians) میں ایک مطلق العنان ریاست کا تصور بہت عام تھا۔ بعد میں ہیگل کی تعلیمات میں ہمیں یہ نظریہ بہت وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ظلم کے فلسفے پر انھوں نے ایثار وقربانی کے اخلاقی حسن سے ملمع کاری کر دی، ریاست کو خدا بنا دیا۔ اس قیاسی چیز کے نام پر لاکھوں انسانوں کو کام کرنا، تکلیفیں اُٹھانا اور آخرکار فنا ہو جانا چاہیے۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ نے ہمارے ملک کے نوجوانوں کے سامنے جو آئیڈیل پیش کیا تھا، وہ ہو بہو یہی تھا۔ ان کے خیال میں جدید جرمن قوم کا احیا اس آئیڈیل کی تکمیل کی نشان دہی کر رہا تھا، اس "روحانی طاقت" کا اندازہ کرنے کے لیے، جو ہندوستانی قوم پرستی کے ایک سکہ بند لیڈر کے خیال میں، جرمنی کو بچا چکی ہے وہ یقیناً ہندوستان کو بھی بچا سکتی ہے۔ انسان کو صرف ہیگل کے مابعدالطبیعیاتی تصورِ ریاست کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے۔ وہ روحانی طاقت، دراصل کوئی اخلاقی دباؤ نہیں بلکہ نہایت منظم شکل میں ایک حیوانی طاقت ہے۔ یہ ہے گاندھی کے عدم تشدد کے عقیدے کا سیاسی نتیجہ۔ ہمیں مسٹر راجگوپال اچاریہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس عقیدے کے دوسرے حصے یعنی راست بازی سے کام لیا ہے۔"

۵

کوئی قابل سے قابل مبصر بھی اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتا کہ گاندھی کس وقت اپنی باتوں میں مخلص ہوتے ہیں اور کس وقت نہیں ہوتے۔ ان کا ذہن مختلف متضاد باتوں اور واہموں کا ایک جنگل ہے جس میں کھوج لگانے والا ہر شخص اپنا راستہ بھول جاتا ہے اور شاید گاندھی کا مدعا بھی یہی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص اپنے طویل سیاسی کیریئر میں مختلف متضاد بیانات دیتا ہے تو اس طرح وہ ہر صورت حال کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اپنے کسی ایک بیان کا حوالہ دے کر کہہ سکتا ہے "میں نے آپ کو پہلے ہی بتایا تھا کہ..........." گاندھی بھی ہر مشکل مرحلے پر یہی حربہ استعمال کرتے ہیں۔[1]

(1) ان کی دوسری قلابازیوں کے لیے، مسلم لیگ کی کتاب "Nationalism in Conflict" کا باب "گاندھی کے دعوے اور کارکردگی" (Gandhi's Professions and Performance) ملاحظہ فرمائیے۔

چلیے ہم گاندھی کو شک کا فائدہ دے دیتے ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ وہ کبھی کبھی واقعی سچ بھی بول لیتے ہیں اور ان کے الفاظ ان کا اصل مدعا بیان کرتے ہیں لیکن اس کے بعد بھی یہ بات ایک ناقابلِ تردید حقیقت بن کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، وہ ہمیں یقیناً بالواسطہ یا براہِ راست، فاشزم کی طرف لے جاتی ہے۔

ان کی اقتصادی پالیسی (اگر اس کے لیے یہ شاندار اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے تو) ہی کو لے لیجیے۔ وہ چرخے سے شروع ہو کر چرخے پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا سارا وجود چرخے پر ہی ہے، جس کو انھوں نے اپنے ''عدم تشدد'' کے تصور کے ساتھ منسلک کر رکھا ہے۔ اگر کسان اپنے گھروں میں اپنے لیے خود کپڑا تیار کرنے لگیں گے، اور ہندو زمینداروں کی ناقابلِ برداشت زیادتیوں کا مقابلہ ''عدم تشدد'' سے کرتے رہیں گے، تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ ہندوستان کی ساری معاشی برائیاں ختم ہو جائیں گی اور ہندوستان خود بخود آزاد ہو جائے گا۔

اگر ہندوستان کے سوا، کسی اور ملک میں کوئی شخص اس طرح کے ناقابلِ عمل خیالات کا پرچار کرتا، تو اس کو مدبر یا ماہرِ اقتصادیات نہیں بلکہ نچلے درجے کا ایک مسخرا شمار کیا جاتا۔ چرخے کے بارے میں ان کا نظریہ اتنا ہی قابلِ عمل ہے، جتنا یہ کہنا کہ اگر امریکہ میں ہر عورت، اپنے شوہر کی جرابیں بننے لگے تو وہاں بے روزگاری کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ چرخے کا ایک بہت چھوٹا سا فائدہ یہ ضرور ہے کہ یہ لنکا شائر کی سوتی کپڑے کی صنعت پر ایک حملہ ہے۔ لیکن اس سے بڑے صنعت کاروں کے لیے کسی قسم کا سنگین خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اس امر سے ظاہر ہے کہ گاندھی کے زبردست حامیوں میں ہندو کارخانہ دار اور ٹیکسٹائل ملوں کے کروڑ پتی مالک بھی شامل ہیں، جن کا منافع زیادہ مزدوروں کے خون پسینے کی کمائی پر منحصر ہے۔ وہ لوگ گاندھی کے پروپیگنڈے سے بہت خوش ہیں جس کا مقصد انگریزوں سے نفرت کے علاوہ ہندوستان کے غریب کسانوں کو یہ باور کرانا ہے، کہ وہ جس حال میں ہیں، بہت اچھے ہیں۔ انھیں بہتر تنخواہ کے لیے ہڑتال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہی انھیں اپنے استحصال کے بارے میں حقیقی واقعات کا کھوج لگانے کی ضرورت ہے۔ ہندو سرمایہ پرستی کے شوریدہ سر ترجمانوں کے لیے اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ ان کے پاس جہالت اور توہم پرستی کے شکار ملازموں کا جو انبوہ کثیر ہے، وہ عدم تشدد کا حامی ہے اور اپنی تمام تکلیفوں کا ذمہ دار انگریزوں کو قرار دیتا ہے۔ ایک فاشسٹ حکمران کے لیے یہ صورت حال جنت سے کم نہیں لیکن ہندوستانی عوام کے لیے گاندھی ازم، بڑے پیمانے پر خودکشی کے

مترادف ہے۔ رائے کے الفاظ میں .... ''گاندھی ازم، ہندوستان کے پسماندہ عوام کی ''ہیرو کو پوجنے'' اس کی اندھی تقلید کرنے، اور جہالت کی پیداوار ہے۔ گاندھی ازم ہمارے عوام کی بدترین صفات، جہالت، بزدلی، احساسِ کمتری اور پسماندگی کا اظہار ہے۔''[۱]

گاندھی کے پروگرام کے دوسرے اہم ستون، ان کی نام نہاد عدم تشدد کی تحریک، کا بھی یہی حال ہے۔ یہ ایک ایسا اصول ہے، جس پر عمل کرنے کا نتیجہ لازمی طور پر ہمیشہ اتنے بڑے پیمانے پر تشدد کے واقعات کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، جن کی پہلے مثال نہیں ملتی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ امنِ عالم کے لیے یہ خطرہ گاندھی کی ایجاد ہے۔ لیکن ہم گاندھی کو اس الزام سے بری کرتے ہیں۔ عدم تشدد کا نظریہ اتنا ہی قدیم ہے جتنے کہ ہندوؤں کے پہاڑ۔ یہ اس تقدیر پسندی، قنوطیت اور منفی سوچ کا ایک حصہ ہے، جس میں سارا ہندو مذہب گرفتار ہے۔ جدید ہندوستان میں اس کی بہترین مثال ہندو قرض خواہوں کا وہ طریقہ ہے، جو وہ ان قرض داروں پر استعمال کرتے ہیں جو قرضے کی رقم واپس نہیں کرتے۔ وہ نہ قانون کا سہارا لیتے ہیں اور نہ ہی مقروض شخص کا مقابلہ کرتے اور اس کی ناک پر مکہ مارتے ہیں۔ وہ صرف مقروض کی دہلیز پر بیٹھ کر گریہ وزاری شروع کر دیتے ہیں، اس اُمید پر کہ شاید اس طرح وہ خود شرمندہ ہو کر ان کا قرضہ لوٹانے پر رضامند ہو جائے۔

شاید گاندھی عدم تشدد کے اس نظریے کا پرچار کرنے میں مخلص ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مخلص نہ ہوں۔ لیکن دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس کا ذہن اس قدر دقیانوسی، اور خیالات خلط ملط ہوں، خلوص کا ہونا یا نہ ہونا، بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں میں ان کی تازہ ترین تعریفوں میں سے ایک ''تعریف'' کا ذکر کروں گا۔ بشرطیکہ ان کے خلط ملط خیالات کے ایک مبہم سے دھبے کو کسی چیز کی تعریف کا لقب دیا جا سکتا ہو۔

> ''اگر کوئی شخص تن تنہا مسلح ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا مقابلہ ایک تلوار سے کر رہا ہو، تو میں کہوں گا کہ وہ شخص ڈاکوؤں کا مقابلہ عدم تشدد سے کر رہا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک چوہیا، بلی کا مقابلہ اپنے تیز دانتوں سے کر رہی ہے تو کیا اس چوہیا پر آپ تشدد کرنے کا الزام لگائیں گے؟ اسی طرح پولینڈ کے باشندوں کا، جرمنی کی فوج کے سامنے، جو تعداد اور طاقت میں ان سے کہیں زیادہ تھی، پولینڈ کے باشندوں کا بہادری سے کھڑا ہو جانا

---

(۱) ملاحظہ ہو ''گاندھی ازم، نیشنلزم، سوشلزم'' (Gandhism, Nationalism, Socialism)، مصنفہ ایم این رائے، بنگال ریڈیکل کلب۔

تقریباً تقریباً عدم تشدد کی ایک مثال تھا۔"[1]

اگر کوئی شخص ہمیں یہ بتا سکے کہ ان الفاظ سے ان کی کیا مراد تھی، بلکہ کیا مراد نہیں تھی، تو وہ یقیناً بہت ذہین شخص شمار ہوگا۔ بظاہر گاندھی اس بات کا تاثر دینا چاہتے ہیں، کہ پولینڈ کی ایک مشین گن پچاس جرمنوں کو قتل کر کے بھی "تقریباً" عدم تشدد کی مثال پیش کرتی ہے" کیونکہ اس کے ساتھ، دوسری مشین گنوں کی تعداد کم تھی یا بالفاظ دیگر اس بات کو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگر اپنے سے بڑی تعداد کے خلاف تشدد استعمال کیا جائے تو وہ خود بخود عدم تشدد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ایک تنقید نگار نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ "یہ نظریہ کسی بھی غیر مسلح بغاوت کے دوران باغیوں کے لیے نہایت معقول مفروضہ ثابت ہوسکتا ہے۔"

واقعی یہ نظریہ بہت معقول ہے۔ عدم تشدد کے پجاری قوم پرستوں کے لیے تو یہ بے پناہ تسلی کا باعث ہے جو پولیس والوں پر عدم تشدد کا پٹرول چھڑک کر اسے "عدم تشدد" کی ماچس سے جلا دیتے ہیں اور ان پُر امن ہجوموں کے لیے بھی جن کی تعداد اگر ایک کے مقابلے میں ایک ہزار ہو، عدم تشدد کے ڈنڈے مار مار کر برطانوی اور کینیڈین لڑکوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔

اور گاندھی اب بھی اپنی پالیسی کا شکار ہونے والوں کی لاش پر مسکراتے ہوئے کہہ سکتے ہیں "آپ کو تو بخوبی علم ہے کہ یہ سب کچھ "تقریباً" عدم تشدد ہے۔"

تاہم گاندھی نے بھی، اپنے قید ہونے سے چند ماہ پہلے، اپنی نقاب ہٹانی شروع کر دی تھی۔ انھیں یقین تھا کہ برطانیہ ختم ہو چکا ہے اور جاپانیوں نے جنگ جیت لی ہے۔ اب وہ ان چھوٹے چھوٹے پیلے رنگ کے لوگوں کی نگاہوں میں رہنے کے متمنی تھے، جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اب وہ ہمارے آقا بننے والے ہیں۔ یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ انھوں نے یہ بات کبھی قبول نہیں کی، کیونکہ وہ ہر بات کرتے وقت ایک آنکھ امریکہ کی طرف بھی رکھتے ہیں اور اگر امریکہ کو ان کو جاپان سے کھلے بندوں مذاکرات کرتے دیکھ لیتا تو ان کے وقار کو بہت سخت دھچکا لگتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ جس حد تک جا سکتے تھے، گئے۔ انھوں نے جاپانیوں کو پیشگی ہی ایک اخلاقی بلینک چیک دے دیا تھا، جسے وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے وجہ جواز

---

(1) یہ بات میں نے Congress Responsibility for Disturbances1942-43 (گورنمنٹ آف انڈیا پریس) سے لی ہے۔

بنا سکتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جاپانی تو صلح کرنے کو ہر وقت تیار ہیں لیکن وہ بادل نخواستہ جارحیت کی جانب مائل ہو رہے ہیں، کیونکہ ہندوستان کا دفاع برطانوی فوجیں کر رہی ہیں۔

"ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی، جاپانیوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔" انھوں نے کہا کہ "ہندوستان سے انگریزوں کا انخلا، اس ترغیب کو ختم دے گا۔"

یا دوسرے الفاظ میں اگر برما اور ہندوستان کی سرحدوں کے درمیان بھی مجنوٹ لائن (Maginot Line)، فرانس اور جرمنی کے درمیان کی سرحد پر فرانس کی دفاعی لائن) ہوتی، اور اس کے دفاع کے لیے پوری طرح مسلح سو ڈویژن فوج ہوتی جس کے ساتھ فضائیہ بھی وافر تعداد میں شامل ہوتی، تو بھی گاندھی اسے پل بھر میں اُڑا کر رکھ دیتے، کیونکہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دے رہی تھی اور ایک بار یہ ترغیب ختم ہو جاتی، اور ہندوستان کے زرخیز کھیت کھلیانوں کا دفاع کرنے کو کوئی شخص باقی نہ رہتا، تو جاپانی، ہندوستان کی سرحدوں کو پار کرنے کی بجائے واپس مڑ جاتے اور لوریاں گاتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس روانہ ہو جاتے۔

اگر گاندھی کا واقعی یہی خیال تھا، تو دنیا کا ہر صحیح الدماغ شخص اس بات کی تردید نہیں کر سکتا کہ ان کا اثر ورسوخ، اقوام متحدہ کے لیے کتنا بڑا خطرہ اور محوری طاقتوں (Axis Powers) کے لیے کتنا کارآمد اور مفید تھا۔ یہاں تک کہ ان کے سب سے بڑے لیفٹیننٹ، جواہر لال نہرو، بھی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے گزشتہ اجلاس میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ گاندھی، انھیں پالیسی کے جس مسودے کو منظور کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں، وہ دراصل محوری طاقتوں کا منشور ہے۔

جواہر لال نہرو نے کہا تھا "اس مسودے کا سارا پس منظر ایسا ہے جو دنیا کو یہ سوچنے پر مجبور کر دے گا کہ ہم محوری طاقتوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اس مسودے کا بنیادی خیال ہی جاپانیوں کی حمایت کرتا ہے۔"

ہندوستان کے نمبر دو لیڈر کے اس اعتراف کے بعد، ان لوگوں کے ذہنی عمل کا ساتھ دینا بہت دشوار ہو جاتا ہے، جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر گاندھی کو رہا کر دیا جاتا تو اس سے "جنگی کوششیں" مزید تیز ہو جاتیں۔ انسان کا جی چاہتا ہے کہ ان سے پوچھے "کس کے خلاف جنگی کوششوں میں۔ جاپان کے خلاف یا اتحادیوں کے۔"

میں دنیا کا آخری شخص ہوں گا، جو جنگ کے کسی حقیقی مخالف یا کسی عدم تشدد کے سچے حامی، کو برداشت کرنے سے انکار کرے۔ لیکن میں کئی تلخ تجربوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ امن کی شاہراہ،

صرف نیک ارادوں سے پختہ نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لیے قوانین کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ شاہراہ صرف نیک نیتی کے رومانوی علاقوں سے نہیں گزرتی، اس کی حفاظت کرنے کے لیے اُصولوں اور پولیس کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ گاندھی کی عدم تشدد کی پالیسی، شروع سے آخر تک، مجھے ایک فراڈ معلوم ہوتی ہے۔ یہ پالیسی ہمیں نہ صرف خونریزی کی جانب لے جاتی ہے (اور گاندھی کو اس کا علم ہے) بلکہ اپنے بنیادی اُصولوں میں بھی قدم قدم پر وحشیانہ اور اندھی طاقت کے ساتھ سینکڑوں سمجھوتے کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

میں نے ابھی کہا تھا، کہ گاندھی نے جیل جانے سے قبل آہستہ آہستہ اپنے چہرے سے نقاب ہٹانی شروع کر دی تھی۔ آیئے ان کی اپنی تقریروں، اور منشوروں کے چند اقتباسات سے اس بیان کی تشریح کرتے ہیں۔

''ہم لڑیں گے یا مر جائیں گے۔''

''یہ ایک کھلی بغاوت ہے۔''

''اگر فسادات ہوتے ہیں تو انھیں کون روک سکتا ہے؟''

''آپ اپنے آپ کو آزاد تصور کریں، ہر کام ایک آزاد انسان کی طرح کریں۔''

''ہماری اس تحریک کو ساری دنیا محسوس کرے گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ برطانوی فوجوں کی نقل و حرکت میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ڈالے، لیکن برطانیہ کی توجہ اس کی جانب ضرور مبذول ہوگی۔''

ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں عدم تشدد پر مبنی ہیں! ساری باتیں نہایت نپے تلے الفاظ میں ان سر پھرے لوگوں کا ہاتھ روکنے کے لیے کی گئی ہیں، جو طاقت استعمال کرنا چاہتے ہیں اور گاندھی ہمیشہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھیں طاقت کے استعمال سے نفرت ہے! یہ بات اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم اس کو کانگریس کے ان بلیٹنوں کے ساتھ پڑھیں، جن کی ہندوستان میں بھرمار ہے۔ یہ بلیٹن گاندھی کے خیالات کو اُن کے منطقی انجام تک پہنچاتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ جاپان کی کھلی حمایت کرتے تھے۔

''جاپان بار بار یہ بات دھرا چکا ہے کہ اسے ہندوستان کو تسخیر کرنے کی قطعاً کوئی خواہش نہیں اور نہ ہی اس کا کوئی مفاد اس سے وابستہ ہے۔ وہ تو صرف انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتا ہے تاکہ ہندوستان فوراً آزاد ہو جائے۔''[1]

یہ بلیٹن لوگوں کو کھلے بندوں قتل و غارت پر اکساتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ''نامیوں پر چھپ کر حملہ

(۱) بمبئی کانگریس بلیٹن، ۱۷-اگست ۱۹۴۲ء

کرنے کے لیے گوریلا دستے فوری طور پر تشکیل دیے جائیں۔''[1] ان میں یہ ہدایات شائع ہوتی تھیں کہ انگریزوں کے لیے کھانے پکانے والوں کو منظم کیا جائے تاکہ وہ اپنے آقاؤں کے لیے خراب کھانا پکائیں۔[2] یعنی نرم الفاظ میں انھیں اس بات پر اکسایا جا رہا تھا، کہ وہ لوگوں کو بڑے پیمانے پر زہر دے کر ہلاک کر دیں۔

ان میں چوری، آتش زنی، فساد اور دوسری تخریبی سرگرمیوں کی کھلی ترغیب دی جاتی تھی، اور اس بات کو قطعاً نظر انداز کر دیا جاتا تھا کہ ان کاموں سے کتنے بے گناہ شخص، زندگی سے محروم ہو جائیں گے..... لیکن ان باتوں کے پرچار کا انھیں مکمل اختیار حاصل تھا کیونکہ عدم تشدد کا وہ عظیم پرچارک، اپنی تمام تر چالاکیوں، مکاریوں اور الفاظ کے ہیر پھیر کا ماہر، ہر وقت ان کی پشت پر تھا۔

گھما پھرا کر بات کرنے کا ایک شاہکار، انھوں نے اپنی گرفتاری سے قبل اپنے اخبار ''ہریجن'' میں شائع کیا تھا۔ وہ ''ایک سنجیدہ سوال'' کے جواب میں لکھتے ہیں:

سوال: عدم تشدد کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، حکومت کے خلاف کیا کیا جا سکتا ہے؟

جواب: میں صرف اپنی ذاتی رائے ہی دے سکتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ بالکل بے داغ عدم تشدد کے ذریعے۔''

یہاں تک بات ٹھیک تھی لیکن دوسرے ہی فقرے میں وہ فرماتے ہیں:

''ایسی جدوجہد میں بجلی کے تار کاٹنے، ریل کی پٹریاں اُکھاڑنے اور چھوٹے پل تباہ کرنے پر بھی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔''

کیا خوب الفاظ استعمال کیے ہیں، مسٹر گاندھی، چھوٹے پل۔ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ کس وقت کون سا پل چھوٹا ہوتا ہے، اور کون سا نہیں ہوتا؟ اور ٹرین کے حادثے کا شکار ہونے والوں کے لیے نیک نیتی کے وہ الفاظ بے کار ثابت ہوتے ہیں، جو ان کے عدم تشدد کے حامی قاتلوں نے ٹرین کی پٹری اکھیڑتے وقت استعمال کیے ہوں گے۔

(۱) ملاحظہ ہو کتابچہ، ورکرز آف انڈیا (Workers of India) جو اے آئی سی سی آفس کے نام پر ۲۷-اگست ۱۹۴۲ء کو شائع ہوا تھا۔

(۲) ایضاً

۶

دریں اثنا، پونا کے جس محل میں وہ نظر بند ہیں، اس کی کھڑکیوں سے اگربتیوں کی خوشبو باہر آ رہی ہے۔ یہ اگربتیاں گاندھی کو دنیا بھر میں فاشزم کے حقیقی مخالفوں نے بھیجی ہیں۔ یہ بیسویں صدی کا سب سے بڑا اور ستم ظریفانہ تضاد ہے کہ فاشزم کے مخالف لوگ، ایک ایسے شخص کی پوجا کر رہے ہیں، جو فاشزم کو اپنے ملک میں داخلے کی اجازت دینے کو تیار تھا۔

آئندہ کیا ہوگا؟ ان کی شرانگیزی کس حد تک جا سکتی ہے؟ کیا ان کی پالیسی میں کسی اہم تبدیلی کا امکان ہے؟ ان سوالوں کا جواب اگرچہ قیاس آرائی پر مبنی ہوگا لیکن ہم حالات کے رُخ کے بارے میں معقول حد تک درست پیش گوئی تو کر سکتے ہیں۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ گاندھی کا عملی اثر و رُسوخ، تیزی سے کم ہو رہا ہے اور اب شاید وہ بہترین حالات میں دوبارہ استعمال نہیں کر سکیں گے۔ جب تک میرے یہ الفاظ شائع ہوں گے ان کی عمر ۷۵ برس ہو چکی ہوگی۔ وہ جیل سے باہر آ کر یہ محسوس کریں گے کہ دنیا اتنے عرصے میں کتنی تبدیل ہو چکی ہے وہ دیکھیں گے کہ برطانیہ اب شدید حالات کا شکار نہیں ہے اور نہ ہی دشمنوں کے مقابلے میں تنہا؛ نہ ہی وہ پستہ قد اور زرد فام لوگ، اپنی مسکراہٹوں اور وعدوں کے ساتھ، ہندوستان کے دروازے پر اپنے استقبال کے منتظر ہیں۔

اور اس سلسلے میں سب سے اہم چیز، ان کی صوفیانہ ہرزہ سرائی اور زندگی کے تلخ مگر سحر انگیز حقائق کے درمیان وسیع خلیج ہے، جو روز بروز وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ یہ خلیج کانگریس کے نسبتاً زیادہ ذہین ارکان کے لیے ہمیشہ سے پریشانی کا باعث ہے۔ نہرو نے، اپنی مشہور خودنوشت سوانح حیات میں کھلے بندوں اس کا اعتراف کیا ہے۔ درحقیقت اس کتاب کا بہترین حصہ وہی ہے، جس میں انھوں نے اس مستقل اور تھکا دینے والی ذہنی کشمکش کا ذکر کیا ہے، جس میں وہ دو متضاد دعووں کو یکجا کرنے کی کوشش کی وجہ سے مبتلا ہیں۔ ایک جانب مہاتما سے وفاداری کا دعویٰ ہے، اور دوسری جانب جدید دنیا کے بارے میں اپنے نظریات کی صحت پر یقین۔ ایک جانب چرخہ ہے اور دوسری جانب عدم تشدد، جس کے پس منظر میں گئو ماتا ہے (گاندھی کا کہنا ہے کہ میں گائے کی پوجا کرتا ہوں اور اس سلسلے میں کوئی دباؤ قبول نہیں کرتا)۔ قرون وسطیٰ کے جادو ٹونے میں اور اس باؤلی ہانڈی پر لیبل لگا ہوا ہے کہ ''اسے من وعن منظور کر دیا مسترد''۔ دوسری طرف ایک سکڑتی ہوئی دنیا ہے جو پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے ترقی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہیجان انگیز معاشرتی تجربات کی تنقید

پسند دنیا ایسے ہی نہرو جیسے شخص کا ان دونوں دنیاؤں کے درمیان بٹ جانا اسی طرح ناگزیر تھا جیسے ان کے کئی دوسرے ساتھی بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک ناگوار حقیقت کہ ایک ایسے شخص کے سر پر گاندھی کیپ زیب نہیں دیتی، جو جدید ذہن کا مالک ہو۔ لیکن اس ناگوار حقیقت سے بچ نکلنے کے لیے انھیں موجدانہ تحریف سے کام لینا پڑا اور کئی تکلیف دہ سمجھوتے کرنے پڑے۔

ہندوستانی نوجوانوں کے ساتھ بھی وسیع پیمانے پر ایسا ہی واقعہ پیش آ رہا ہے۔ جس دن سے گاندھی جیل گئے ہیں ان ہندوستانی نوجوانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، جو رضاکارانہ یا غیر رضاکارانہ طور پر جنگی کوششوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستانی نوجوان بیسویں صدی میں داخل ہونے لگے ہیں۔ ہندوستان کے ہزار ہا دیہاتوں سے نوجوان بڑی تعداد میں فوجی مراکز میں آ رہے ہیں، جہاں انھیں زندگی میں پہلی بار صحت و صفائی اور ڈسپلن کے ابتدائی اُصول سکھائے جاتے ہیں اور انھیں جدید مشینری کا جادو دکھایا جاتا ہے۔ یہ آخری بات بہت اہم ہے، برطانیہ نے حالیہ جنگ کے دوران جو تنظیم کاری کی ہے، اس کی بہترین مثال، وہ عظیم جنگی نمائش ہے جو گزشتہ اٹھارہ ماہ سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقد کی جا رہی ہے۔ یہ نمائش ہندوستانیوں کو جنگ کے جدید طریقوں اور ان مسائل سے آگاہ کرنے کی ایک کوشش ہے جو جنگ کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ یہ نمائش محض ٹینکوں اور پروپیگنڈا پوسٹروں کا مجموعہ نہیں۔ یہ ایک نہایت بڑے پیمانے پر دورِ جدید کی انجینئرنگ، ہوابازی، ٹرانسپورٹ، زراعت، ریڈیو، طباخی، معاشرتی سروس، علم نباتات اور طب وغیرہ کی مکمل تصویر ہے۔

کانگریس نے اس نمائش کا بائیکاٹ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ عوام میں، اور خاص طور پر نوجوانوں میں بہت مقبول ہے۔ اس نے ان کی زندگی کا رُخ تبدیل کر دیا ہے۔ وہ ہندوستان کے اونگھتے ہوئے دیہات سے آئے تھے، جو اگر گاندھی کا بس چلتا تو آج بھی اسی طرح اونگھ رہے ہوتے۔ لیکن یہاں، جدید سائنس نے اپنی جادو کی پٹاری کھول دی اور ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حیرت اور مسرت سے ہر چیز کو دیکھتے ہیں اور اس کے حسن میں گم ہو کر، ایک بالکل نئی دنیا کا سفر شروع کر دیتے ہیں، جہاں سے گاندھی کی ساحرانہ آواز بھی انھیں واپس نہیں بلا سکتی۔

اور مہاتما کسی حال میں بھی، اس دنیا میں فٹ نہیں ہو سکتے۔ یہ ہندوستانی نوجوان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گاندھی کے چنگل سے آزاد ہو گئے ہیں۔ خواہ گاندھی اسے سمجھیں یا نہیں، خواہ وہ ہندوستانی نوجوان خود اس

بات کومحسوس کریں یا نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب وہ گاندھی کی باتوں سے متاثر نہیں ہوں گے اور ہمارے اندازے کے مطابق ۱۹۴۴ء کے خاتمے تک ایسے نوجوانوں کی تعداد ۴ کروڑ تک پہنچ جائے گی۔

قصہ مختصر، گاندھی کی بڑھتی ہوئی عمر کے علاوہ، موجودہ صورت حال کے حقائق نے ان کے کاٹے کو زہر سے محروم کر دیا ہے۔ ان کی عدم تشدد کی پالیسی، ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے اور عوام نے سمجھ لیا ہے کہ یہ متشددانہ ہنگامہ آرائی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اگرچہ ان کے چند پیروکار، زبانی کلامی ان کے چرخے کو خراج تحسین پیش کرتے رہیں گے لیکن زیادہ تر لوگ جلد ہی یہ ظاہر کرنا بھی چھوڑ دیں گے کہ چرخے سے ہندوستان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

لیکن اس تمام عرصے میں گاندھی کے گرد اگر بتیاں جلائی جاتی رہیں گی۔ لاکھوں ہاتھ، ان کے گرد تقدس کے ہالے کو چمکاتے رہیں گے اور بالآخر جب وہ اس جہان فانی سے رخصت ہوں گے تو ہم شرطیہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کا شمار بھی ہندومت کے بے شمار دیوتاؤں میں کیا جانے لگے گا۔

☆☆☆

دوسرا باب

نفرت پر مبنی ریاست

اب ہم اس کتاب کے اہم ترین اور فوری حل طلب مسئلے کی طرف آتے ہیں، کیونکہ ہم پاکستان کی سرحدوں پر کھڑے ہوئے ہیں۔

پاکستان ایک ریاست ہے۔ یہ سچ ہے کہ فی الحال یہ محض ایک خواب ہے لیکن مسلمانوں کے لیے کسی حقیقت سے کم نہیں۔

پاکستان کے لغوی معنی ''پاک لوگوں کی سرزمین'' ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ ہندوستان کے شمال مغرب میں بلوچستان، سندھ، پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے پر مشتمل ہوگا اور اس کا ایک حصہ مشرق میں بنگال کے زیادہ حصے پر مشتمل ہوگا۔

یہ تجویز پیش کی جا رہی ہے کہ ان علاقوں کو، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ہندوستان سے، جہاں ہندو اکثریت میں ہیں، الگ کر دیا جائے اور یہ علاقے اپنے آپ کو ایک آزاد ریاست قرار دے دیں۔ مسلم لیگ، اس تجویز کی دیوانہ وار حمایت کر رہی ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی ایک مضبوط اور جنگجو جماعت ہے جس کو ہندوستان کے ۸۵ فی صد مسلمانوں کی حمایت ہے، اور اس کے لیڈر مسٹر ایم۔ اے جناح ہیں۔

خوابوں کی یہ ریاست، کسی دن بھی ایک دھماکے کے ساتھ، دنیا کے نقشے پر اُبھر سکتی ہے۔ میں ان لوگوں میں شامل ہوں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ریاست قائم ہوگی اور اسے قائم ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو اس سے ایشیا میں ایک بالکل نئی صورت حال نمودار ہو جائے گی، طاقت کا موجودہ توازن درہم برہم ہو جائے گا، اور دنیا کے ہر ملک کی پالیسی میں بڑے پیمانے پر تبدیلی واقع ہوگی۔

لہٰذا یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ ہم اس ریاست کی سرحدوں کو عبور کر کے اس کا تفصیلی جائزہ لیں۔

لیکن ایسا کرنے سے قبل ہمیں اس پس منظر کا مطالعہ کرنا پڑے گا جس میں اس ریاست کے خواب نے جنم لیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافات کا پس منظر، جس کو پاکستان حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمیں اس کتاب میں جا بجا ان اختلافات کے حوالے تو ملے ہیں لیکن ہم نے اب تک اس مسئلے کو

علیحدہ کر کے اس پر خصوصی توجہ سے غور نہیں کیا۔ اب ایسا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

۲

بمبئی کا شہر، ہندوستان کے دوسرے شہروں کی نسبت زیادہ پُر امن، قانون کی پابندی کرنے والا اور ''مہذب'' شہر شمار ہوتا ہے۔ یہاں پولیس کا نظام بہتر ہے، رات کو سڑکوں، گلیوں میں روشنی کی جاتی ہے اور کوئی اکیلی عورت بھی، دن کو یا رات کے کسی وقت بھی، ان میں آزادانہ گھوم پھر سکتی ہے۔ اس کو کسی قسم کی سنگین زیادتی کا ڈر نہیں ہوتا۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس شہر میں فرقہ وارانہ کشیدگی، نسبتاً کم پائی جاتی ہے۔ جس وقت ہندوستان کے دوسرے شہر، ہندوؤں اور مسلمانوں کے خون میں نہائے ہوئے نظر آتے ہیں، بمبئی خاموشی کے ساتھ اپنے کاروبار میں مصروف نظر آتا ہے۔

فروری ۱۹۲۹ء سے لے کر اپریل ۱۹۳۸ء تک کا، بمبئی کا ریکارڈ یہ ہے۔ باقی سالوں کے اعداد و شمار ہمارے پاس نہیں ہیں۔

۱۹۲۹ء میں یہاں دو فرقہ وارانہ فساد ہوئے۔ پہلے میں ۱۴۹ افراد ہلاک اور ۷۳۹ شدید زخمی ہوئے۔ یہ فسادات ۳۶ دن تک جاری رہے۔ دوسرے میں ۱۳۵ افراد ہلاک اور ۱۰۹ زخمی ہوئے۔ یہ فساد ۲۲ دن تک جاری رہے۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۲ء میں بھی دو دو فسادات ہوئے۔ ان میں بھی ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد تقریباً اتنی ہی تھی۔ ہمارے پاس صرف ۱۹۳۲ء میں ہونے والے دوسرے فساد کے اعداد و شمار ہیں۔ یہ فساد ۴۹ روز تک جاری رہا، ۲۱۷ افراد ہلاک ہوئے اور ۲،۷۱۳ لوگ شدید زخمی ہوئے۔

۱۹۳۳ء، ۱۹۳۴ء، اور ۱۹۳۵ء میں بھی فسادات ہوئے لیکن ان میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ ۱۹۳۶ء میں جو بڑا فساد ہوا، وہ ۶۵ دن تک جاری رہا۔ اس میں ۹۴ افراد ہلاک اور ۶۳۲ زخمی ہوئے۔

۱۹۳۷ء نسبتاً خاموش سال تھا، اس سال کے بڑے فساد میں صرف ۱۱ لوگ ہلاک اور ۸۵ زخمی ہوئے اور یہ صرف تین ہفتے میں ختم ہو گیا۔

لیکن ۱۹۳۸ء میں ایک ہی فساد میں جو صرف ڈھائی گھنٹے جاری رہا، ۱۲ افراد ہلاک اور ۱۰۰ اشدید زخمی

ہو گئے۔[۱]

اس کے بعد سے صورت حال آہستہ آہستہ خراب ہوتی جا رہی ہے؛ یاد رہے کہ بمبئی فرقہ پرستی کے اعتبار سے ہندوستان کے نسبتاً پُر امن شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

''ہندو مسلم اتحاد'' کے لیے مسٹر گاندھی کی دیوانہ وار کوششوں کے باوجود، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا ریکارڈ، نہایت تکلیف دہ اور دل دہلا دینے والا ہے۔ یہ بیس سالہ خانہ جنگی کا ریکارڈ ہے جو صلح امن کے چند مختصر وقفوں کو چھوڑ کر مسلسل جاری رہی۔[۲]

دنیا کے لیے اس نہایت اہم واقعے کو، آزاد خیال بڑی آسانی سے فراموش کر دیتے ہیں، وہ تو ''ہندوستان'' کا لفظ سنتے ہی اور اس علاقے کے، جہاں قتل و غارت گری کے ان جذبات کی حکمرانی ہے، جغرافیائی اتحاد کو دیکھ کر ہی ہپناٹائیز (Hypnotized) ہو جاتے ہیں۔ اگر ایسے لوگ آسمان کی بلندی سے ذرا نیچے آ کر، ہوابازوں کی اصطلاح میں، درختوں کی بلندی پر پرواز کریں تو ان کے خیالات تبدیل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر مالابار میں آخری موپلا بغاوت کو قریب سے دیکھنے پر، انھیں کوئی خوشگوار منظر دکھائی نہیں دے گا۔ انھیں ہر طرف ہندوؤں کی لاشوں کے انبار نظر آئیں گے جن میں حاملہ خواتین بھی شامل تھیں، جنھیں پیٹ چاک کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔ انھیں ہر طرف جلتے ہوئے مندر، اور تباہی و بربادی کے مناظر دیکھنے کو ملیں گے۔

یہ خواب دیکھنے والے، جو فوراً ہی کہہ دیتے ہیں کہ اصل میں برطانیہ فرقہ پرستی کو ہوا دے رہا ہے، اگر موقع پر جا کر واقعات کا جائزہ لیں تو وہ یقیناً الزام تراشی کے جرم سے بچ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوہاٹ میں آخری بار جو سنگین فساد ہوا تھا، اس کی وجہ اسلام کے خلاف ایک نظم کی اشاعت تھی۔ لیکن ادب کے اس ذرا سے ٹکڑے نے ۱۵۵ افراد کو ہلاک اور زخمی کر دیا، لاکھوں روپے مالیت کی جائیداد تباہ کی، اور ہزاروں دہشت زدہ پناہ گزینوں کے اپنے گھر سے فرار کا باعث بنا۔

---

(۱) یہ اعداد و شمار میں نے ڈاکٹر بی آر امبیدکر کی کتاب "Thoughts on Pakistan" سے لیے ہیں (یہ کتاب ٹھیکر اینڈ کمپنی بمبئی نے شائع کی ہے)۔ میں اس کتاب کا بہت ممنون احسان ہوں اور اس کے مطالعے کو نہ صرف پاکستان کا مطالعہ کرنے والے طالب علموں کے لیے ضروری سمجھتا ہوں بلکہ جدید ہندوستان کے طالب علموں کے لیے بھی۔

(۲) ایضاً، صفحہ ۱۸۰

ہندوستان میں کہیں بھی چلے جایئے یہی ایک کہانی اپنے آپ کو دہراتی نظر آتی ہے۔ کسی ہندو کے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ مسلمانوں نے ہمارے دیوتا کی توہین کی ہے، کسی ہندو نے مسلمانوں کے اللہ کا تذکرہ طنزیہ انداز میں کیا ہے، کسی نے ایک مذہبی جلوس پر ایک روڑا پھینک دیا، حتیٰ کہ نماز کے دوران کسی نے بانسری بجائی اور فوراً قیامت برپا ہو جاتی، رائفلیں، خنجر، دو شاخے اور آہنی پنجے نکل آتے، اور سارا علاقہ ہفتوں نہیں بلکہ مہینوں تک دہشت کی لپیٹ میں رہتا۔

آخر میں چند انگریز لڑکے ہی فیصلہ کرتے تھے جیسے رائل سیسکس رجمنٹ (Royal Sussex Regiment) کی ۲۵ فوجیوں کی ایک پلٹن نے، حال ہی میں کراچی میں ۲۵ ہزار مذہبی دیوانوں کے ہجوم کو پسپا کر کے کیا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ ایک ہندو نے اسلام کی توہین کر دی جس پر ایک مسلمان نے اسے قتل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ قاتل کو پھانسی دے دی گئی۔ اب اس پھانسی کا بدلہ لینے کے لیے یہ ہجوم لوٹ مار اور قتل و غارت کے لیے شہر کے وسط کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پولیس نے انھیں روکنا چاہا لیکن ناکام رہی۔ اس پر انگریز لڑکوں کو طلب کیا گیا اور انھیں ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دیا گیا۔ فائرنگ سے ۴۷ افراد ہلاک ہو گئے۔ کانگریس نے اس پر بہت واویلا کیا اور اس کو ''شاہی طاقت'' کے ظلم کی ایک اور مثال قرار دیا۔

ایک ہزار مذہبی دیوانوں کے مقابلے میں ایک برطانوی سپاہی کے تناسب کو شاہی طاقت کا استعمال قرار دینا، ذرا غور کیجیے آپ کو بھی مضحکہ خیز لگے گا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار کے شواہد اتنے زیادہ، اتنے عالمگیر اور اس قدر معاصر ہیں کہ ان سے انکار کرنا ممکن ہی نہیں چنانچہ ہم بھی اس سلسلے میں اپنے قاریوں کی ذہانت کی توہین نہیں کریں گے۔ تاہم اگر کسی کو ابھی ان شہادتوں پر شک ہے تو ہم اس کو اعداد و شمار کے مطالعے کا مشورہ دیں گے۔ یہ اعداد و شمار اتنے واضح ہیں کہ کوئی ہندو، خواہ وہ کتنا بڑا مذہبی دیوانہ کیوں نہ ہو، ان میں رد و بدل نہیں کر سکتا۔

تو یہ ہے پاکستان کا پس منظر.......... اس پس منظر میں خون ہی خون ہے۔ ماضی میں خون، حال میں خون، اور اگر یہ خواب پورا نہ ہوا تو مستقبل میں اس سے بھی زیادہ خون۔

۳

ہو سکتا ہے کہ آپ مجھ سے کہیں ''یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ دنیا کی دوسری قوموں نے بھی اپنے اختلاف دور کیے ہیں تو ہندوستانی قوم میں ایسی کیا بات ہے جو وہ ان اختلافات کا حل تلاش نہ کر سکے۔''

اس سوال کا جواب صحت کے ساتھ دینے کے لیے ہمیں قوم کی تعریف کرنی ہوگی۔ رینن (Renan) نے قومیت کے بارے میں اپنے مشہور مضمون میں قوم کی اس قدر عمدہ تعریف کی ہے کہ ہم بھی اس کی اس سے بہتر تعریف تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

''قوم کس چیز سے بنتی ہے؟'' رینن کہتے ہیں۔

''قوم ایک جیتی جاگتی روح ہے۔ ایک روحانی اصول ہے اور یہ روح دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ماضی اور حال۔ ماضی میں ہماری مشترکہ یادوں کا ورثہ شامل ہوتا ہے اور دوسرے حصے میں ایک ساتھ رہنے کی خواہش اور اس کا برملا اظہار شامل ہوتا ہے۔ اپنی غیر منقسم وراثت کو قائم رکھنے کی خواہش شامل ہوتی ہے۔ ماضی میں مشترک عظیم کارناموں کا حامل ہونا اور حال میں ایک مشترکہ عزم کا مالک ہونا۔ ماضی میں عظیم کام اکٹھے کرنے کی یادیں اور حال میں ایسا ہی کرنے کی خواہش، یہ ہیں وہ بنیادی شرائط جن سے کوئی قوم تشکیل پاتی ہے۔''

ہندوستان کیا اس امتحان پر پورا اُترتا ہے۔ سب سے پہلے ہم رینن کی پہلی شرط ——— یادوں کے ایک ورثے کی مشترکہ ملکیت کو لیتے ہیں۔ مسلمان کیا یاد کرتے ہیں۔ وہ یہ یاد کرتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے قبل وہ آٹھ سو برس تک سارے ملک کے مالک بنے رہے اور ہندوؤں کو اپنی ذہنی اور جسمانی طاقت سے مطیع رکھا اور ہندو اس غلامی کی ناگوار تفصیلات کو فراموش نہیں کر سکے۔ اپنے کتابچے، دی ہندو نیشنل موومنٹ (The Hindu National Movement) میں بھائی پرمانند لکھتے ہیں:

''ہندو، اپنی تاریخ میں پرتھوی راج، پرتاپ، شیواجی اور بیراجی بیر جیسے لوگوں کی یاد مناتے ہیں، جو اپنے ملک کے وقار اور آزادی کے لیے مسلمانوں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے، جبکہ مسلمان، محمد بن قاسم اور اورنگزیب جیسے مسلمان بادشاہوں کو اپنا قومی ہیرو مانتے ہیں۔

ہاں، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے پاس یادوں کا ورثہ موجود ہے.......... لیکن یہ یادیں نفرت و حقارت کی یادیں ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ نفرت کی یہ یادیں صرف ماضی کا حصہ نہیں بلکہ آج بھی

ان کے درمیان نفرت موجود ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کا نظریہ محض ایک خود رو جھاڑی کی طرح ہے، اور وقت کے ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان مشکل سے سہی، آج تک اکٹھے رہتے رہے ہیں، تو آج ان کے درمیان طلاق کی یہ انتہائی تجویز کیوں پیش کی گئی ہے۔ لیکن اس قسم کا استدلال پیش کرنا معاصر تاریخ سے روگردانی کے مترادف ہے۔ یہ درست ہے کہ اب تک ہندو اور مسلمان، نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کا قتل عام کرنے سے اجتناب کرتے رہے ہیں اور خود کو صرف گوریلا جنگ تک محدود رکھا ہے، یہ بھی درست ہے کہ اگر قانون نافذ کرنے کی ذمہ داری انگریزوں کے سر رہتی تو یہ صورت حال غیر معینہ عرصے تک جاری رہ سکتی تھی، لیکن جوں جوں ہندوستان کی آزادی قریب آ رہی ہے، فرقہ پرستی کی آگ بھی بھڑک اٹھی ہے .... یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ جس تناسب سے آزادی کی مانگ بڑھ رہی ہے، بالکل اسی تناسب سے پاکستان کا مطالبہ بھی زور پکڑ رہا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ کے بارے میں کسی شک وشبہ کی گنجایش نہیں ہے۔ ہندوستان کی آزادی کا مطلب ایک ایسی حکومت کا قیام ہوگا جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی اور ہندو کو ذرا سی بھی طاقت مل جائے، تو وہ اس کا غلط استعمال شروع کر دیتا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کو اس بات سے پہلے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کی صورت ان کا کیا حشر کیا جائے گا۔

واقعات کچھ اس طرح ہیں۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں، آزادانہ انتخاب کے ذریعے سیلف گورنمنٹ کے ادارے قائم کرنے کی تجویز تھی۔ یہاں ہم واقعات کو اس ایکٹ کی تفصیلات بیان کر کے اُلجھانا نہیں چاہتے۔ صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ اقدام، اگر چہ اس میں چند ضروری حفاظتی انتظامات کی بھی گنجایش رکھی گئی تھی، ترقی کی جانب ایک اہم قدم تھا۔ یہ ایکٹ، ایک نئی قوم کے لیے جو آزادی کے دروازے پر کھڑی تھی، ایک مکمل تربیت گاہ کا اہتمام کرتا تھا۔ اس کے ذریعے جو ادارے قائم کیے گئے تھے، وہ ہندوستانی سیاست دانوں کو کسی قسم کی بندش کے بغیر مکمل ذمہ داری قبول کرنے کے قابل بنانے کے لیے انتہائی

مناسب تھے۔

۲- اگست ۱۹۳۵ء کو اس ایکٹ کی شاہی منظوری دی گئی اور ۳۷-۱۹۳۶ء کی سردیوں میں نئی اسمبلیاں منتخب کی گئیں۔ گیارہ میں سے سات صوبوں میں کانگریس نے قطعی اکثریت حاصل کی اور ان صوبوں میں اکثریت حاصل کرتے ہی اس نے اپنے چہرے سے نقاب ہٹادی۔ اس نے مسلمانوں کو عہدوں کا حصہ دینے، اور کسی طرح کی مخلوط حکومت قائم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنی یہ مطلق العنانی سیاسی امور تک ہی محدود نہیں رکھی، بلکہ مسلمانوں کی مادی اور روحانی زندگی کی ہر شاخ پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اُردو کی جگہ سنسکرت رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی کے حق میں بڑے پیمانے پر مہم شروع کر دی گئی۔[1] سکولوں پر اس ظالمانہ انداز سے قبضہ کیا گیا کہ اسے اگر نازی بھی دیکھ لیتے تو عش عش کر اٹھتے۔ مسلمان بچوں کو اُٹھ کر گاندھی کی تصویر کو سلام کرنے پر مجبور کیا جاتا۔ کانگریس کے جھنڈے کو اس طرح عزت دی جاتی جیسے کہ وہ سارے ملک کا جھنڈا ہو۔ انصاف کو بُری طرح کرپٹ کیا گیا اور پولیس کو اس وحشیانہ طریقے سے استعمال کیا گیا کہ مسلمان آج تک اسے ''گسٹاپو'' (*Gestapo*) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ کاروباری معاملات میں تعصب سے کام لیا گیا۔ بڑے سے بڑے زمین داروں اور تاجروں سے لے کر ہل چلانے والے کسانوں تک تمام لوگ اس ظالمانہ تعصب کا شکار تھے۔

ان الزامات کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ جب جنگ چھڑی اور کانگریس کی وزارتوں نے استعفے دیے، تو مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح نے اسے یوم نجات قرار دیا، کہ آج کے دن مسلمانوں پر ظلم وتشدد کا خاتمہ ہوا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے نہایت جوش وخروش کے ساتھ یہ دن منایا۔

یہ تھا رینن کی پہلی شرط ''یادوں کے مشترکہ ورثے، لوگوں کے محبت کے رشتے میں منسلک ہونے،

(۱) اس مہم کے سلسلے میں مسلمانوں کے غم وغصہ کے جذبات کا احساس کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن (شریف) بھی خط نسخ میں تحریر ہے۔

اوراس پر فخر محسوس کرنے'' کا انجام۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمان کسی ایسے ورثے کے امین ہونے کا دعویٰ کر ہی نہیں سکتے۔

۴

اور اب رینن کی دوسری شرط کی باری ہے ''اکٹھا رہنے اور اکٹھے عظیم کارنامے انجام دینے کی خواہش''۔

اس سوال کا جواب تو بڑی حد تک ان واقعات سے بھی مل سکتا ہے جن کا ہم نے پہلے تذکرہ کیا ہے، لیکن ان جوابات میں زور پیدا کرنے کے لیے ہم تھوڑی دیر تک رُک کر مزید واقعات کا جائزہ لیتے ہیں۔

ہندو اور مسلمان کے ساتھ اکٹھے رہنے کی خواہش بالکل اسی طرح کرتے ہیں جس طرح فرانسیسی باشندے، جرمنوں کے ساتھ رہنے کی، یا امریکی لوگ جاپانیوں کے ساتھ۔ ڈاکٹر امبیدکر، جنھیں حالات کا ہم سے بہتر علم ہے۔ کہتے ہیں: ''یہ صورت حال ایسی ہی ہے جیسے دو متحارب ممالک کے درمیان اسلحہ کی دوڑ۔ اگر ہندوؤں کی بنارس یونیورسٹی ہے تو مسلمانوں کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کرنا لازمی ہے۔ جونہی ہندو ایک تحریک شروع کرتے ہیں، مسلمان کوئی دوسری تحریک شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہندوؤں کی آر ایس ایس[1] ہے تو مسلمانوں نے خاکسار تحریک[2] منظم کر کے اس کا جواب دے دیا ہے۔ سماجی ہتھیاروں اور ساز وسامان کی یہ دوڑ اسی طرح عوام کے ساتھ جاری ہے جس کا مظاہرہ دو ملک جو جنگی تیاریوں میں مصروف ہوں، اسلحہ حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ ہندو انھیں اپنا غلام بنانا چاہتے ہیں اور ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان دوبارہ ان پر غالب آنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ دونوں جنگ کی تیاریوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔[3]

یہ ہے ان کے اکٹھے رہنے کی خواہش!

ابھی تک ہم نے بنیادی طور پر یہ بات بیان کی ہے مسلمان، اس بات پر مصر ہیں کہ ہم ہندوؤں سے مختلف اور الگ قوم ہیں۔ لیکن گاندھی کی جانب سے ہندوستان کے اتحاد اور ایک مشترکہ ہندوستانی قومیت کا راگ الاپنے کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندو رائے عامہ بھی بڑی تعداد میں مسلمانوں اور ہندوؤں

(۱) ہندوؤں کی رضا کار تنظیم۔
(۲) مسلمانوں کی رضا کار تنظیم۔
(۳) ملاحظہ کیجیے: *Thoughts on Pakistan*، صفحہ ۲۴۲۔

کے درمیان اختلافات پر اسی طرح اصرار کرتی ہے جس طرح مسلمان۔

مثال کے طور پر ہم یہاں قدامت پسند ہندوؤں کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں۔ یہ نقطۂ نظر ہندوؤں کی ایک طاقتور سیاسی پارٹی، مہا سبھا، کا ہے، اور جس میں دائیں بازو کے بہترین دماغ رکھنے والے لوگ بڑی تعداد میں شامل ہیں۔

حال ہی میں، مسٹر وی ڈی ساورکر (V.D Savarkar) نے اپنے صدارتی خطاب میں یہ بات کہہ کر بہت داد وصول کی تھی:

''ہم ہندو، بذات خود ہندوستان میں آباد ایک مستقل قوم ہیں۔ ہمارا آبائی وطن ایک ہے، ہم میں علاقائی اتحاد ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک ایسی چیز ہے جو دنیا میں شاید ہی کہیں پائی جاتی ہو۔ ہمارے تمام مقدس مقامات ہمارے آبائی وطن میں ہی ہیں۔ اس طرح وطن کے ساتھ ہماری محبت دوگنی ہوگئی ہے۔ ہمارے درمیان بہت سے مشترک رشتے ہیں، ثقافتی، مذہبی، تاریخی، لسانیاتی اور نسلی، صدیوں کے ساتھ نے ہمیں ایک قوم کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ ہندو قوم کسی سمجھوتے کے تحت وجود میں نہیں آئی، بلکہ اسی علاقے کی پیداوار ہے۔[1]

اس تصویر میں، جو کچھ کچھ یک طرفہ دکھائی دیتی ہے، مسلمان کہاں فٹ ہوتے ہیں؟ اس کا جواب ظاہر ہے کہ یہی ہے کہ وہ فٹ نہیں ہوتے۔ مہا سبھا کو نہ وہ پسند ہیں، نہ اُن کی ضرورت ہے اور نہ وہ ان کے وجود کا اعتراف کرتی ہے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، مسلمان کہیں بھی جائیں......... اس سختی ہوئی نفرت نے ساورکر کو یہ اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا کہ ہندوستان نہ متحد ہے اور نہ اس میں صرف ایک قوم آباد ہے۔ بلکہ ثقافتی، مذہبی اور قومی اختلافات کی پیداوار ہے۔ انھوں نے کہا کہ ''آیئے ہم سب مل کر اس ناگوار حقیقت کا مقابلہ بہادری کے ساتھ کریں کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔''

چلیں یہاں تک تو بات ٹھیک ہے۔ ایک ذمہ دار ہندو رہنما سے یہ اعتراف کرانا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ساورکر ایک علیحدہ قوم ہونے کے سلسلے میں مسلمانوں کا دعویٰ تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن انھیں اس کے عملی اظہار کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اور ان کی جماعت پاکستان کے شدید مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ مسلمان بھی ہماری طرح ایک قوم ہیں، لیکن ہم انھیں رہنے

(۱) ہندو مہا سبھا کے کلکتہ سیشن میں تقریر جو دسمبر ۱۹۳۹ء میں منعقد ہوا تھا۔

کے لیے کوئی علیحدہ جگہ دینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ وہ بھی ہندوستان کے باسی ہیں، اور ان کی تعداد دس کروڑ ہے لیکن ان میں سے ہر ایک دہریہ اور معاشرے سے نکالے جانے کے قابل ہے .... لیکن ہندوستان ہمارا ہے اور ہم اسے اصلی شکل میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں .... یہ سچ ہے کہ وہ کئی صدیوں تک ہندوستان پر حکمران رہے، اور وہ برطانیہ کے علاوہ واحد قوم تھے جس نے ہندوستان کو متحد رکھنے کی کوشش کی لیکن یہ سب ماضی کی داستانیں ہیں جنھیں دہرانے کی ہم اجازت نہیں دے سکتے۔ برطانیہ کی مہربانی سے اب ہم ہندوستان کی نمایاں طاقت بن گئے ہیں۔ تعداد کے حساب سے ہمارا تناسب ایک اور تین کا ہے، اور نقدی کے حساب سے ایک اور بیس کا .... اور انگریز جب یہاں سے چلے جائیں گے تب تو ہمارے اختیارات میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔

یہ ہے ایک قدامت پرست ہندو کے نقطۂ نظر کا مکمل اور صحیح تجزیہ، اگرچہ اس میں نامناسب زبان استعمال کی گئی ہے۔ اگرچہ گاندھی اس تصور سے ہی کانپ اُٹھیں گے کہ اس قسم کا فضول خیال ان کے مقدس ذہن میں کبھی داخل ہو سکتا ہے لیکن ان کے بڑے بڑے کاروباری حامیوں کے ذہن میں ضرور اس طرح کے خیالات پیدا ہوئے ہیں اور انھوں نے بار بار ان کا برملا اظہار کرنے کی بے وقوفی بھی کی ہے۔

ہم آخر کار اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

مسلمان نہایت جوش و خروش کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایک علیحدہ اور خود مختار قوم ہیں اور ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے۔

ہندو .... یا ان کی بھاری اکثریت .... بھی اسی قدر جوش و خروش سے، علیحدہ اور خود مختار قوم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں .... وہ بھی درست ہے۔

لیکن جب مسلمان اپنی خواہشات کو منطقی شکل دینا چاہتے ہیں اور اپنے لیے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہندو اس کے خلاف احتجاج کر کے آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں، کانگریسی پریس کا توپ خانہ پوری طاقت سے پھٹ پڑتا ہے، ساری دنیا میں ہندو نوجوان، جنھیں پیسے دے کر باہر بھیجا جاتا ہے، اس کے خلاف بیان دینے لگتے ہیں اور گاندھی برت رکھ کر بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔

آخر اس سارے عمل کا مطلب کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ اس کا مطلب مخصوص مفادات ہیں .... یہ ایک پرانا فراڈ ہے، جو بدقسمتی سے ایک

واقعہ بھی ہے .... ایک نہایت منحوس واقعہ، جو دنیا بھر کے لیے تکلیف اور پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے۔

لہٰذا ہم ہندوستان کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ خود کو اس سلسلے میں مجرم گردانے۔ یہاں ہم مسلم لیگ کے ایک بااختیار ترجمان کا بیان پیش کرنا چاہیں گے:

> ''ہندوؤں کی جانب سے پاکستان کی جس شدومد کے ساتھ مخالفت کی جا رہی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا مطالبہ اُن کے مخصوص مفادات کی جڑوں پر کلہاڑی چلانے کے مترادف ہے۔ ہندو چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی تمام تر دولت پر اُن کا قبضہ ہو، لیکن پاکستان ان کے اس خواب کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ہندوستان کے اتحاد اور ناقابلِ تقسیم ہونے پر ان کا اصرار صرف ایک سیاسی سٹنٹ ہے، جس کا مقصد سیاسی اور اقتصادی شعبوں میں مسلمانوں میں جو احساس بیدا ہو رہا ہے، اس کا گلا گھونٹ دیا جائے۔''(۱)

وہ شخص اس سچ کی حقیقت کو تسلیم کرے گا، جس کو اس بات کا ذرا سا بھی علم ہے کہ بڑے بڑے کاروباری حضرات نے کانگریس پر کس طرح قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ ہندو سرمایہ دار اپنے گھر میں ہر چیز کا مالک بننا چاہتا ہے اور ان کی قدرتی خواہش ہے کہ ہندوستان کے کروڑوں عوام خصوصاً مسلمان عوام کے گرد اپنا حلقہ تنگ کر دیا جائے۔ وہ اپنے اقتصادی کنٹرول کو برقرار رکھنے، اور اسے ان علاقوں تک پھیلانے کے لیے، جو قیام پاکستان کی صورت میں اس کے حلقۂ اثر سے باہر ہو جائیں گے، لڑے گا اور قیامت تک لڑتا رہے گا۔ ان علاقوں میں بہت دولت ہے اور مزید دولت دریافت ہو رہی ہے۔ بنگال صنعت کاری کے لیے سنہری مواقع فراہم کرتا ہے، اور مغربی صوبوں کی زرعی پیداوار کے لیے بہت اچھی منڈی ثابت ہوگا۔ اس کے علاوہ مغربی صوبوں میں بہت سے وسائل ایسے ہیں جن سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ وہاں دھاتیں ہیں، معدنیات ہیں، جنگلات ہیں اور ہندوستان کی بہترین زرعی زمین ہے، خاص کر پنجاب میں۔

ہاں، ہندو سرمایہ دار اپنے مخصوص مفادات کے لیے آخری وقت تک جدوجہد کرتے رہیں گے۔ وہ مادرِ وطن کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے خلاف احتجاج کریں گے اور اس کے لیے سفارت کاری اور پروپیگنڈا کا ہر حربہ استعمال کریں گے کہ اس احتجاج کی آواز دنیا بھر میں گونجے۔ وہ اس مقصد کے لیے آہ و زاری، کریں

---

(۱) ملاحظہ کیجیے: Pakistan and Modern India، جس کا دیباچہ قائداعظم نے لکھا ہے اور جو مالا بار ہل، بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔

گے، گریہ وفریاد کریں گے، رشوت دیں گے، اور ڈرانے دھمکانے سے بھی گریز نہیں کریں گے اور اس مقصد کے لیے ان کے پاس ایسے لوگ ہوں گے، جن کا کردار شک وشبہ سے بالاتر ہوگا لیکن جو ہندو قوم پرستی کے نشے میں اتنے دُھت ہوں گے کہ انھیں واقعات اپنے صحیح رنگ میں نظر ہی نہیں آئیں گے۔ ایسی ہی ایک شخصیت پنڈت جواہر لال نہرو کی ہے، جنھوں نے ایک ایسے وقت میں جب ہندوستان کی گلی گلی میں خون بہہ رہا تھا اور سارا ملک ایک نہایت بڑی اور خوفناک خانہ جنگی کے دھانے پر کھڑا تھا، نہایت آرام سے امریکہ کو تار بھیجا تھا کہ ''چند مٹھی بھر لوگوں کے سوا، ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی قسم کا کوئی نسلی، ثقافتی یا لسانی اختلاف نہیں ہے۔''[1] اس حیران کن بیان پر جتنے بھی استعجابیہ نشان لگائے جائیں کم ہیں، اور نہ ہی اس کے بعد آنے والے اس تعجب خیز بیان پر جس میں انھوں نے واقعات کو نہایت کم کر کے بیان کیا ہے۔ ''اب چند مسلمانوں کی جانب سے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ مطالبہ صرف چار سال پُرانا ہے اور بہت کم لوگ اس پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں۔''

ساڑھے آٹھ کروڑ لوگوں کے لیے ''کچھ'' کے لفظ کا استعمال آپ کو عجیب نہیں لگا۔ اور ''بہت کم لوگ اس پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں'' کے الفاظ، ایک عظیم قوم کے زندگی یا موت کے بڑھتے ہوئے جذبات کی ترجمانی کرنے کا ایک نرالا طریقہ نہیں ہیں۔

خیر، آپ کو پہلے سے خبردار کر دیا گیا ہے۔ جوں جوں خوابوں کی اس ریاست کا خاکہ سامنے آئے گا، اور دنیا کی نگاہوں میں اس کی شکل واضح ہوگی، اُس وقت کے واقعات کا آپ کو پہلے سے علم ہو گیا ہے۔ پاکستان پر ہر طرح سے حملے کیے جائیں گے، اس کے بارے میں جھوٹی افواہیں پھیلائی جائیں گی اور اس کے بارے میں اس قدر غلط بیانات دیے جائیں گے کہ اس کی مثال ملنی محال ہے لیکن تمام باتوں کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ اس امتحان میں پورا اُترے گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ریاست وجود میں آئے گی۔

اور ہم اب اس ریاست کے ہونے والے بادشاہ...... مسٹر ایم-اے جناح سے ملاقات کے لیے چلتے ہیں۔ آج کی سیاست میں ان کے اہم مقام کو دیکھتے ہوئے اگر ان کو ایشیا کا اہم ترین شخص قرار دیا جائے، تو مغالطہ آرائی نہیں ہوگی۔

☆☆☆

---

(۱) ملاحظہ ہو: نیویارک ٹائمز میگزین، مورخہ ۱۹- جولائی ۱۹۴۲ء۔

تیسرا باب

ایک عظیم شخصیت سے بات چیت

ایشیا کے اہم ترین شخص کی عمر ۶۷ سال ہے۔ وہ دراز قد، دُبلے پتلے اور خوشنما دکھائی دیتے ہیں۔ ایک آنکھ کی عینک، جس میں گہرے رنگ کی ریشمی ڈوری پڑی ہوتی ہے اور کلف لگے ہوئے سفید کالر کے ساتھ جو وہ گرم ترین موسم میں بھی پہنتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر پیئن کے کسی عالی نسب انسان، پُرانے سکول کے کسی مدبر کا گمان ہوتا ہے ان جیسے لوگ ہمیں سینٹ جیمز کلب میں لائمپس پڑھتے، اور Contrexeville سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نظر آتے تھے، جس کا جام میلبا ٹوسٹ (Melba Toast) سے بھرے ہوئے کوئین اینی ٹوسٹ ریک (Queen Anne toast rack) پر رکھا ہوتا تھا۔

میں نے مسٹر جناح کو ''ایشیا کا اہم ترین شخص'' اس لیے قرار دیا تھا، کہ آپ انھیں نمایاں طور پر یاد رکھ سکیں۔ اگرچہ حد سے بڑھی ہوئی تعریف کی طرح اس بات کو بھی معرض بحث بنایا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری تعریف سچ سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ ہندوستان آئندہ چند برس تک دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بنا رہے گا اور اس میں مسٹر جناح کو سٹریٹیجک (Strategic) اہمیت حاصل ہے، وہ اس جنگ کو ادھر یا اُدھر، جس طرف لے جانا چاہیں، لے جا سکتے ہیں۔ ان کے دس کروڑ مسلمان، آگے پیچھے دائیں بائیں ہر طرف جا سکتے ہیں۔ لیکن صرف ان کے کہنے پر کسی اور کے نہیں۔ یہ ہے اصل نکتہ۔ ہندوؤں کی صفوں میں یہ بات نہیں وہاں اگر گاندھی چلے جاتے ہیں تو ان کی جگہ لینے کو نہرو، یا راجگوپال اچاریہ، پٹیل اور دوسرے درجنوں لوگ موجود ہیں۔ لیکن اگر جناح چلے جاتے ہیں تو ان کی جگہ لینے کے لیے کون ہے؟

یہ سب کچھ کہنے سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ جناح کے چلے جانے سے مسلم لیگ ختم ہو جائے گی .... وہ بہت طاقتور اور ہم خیال لوگوں کی تنظیم ہے .... لیکن جناح کے جانے کے بعد یہ کیا کرے گی، اس کا اندازہ لگانا بہت ہی دشوار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بالکل پٹڑی سے اُتر جائے اور ہندوستان میں خون خرابہ شروع کر دے، ایک نئی جنگ کا آغاز کر دے۔ لیکن جب تک جناح موجود ہیں، اس قسم کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔

اب آپ کو اس امر کا علم ہو گیا ہوگا کہ اس یک چشمی عینک کی ریشمی ڈوری کے ساتھ، بہت کچھ بندھا

ہوا ہے۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۸- دسمبر ۱۹۴۳ء کو ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ میرے لیے آدھا گھنٹہ نکال سکتے ہیں۔ لیکن یہ ملاقات تین گھنٹے تک جاری رہی۔ اس عرصے میں انھوں نے بہت ساری چیزوں کا تجزیہ کیا۔ جس کا خلاصہ......... ان کی باتوں کا جیتا جاگتا نچوڑ، اس مکالمے میں ہے، جو اگلے صفحات پر درج ہے اور جس کو انھوں نے از راہ مہربانی، خود ہی ایڈٹ کیا ہے۔

ہم ایک خاموش کمرے میں، جس کی کھڑکیاں باغ کی جانب کھلتی ہیں، بیٹھے ہوئے ہیں، اور دنیا کے اہم ترین مسائل پر ایک ایسے شخص سے گفتگو میں مصروف ہیں، جو ان مسائل کو حل کرنے کے لیے قابل ترین شخص ہے۔

۲

مصنف: آپ کے تقریباً تمام ناقد آپ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ آپ نے پاکستان کی تشریح کافی وضاحت سے نہیں کی۔ مثال کے طور پر دفاع، اقتصادیات اور اقلیتوں کے بارے میں بہت ساری تفصیلات ایسی ہیں جن کو دیدہ و دانستہ غیر واضح اور مبہم چھوڑ دیا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ تنقید انصاف پر مبنی ہے۔

جناح: یہ نہ منصفانہ ہے اور نہ ذہانت پر مبنی۔ خاص طور پر جب یہ کسی ایسے انگریز نے کی ہو، جسے اپنی تاریخ کا بھی علم ہو، جس وقت آئرلینڈ *(Ireland)* کو برطانیہ سے الگ کیا گیا، تو اس وقت وہ دستاویز جس میں علیحدگی کی شرائط درج کی گئی تھیں، تقریباً دس سطروں پر مشتمل تھی۔ ایک ناقابل بیان حد تک پیچیدہ تنازعے کو، جس نے صدیوں سے برطانوی سیاست میں زہر گھول رکھا تھا، طے کرنے کے لیے صرف دس سطروں کی ایک دستاویز! باقی تمام تفصیلات مستقبل کے لیے چھوڑ دی گئی تھی......... اور مستقبل عموماً ایک قابل تعریف ثالث کے فرائض انجام دیتا ہے۔ میں تو پاکستان کے اصول اور اس کی تطبیق کے بارے میں دس سطروں سے بہت زیادہ مواد دنیا کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ لیکن ایک ایسا بلیو پرنٹ *(Blue Print)* پیشگی تیار کرنا جس میں تمام تفصیلات طے کی گئی ہوں، کسی بھی شخص کی طاقت سے بعید ہے۔ جب گول میز کانفرنس میں برما (میانمر) کی علیحدگی کا فیصلہ کیا گیا، اس وقت یہ بلیو پرنٹ کہاں تھا؟ جب سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا گیا تب یہ بلیو پرنٹ

کہاں تھا؟ اس کا جواب لامحالہ یہی ہوگا کہ کہیں نہیں۔ اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس کے وجود کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اہم نکتہ یہ تھا کہ علیحدگی کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ باقی تمام کام خود بخود ہوتے چلے گئے۔

مصنف: آپ پاکستان کے اہم اصولوں کو کن الفاظ میں بیان کریں گے؟

جناح: پانچ لفظوں میں "ہندوستانی مسلمان ایک قوم ہیں" اگر آپ اسے تسلیم کرتے ہیں تو آپ کو پاکستان کے اصول کو بھی قبول کرنا ہوگا، بشرطیکہ آپ ایک دیانت دار اور بااصول شخص ہوں۔ باوجودیکہ اس کی راہ میں حائل رکاوٹیں اس سے سوگنا خوفناک ہی کیوں نہ ہوں، جتنی کہ فی الواقع ہیں، تب بھی آپ کو یہ اُصول تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور اگر آپ اس سے انکار کرتے ہیں تو ——

یہاں مسٹر جناح اپنے کندھے اُچکا کر مسکرائے......... معاملہ یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔

مصنف: جب آپ یہ کہتے ہیں کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں، تو کیا آپ کا مطلب مذہبی اعتبار سے ایک جداگانہ قوم کا ہوتا ہے؟

جناح: جزوی طور پر، مکمل طور پر ہرگز نہیں۔ آپ کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام صرف ایک مذہبی عقیدہ نہیں بلکہ ایک حقیقت پسندانہ اور عملی ضابطۂ حیات ہے۔ میں زندگی اور جو باتیں زندگی میں اہم ہوتی ہے، اُن کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میں اپنی تاریخ، اپنے ہیروز، اپنے فن تعمیر، اپنی موسیقی، اپنے قوانین اور اپنی فقہ کے بارے میں سوچتا ہوں۔

مصنف: پلیز میں ان باتوں کو لکھنا چاہتا ہوں۔

جناح: (ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد) ان تمام باتوں میں ہمارا نقطۂ نظر نہ صرف ہندوؤں سے بنیادی طور پر مختلف ہے، بلکہ زیادہ تر چیزوں میں اُصولی طور پر معاندانہ ہے۔ ہم بالکل مختلف ہستیاں ہیں۔ زندگی کی کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو ہمیں ایک ساتھ رکھ سکے۔ ہمارے نام، ہمارا لباس، ہماری خوراک سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہماری اقتصادی زندگی، تعلیم کے بارے میں خیالات، عورتوں کے ساتھ برتاؤ، جانوروں کے ساتھ ہمارا رویہ، ہر چیز جداگانہ ہے۔ ہم زندگی کے ہر مقام پر ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر گائے کا ازلی مسئلہ ہی لے

لیجیے۔ ہم گائے کا گوشت کھاتے ہیں۔ ہندو اس کی پوجا کرتے ہیں۔ بہت سے انگریز سمجھتے ہیں کہ گائے کی پوجا صرف ایک رسم ہے، جو صدیوں سے چلی آ رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ گائے کا یہ مسئلہ پولیس کے لیے ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ ہندوؤں نے گائے کو سرعام ذبح کرنے کے خلاف شدید ترین احتجاج شروع کر دیا تھا۔ لیکن گائے کا یہ مسئلہ تو ہزاروں ان مسئلوں میں سے صرف ایک ہے جن پر اختلاف پایا جاتا ہے (وقفہ) تم نے کیا لکھا ہے؟

مصنف: میں نے لکھا ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں۔

جناح: اور کیا تمھیں اس بات پر یقین ہے؟

مصنف: ہاں، مجھے اس بات پر یقین ہے۔

جناح: (ایک مسکراہٹ کے ساتھ) اور کوئی سوال؟

مصنف: میرے پہلے سوال کا تعلق اقتصادیات سے ہے۔ پاکستان میں مسلمان امیر تر ہو جائیں گے یا غریب تر؟ اور کیا آپ باقی ہندوستان کے خلاف ٹیرف کی پابندیاں عائد کریں گے؟

جناح: اس کے جواب میں، میں بھی تم سے ایک سوال پوچھنا چاہوں گا۔ کیا تم جرمنی کے ماتحت ایک امیر انگلینڈ کو پسند کرو گے یا ایک غریب لیکن آزاد انگلینڈ کو۔

مصنف: اس سوال کا جواب تو ظاہر ہے، مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔

جناح: بالکل ٹھیک۔ لیکن کیا اس کے بعد تمھارا سوال قدرے دقیانوسی نہیں لگ رہا۔ یہ عظیم آئیڈیل، ذاتی آرام یا عارضی آسائشوں کے سوال سے بدرجہا بلند تر ہے۔ مسلمان لوگ ایک سخت جان، پتلی دبلی اور جفاکش قوم کے افراد ہیں۔ اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ وہ کچھ زیادہ سخت جان ہو جائیں تو انھیں اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن اس بات کا یہ مطلب نہیں کہ لازمی طور پر ایسا ہی ہوگا۔ اس بات کا کوئی جواز نہیں کہ قومیت کا تحفہ، اقتصادی مشکلات کا باعث بنے۔ اس میں شک و شبہ نہیں کہ مسلمان قوم صنعتی اعتبار سے بہت پیچھے ہے اور وہ فوری طور پر خود کفیل بھی نہیں ہوگی۔ لیکن دس کروڑ افراد پر مشتمل ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ان کی اقتصادی حالت، اُن حالات سے بدتر نہیں ہو سکتی، جس میں اس کے افراد بکھرے بکھرے اور غیر منظم ہوں گے، جہاں وہ ۲۵ کروڑ ہندوؤں کے

غلام ہوں گے، جو ان کا استحصال کرنے پر مصر ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ورسیلز (Versailles) کے معاہدے کے بعد، یورپ کے کسی ملک کا کوئی باشندہ کھڑے ہو کر یہ اعلان کیسے کر سکتا ہے کہ پاکستان اقتصادی طور پر ایک ناکام ملک ثابت ہوگا۔ جن عظیم دماغوں نے یورپ کو مغربی اور متحارب سرحدوں میں تقسیم کر کے، اسے پیوندکاری کے ایک مضحکہ خیز نمونے میں تبدیل کر دیا تھا، ہمیں اقتصادیات کا درس دینے کے اہل نہیں ہو سکتے، خاص کر اس صورت میں جبکہ ہمارا مسئلہ، ان کی نسبت بہت سادہ ہے۔

مصنف: اور کیا اس کا اطلاق دفاع پر بھی ہوتا ہے؟

جناح: جی ہاں، اس کا اطلاق دفاع پر بھی ہوتا ہے۔ میں آپ سے پھر ایک سوال کرتا ہوں۔ افغانستان کا دفاع کیسے ہوتا ہے، اس کا جواب زیادہ پیچیدہ نہیں۔ افغان اپنے ملک کا دفاع کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح پاکستان کا دفاع بھی ہوگا۔ ہم ایک بہادر اور متحد قوم ہیں، جو کام کرنے کے لیے ہمیشہ مستعد اور ضرورت کے وقت جنگ کرنے کو بھی تیار رہتی ہے۔ لہٰذا دفاع کے مسئلے میں کوئی خاص دشواری پیش آنے کا سوال ہی نہیں۔ ہم میں اور دنیا کی دوسری قوموں میں کیا فرق ہے؟ مثال کے طور پر ایران میں اور ہم میں۔ اور یہ بات بالکل واضح کہ ہمیں تبدیلی کے لیے وقت ملے گا۔ ہم انگریزوں سے یہ مطالبہ نہیں کر رہے کہ وہ ہندوستان سے فوری طور پر نکل جائیں۔ برطانیہ تمام بدنظمی پھیلانے کا ذمہ دار ہے اور اب اسے ختم کرنے میں بھی انگریزوں کو ہماری مدد کرنی چاہیے۔ لیکن ایسا کرنے سے قبل انھیں بہت ساری باتوں پر غور کرنا ہوگا .... اور اس پر مجھے یاد آیا کہ میرے پاس ایک چیز ہے جو میں تمھیں دکھانا چاہوں گا۔

مسٹر جناح مجھ سے اجازت لے کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نے سگریٹ سلگائی اور انتظار کرنے لگا اور مجھے یک دم احساس ہوا کہ ایک بات ہو رہی ہے۔ بلکہ نہیں ہو رہی۔ مجھے غصہ نہیں آ رہا تھا۔ جناح نے تقریباً تقریباً، وحشیانہ الفاظ میں برطانوی پالیسیوں پر تنقید کی تھی۔ (میں نے اس مکالمے میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے) لیکن ان کی تنقید نہایت واضح اور تخلیقی تھی۔ ہندوؤں کی تنقید کی طرح گرما گرم الفاظ کا مجموعہ یا نفرتوں اور غلط باتوں کا معجون مرکب نہیں تھی۔ اُن کی تنقید کسی مرض کی تشخیص کی مانند تھی۔ جناح اور ایک مثالی ہندو سیاست دان کے درمیان اتنا ہی فرق تھا جتنا

کہ ایک سرجن اور جن نکالنے والے ایک عامل کے درمیان ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جناح ایک ایسے سرجن ہیں، جس پر آپ اعتماد کر سکتے ہیں، خواہ اس کا فیصلہ کتنا ہی سنگ دلانہ ہو۔

پاکستان کے مسئلے سے نمٹنے سے پہلے جناح نے کہا تھا "انگریزوں کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ اس ملک میں ان کا کوئی دوست نہیں ہے۔ کوئی ایک فرد بھی۔"

ایک ہندو سیاست دان نے یہی لفظ نہایت بلند آواز میں خوشی کے ساتھ کہے ہوتے۔ جناح نے نہایت دھیمے انداز میں اور اظہار تاسف کے ساتھ یہ لفظ کہے۔

چلیے، وہ پھر کمرے میں داخل ہو گئے ہیں اور ایک کتاب لے کر آئے ہیں۔

جناح: تمھیں یاد ہوگا کہ ایک منٹ پہلے میں نے کہا تھا کہ انگریزوں کو بہت زیادہ غور و فکر کرنا پڑے گا۔ لیکن، انگریز اس عادت کو اپنے مزاج کے موافق نہیں پاتے۔ وہ آرام کرنے اور اس انتظار میں بیٹھے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں کہ ہر چیز، آخر میں، خود بخود ٹھیک ہو جائے گی۔ اس کے باوجود جب وہ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں، تو ان کی فکر بھی اتنی ہی واضح اور تخلیقی ہوتی ہے جتنی دنیا میں کسی شخص کی ہو سکتی ہے۔ ان کے عظیم مفکروں میں............ کم از کم ہندوستان کے مسئلے کے بارے میں ...... جان برائٹ (John Bright) بھی شامل ہیں۔ تم نے ان کی تقریروں کا مجموعہ پڑھا ہے؟

مصنف: کم سے کم سکول سے نکلنے کے بعد تو نہیں پڑھا۔

جناح: اچھا تو اسے پڑھو۔ یہ پچھلے دنوں مجھے اتفاق سے مل گئی تھی۔ انھوں نے کتاب میرے ہاتھ میں دی۔ یہ کتاب "The Speeches of John Bright" کا ایک بوسیدہ اور پرانا نسخہ تھا، اور جس جگہ سے کتاب کھول کر مجھے دی گئی تھی وہاں دنیا کے اس عظیم ترین مقرر کی یہ تقریر درج تھی جو انھوں نے دارالعوام میں ۴- جون ۱۸۵۸ء کو کی تھی۔

"برطانیہ، ہندوستان پر کب تک راج کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ کوئی شخص اس کا جواب نہیں دے سکتا لیکن یہ مدت خواہ کتنی بھی ہو، پچاس سال، سو سال یا پانچ سو سال، سوال یہ ہے کہ کیا کوئی شخص، جس کے ذہن میں شعور کی ہلکی سی رمق بھی ہو، اس بات پر یقین کر سکتا ہے، کہ اتنے بڑے ملک کو ...... جس میں ۲۰ قومیتوں کے لوگ رہتے ہیں، اور ۲۰ مختلف زبانیں بولتے ہوں، کبھی بھی یک جا کیا جا سکتا ہے؟ اور اس کو ایک منظم، مضبوط اور پائیدار سلطنت کی شکل دی جا سکتی ہے؟ مجھے تو یقین ہے

کہ ایسا ہونا قطعاً ناممکن ہے۔"

میں نے کتاب انھیں واپس کر دی۔

جناح: جو بات برائٹ نے اس وقت کہی وہ آج سچ بن کر ہمارے سامنے ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ بات آج پہلے کی نسبت کہیں زیادہ سچ ہو گئی ہے، اگرچہ آج کل ہمارا زور ۲۰ قوموں پر نہیں بلکہ صرف دو قوموں پر ہے۔ ہندو اور مسلمان۔ اور یہ بات پہلے سے زیادہ سچ کیوں ہو گئی ہے۔ وقت نے ہمیں قریب تر کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ آج کا مسلمان بیدار ہو چکا ہے۔ اس نے تلخ تجربات سے یہ جان لیا ہے کہ "متحد ہندوستان" میں ہندو، مسلمانوں کے ساتھ کس قسم کا سلوک روا رکھیں گے۔ ایک "متحد ہندوستان" کا مطلب ایک ایسا ہندوستان ہے جس میں ہندوؤں کا غلبہ ہو۔ اس کے معنی صرف یہی ہیں۔ اس کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہے۔ اس کو کوئی اور معنی پہنانے کی کوشش قطعاً لایعنی ہے۔ "ہندوستان" برطانیہ کی ایجاد ہے۔ یہ ایک انتظامی یونٹ ہے جس پر بیوروکریسی تلوار کے زور پر راج کر رہی ہے۔ یہ ایک کاغذی تخلیق ہے جس کا اصل میں کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

مصنف: اس سلسلے میں ستم ظریفانہ بات یہ ہے کہ آپ کے ناقد کہتے ہیں کہ پاکستان خود بھی برطانیہ کی تخلیق ہے...... وہ پاکستان کو "تقسیم کرو اور راج کرو" کا اصول منطبق کرنے میں برطانیہ کی ذہانت کی مثال قرار دیتے ہیں۔

جناح: (قدرے گرمی سے) جس شخص نے یہ بات کہی ہے، اس نے میری دیانت داری پر شک کرنے کے علاوہ برطانوی ذہانت کی بھی توہین کی ہے۔ اگر کوئی چیز برطانیہ کو ہندوستان میں رکھتی ہے تو وہ "متحدہ ہندوستان" کا وہ غلط تصور ہے، جس کا پرچار گاندھی کرتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ متحدہ ہندوستان، ایک برطانوی تخلیق ہے، یہ ایک خیالی وجود ہے...... ایسا خطرناک خیالی وجود جو کبھی ختم نہ ہونے والے جنگ و جدل کا باعث بن سکتا ہے۔ جب تک یہ جنگ جاری رہے گی انگریزوں کے پاس ہندوستان میں رہنے کا ایک بہانہ موجود رہے گا۔ یہاں "تقسیم کرو اور راج کرو" کے اصول کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

مصنف: اور آپ کی خواہش ہے "تقسیم کرو اور چلے جاؤ"۔

جناح: آپ نے یہ بات بہت خوبصورت الفاظ میں پیش کی ہے۔

مصنف: کیا آپ کو احساس ہے کہ یہ بات برطانوی ووٹروں کو چونکا دے گی۔

جناح: سچ اکثر چونکا دینے والا ہی ہوتا ہے۔ پھر اس سچ کی تخصیص کیوں؟

مصنف: کیونکہ ایک اوسط، شایستہ اور آزاد خیال ووٹر، چاہتا ہے کہ برطانیہ اپنے وعدوں کو نبھائے اور ہندوستان کو آزادی دے، لیکن اسے اس سلسلے میں صرف کانگریس کا نقطۂ نظر معلوم ہے۔ مغرب میں مسلمانوں کی ترجمانی کرنے والا کوئی شخص تو ہے ہی نہیں۔

جناح: (تلخی سے) مجھے اس بات کا بخوبی علم ہے۔ ہندوؤں کے پاس نہایت مؤثر اور طاقتور پریس ہے۔ کانگریس اور مہاسبھا کی پشت پر ہندو سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی دولت ہے جو مسلمانوں کے پاس نہیں ہے۔

مصنف: اس بات کا نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی ووٹر یہ سمجھتے ہیں کہ کانگریس اور ہندوستان ایک ہی ہیں اور کیونکہ کانگریس اس بات کو دہراتے نہیں تھکتی کہ ہندوستان ایک اور ناقابلِ تقسیم ہے، لہٰذا برطانوی ووٹر سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کو تقسیم کرنا آزاد خیالی کے منافی، رجعت پسندانہ اور دغابازی پر مبنی ہے۔ وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر یقین رکھتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بات ان کی سوچ کے خلط ملط ہونے کی نشان دہی کرتی ہے لیکن ہماری طرح کی ہر جمہوریت میں، جہاں ووٹروں کو نہایت پیچیدہ مسائل کے بارے میں فیصلے کرنے پڑتے ہیں، اس قسم کی سوچ اکثر پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات ابھی ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ واحد آزاد خیال، غیر متعصبانہ، اور اس بات میں اپنی نیک نیتی ظاہر کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کو چھوڑ دیں اور عنانِ حکومت............،

جناح: آپ اس میں ان الفاظ کا بھی اضافہ کر سکتے: ''اور واحد محفوظ راستہ ہے۔''

جناح اور مصنف بیک وقت: ''پاکستان!''

۳

اس مکالمے میں ہم نے پاکستان کا نچوڑ یا کم از کم اس کی روح کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ پاکستان کے سارے منصوبے کی مکمل تفصیلات بیان کرنا، اس حجم کی کتاب میں بالکل ناممکن ہے۔ اس کے لیے سینکڑوں صفحوں پر مشتمل نقشے اور اعداد و شمار پیش کرنے ہوں گے اور تفصیلات کی یہ تلاش ہمیں ہندوستان کی سرحدوں

کے پار بہت دور تک لے جاتی اور ہمیں بہت ساری غیر منافع بخش قیاس آرائیوں میں اُلجھا دیتی ہے۔

یہ بات تقریباً یقینی معلوم ہوتی ہے کہ جو شخص کھلے ذہن کے ساتھ، کسی تعصب کے بغیر، اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرے گا، وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ پاکستان کو اقتصادی، نسلی، سیاسی، یا فوجی حکمت عملی کے بارے میں، ایسی مشکلات نہیں پیش آئیں گی جنھیں حل نہ کیا جا سکے۔ بلکہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ یورپی ممالک نے گزشتہ پچاس برسوں میں، جن ایسے ہی مسائل کو کامیابی سے حل کیا ہے، پاکستان اُن کو نہایت آسانی سے حل کر لے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک بڑا سرجیکل آپریشن ہے۔ لیکن قوموں کی زندگی میں، افراد کی طرح، ایسے مرحلے آتے ہیں جن میں ایک بڑا سرجیکل آپریشن، نہ صرف ایک بہتر علاج ہوتا ہے بلکہ انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ ہندو اور مسلمان قوموں کے درمیان مسلسل جنگ سے سیاست میں کچھ ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے، جس کی کینسر سے بہت مشابہت ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ کینسر جب بڑھ جاتا ہے تو اس کا ایک ہی علاج ممکن رہ جاتا ہے یعنی نشتر۔ گاندھی کے عقیدے کے مطابق علاج کے طریقے، اور انگریزوں کے تسکین بخش شربت اور عطائیوں کی تمام خوبصورت ایجادات جو دنیا بھر میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہیں، سب بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ وہ تمام مریض کی حالت بگاڑ دیتی ہیں، اور اس کے آخری علاج کو اور زیادہ مشکل بنا دیتی ہیں۔ آخر کار نشتر ہی کام آتا ہے اور ایک نشتر جو تیزی اور درستی کے ساتھ کاٹ دے، تاریکی میں اندھا دھند ہر چیز کو کاٹتی ہوئی ہزار تلواروں سے بہتر ہوتا ہے۔

پاکستان کے بارے میں اس تمام بحث میں جو بات انتہائی حیرت انگیز ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کے حقیقت پسند افراد آہستہ آہستہ اس کے حامی ہوتے جا رہے ہیں، بلکہ ہندوستان کے نیک نیت حامیوں کی جانب سے اس کی مسلسل مخالفت ہے۔ اس کی وجہ کانگریس کا زوردار اور مسلسل پروپیگنڈا ہے جس کو بڑے ہندو کاروباریوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ پروپیگنڈے میں ہندوؤں کو تقریباً اجارہ داری حاصل ہے۔ وہ نہایت عیاری کے ساتھ اور مسلسل دنیا کے دلوں میں یہ بات ڈالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، کہ کانگریس ہی ہندوستان ہے اور ہندوستان کو تقسیم کرنے کی کوشش برطانیہ کی ایک ناپاک سازش ہے، اور وہ ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کے آزمودہ اُصول پر عمل کر رہا ہے۔

مغرب کے زیادہ تر آزاد خیال لوگ اس پروپیگنڈے کا بُری طرح شکار ہو گئے ہیں۔ نتیجتاً ہمیں یہ غیر معمولی نظارہ، دیکھنے کو مل رہا ہے، کہ ''ترقی یافتہ'' انگریز سیاست دان، دارالعوام میں کھڑے ہو کر انتہائی

خلوص کے ساتھ، ہندوستان کی آزادی کے مشترکہ نصب العین کے حصول کے لیے، ہندوستان کو متحد رکھنے کے حق میں دلیلیں دے رہے ہیں۔ وہ اس بات سے قطعاً ناآشنا ہیں کہ ہندوستان کا یہ نام نہاد اتحاد ہی ہندوستان میں برطانوی راج کا سب سے بڑا سبب ہے۔

متحد رکھو اور حکومت کرتے رہو۔

تقسیم کرو اور نکل جاؤ۔

جو اشخاص ہندوستان اور اس کے مسائل کے بارے میں اپنی رائے دے رہے ہیں، ان کی میزوں پر یہ الفاظ نمایاں طور پر نظر آنے چاہئیں۔

کانگریس کے پروپیگنڈے کی کامیابی کا ایک اور بھی زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اُسے ایسے مردوں اور عورتوں کے انبوہ کثیر نے تسلیم کیا ہے، جو ہندوستان کے سوا، دنیا کے ہر خطے میں مظلوم اقلیتوں کی شکایتیں سن کر فی الواقع بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو اگر شبہ بھی ہو جائے کہ کسی شخص نے سلواک باشندوں کی توہین کی ہے تو اس پر بحث کے لیے کمیٹیوں کے ہنگامی اجلاس بلانے شروع کر دیتے۔ شمالی اٹلی کے آسٹرین باشندوں یا رومانیہ میں ہنگری کے باشندوں کے بارے میں وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے، اس پر بالکل خاموش رہتے ہیں حالانکہ ان کا قومیت اور آزادی کا دعویٰ انتہائی قدیم اور فوری توجہ کا طالب ہے۔ اگر یہ لوگ حقیقتاً اتنے مخلص نہ ہوتے تو ان پر ایسے ریاکارانہ نسلی امتیاز کا الزام عائد ہوتا جس کی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

میری خواہش ہے کہ میرے پاس اتنی گنجایش ہوتی کہ ہم اس بات کا جائزہ لے سکیں کہ برطانوی حکومت، اگر ''تقسیم کرو اور نکل جاؤ'' کی پالیسی کو اپنا لے، تو دنیا پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ میرے خیال میں تو نتیجہ نہ صرف ہندوستان کے لیے مفید ہوگا بلکہ خود برطانیہ اور ساری انسانیت اس سے مستفید ہوگی۔ یہ ''وقت کے مارچ'' میں آگے کی طرف ایک قدم ہوگا۔ اس سے دنیا کا جسم، بہت سارے خطرناک مواد سے پاک ہو جائے گا اور اگر یہ کام جلدی، واضح انداز میں اور کسی قسم کا سمجھوتہ کیے بغیر انجام دیا جائے تو ممکن ہے کہ برطانیہ کو بھی اس سے بہت فائدہ ہو۔ صرف تجارت میں نہیں بلکہ روحانی فائدہ بھی پہنچے، اور اس عظیم مسلمان دنیا کے ساتھ ہمیں اپنے تعلقات کی یاد دوبارہ آجائے، جس کے ساتھ، ہمارے رشتے نہایت گہرے ہیں۔ اگر ہم تسلیم کریں تو۔

نوشتہ مابعد:

میرے ایک دوست نے جنھوں نے یہ باب پڑھا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''جناح، جیسا کہ آپ نے ان کی تصویر پیش کی ہے، ایک قابلِ یقین شخصیت معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا وہ واقعی مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کیا مسلم لیگ اور مسلم ہندوستان واقعی یکساں ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پاکستان واقعی جیتتا ہوا نظر آتا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے، اگر مسلم لیگ کے مخالف لوگوں کی تعداد بھی کافی ہے، تو آپ کی تمام دلیلیں بے کار اور ناکام ثابت ہوں گی۔''

یہ ایک اہم نکتہ ہے، اور جواب کا مستحق۔ اس کا جواب نہایت مختصر الفاظ میں دیا جا سکتا ہے۔

اگر مسلم لیگ، مسلم ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتی، تو ہم آہستہ سے، شایستہ انداز میں، سوال کر سکتے ہیں کہ کون کرتا ہے؟ اگر کوئی دوسری جماعت مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کی دعویدار ہے، تو وہ کون سی ہے؟ وہ کہاں چھپی بیٹھی ہے اور اگر مسلمانوں کی صفوں میں مسلم لیگ کی مخالفت کا ذرا سا شائبہ بھی ہے تو کانگریس اس کے وجود سے کیوں ناواقف ہے۔ کانگریس اپنی تمام شکایتیں، بلند آواز اور تلخ، مسلم لیگ تک ہی کیوں محدود رکھتی ہے۔ کانگریس ہر روز یہ اعلان کیوں کرتی رہتی ہے کہ ہمیں، مسلم لیگ کے ساتھ کسی تصفیے پر پہنچنا ہوگا؟ گاندھی اپنی تمام دلیلوں، ہر تنبیہ، ساری ڈانٹ ڈپٹ میں، مسلم لیگ کے رہنما جناح کو ہی اپنا مخاطب کیوں بناتے ہیں؟

اس سوال کا جواب یقیناً واضح ہے۔ کیونکہ مسلم لیگ ہی مسلم ہندوستان ہے۔ اس کے خلاف کوئی مخالفانہ آواز بلند نہیں ہوتی کیونکہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کے عزم کا مکمل اظہار ہے۔

جن لوگوں کو اعداد و شمار سے دلچسپی ہے، ان کے لیے اعداد و شمار بھی بہت واضح اور قائل کر دینے والے ہیں۔ گزشتہ سات سال کے دوران ایک نشست کے سوا ہندوستان میں ہر جگہ، جہاں مسلمانوں نے ضمنی انتخابات میں حصہ لیا ہے، وہاں مسلم لیگ کا امیدوار کامیاب ہوا ہے۔ [1] مسلم لیگی اُمیدوار سو فی صد پاکستان کے حق میں تھے۔ ان کے پروگرام میں اس بات کا شائبہ بھی نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے سلسلے میں کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہیں یا ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔ انھوں نے ہر مقام پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی۔ بنگال میں، آسام میں، شمال مغربی سرحدی صوبے اور سندھ میں ہر اس مقام پر جو پاکستان کا حصہ

(۱) یہ عجیب واقعہ یوپی کی ایک نشست پر پیش آیا تھا جہاں مقامی اور ذاتی مفادات نے مسائل کو الجھا دیا تھا۔

بن سکتا تھا۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں بھی مسلمانوں کے لیے ۳۰ مخصوص نشستوں میں سے ۲۸ پر کٹر مسلم لیگی قابض ہیں۔

اگر اس سے بھی مسلمانوں کے عزم کا اظہار نہیں ہوتا، تو میں یہ سوال کرنے میں بالکل حق بجانب ہوں کہ یہ کس بات کی علامت ہے۔

☆☆☆

چوتھا باب

بھوک

اور اب وقت آ گیا ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ انگریز ان مسئلوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ اس کتاب میں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ ہم کوئی عمومی جائزہ لے سکیں۔ لہٰذا ہم اپنی توجہ صرف ایک واقعے کی جانب مرکوز کرنے پر اکتفا کریں گے جو حال ہی میں دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے............ بنگال کا حالیہ قحط۔

اس قحط کو خاص طور سے منتخب کرنے کی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے پہلی اور اہم ترین وجہ تو یہ ہے کہ یہ قحط اتنا دل دہلا دینے والا اور روح فرسا تھا، کہ عالمی ضمیر کو اس کی یاد دلاتے رہنا ضروری ہے۔ ہر برطانوی اور ہندوستانی سیاست دان کے کیلنڈر میں، ہر موسم گرما کے آغاز پر، ایک مختصر سی یادداشت درج ہونی چاہیے جو اسے ۱۹۴۳ء میں پیش آنے والے اس ہولناک واقعے کی یاد دلاتی رہے، اور اس بات کا احساس دلاتی رہے کہ آئندہ اس قسم کے دلآویز واقعات دوبارہ پیش نہیں آنے چاہئیں۔

لیکن اس المیہ کی یاد تازہ کرنے کی ایک اور اہم وجہ بھی ہے۔ برطانیہ میں ہی نہیں، سمندر پار کے ممالک میں بھی رائے عامہ کا بہت بڑا حصہ، اس کو برطانیہ کے ریکارڈ پر ایک بدنما داغ تصور کرتا ہے۔ برطانیہ کے عوام، اپنی گرم جوشی اور خلط ملط ذہنوں کے ساتھ، ہمیشہ غلط نتیجہ اخذ کرنے میں اذیت پسندانہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس موقعے پر بھی انھوں نے حالات و واقعات کا سرسری جائزہ لیے بغیر تمام الزام خوشی خوشی اپنے سر لے لیا۔ وہ لوگ جنھیں بنگال کی حکومت کے طریق کار کا تھوڑا بہت علم تو کجا، یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بنگال نقشے میں کہاں واقع ہے، کانگریسی پروپیگنڈے کے ہر الزام کو دہرانے لگے اور خود بخود یہ فرض کر لیا کہ موقعے پر موجود برطانوی افسر جو بیانات دے رہے ہیں، سراسر جھوٹ پر مبنی ہیں۔ برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہندوستانی طلبہ کو، جو لازمی طور پر حقائق سے نا آشنا تھے، ہاتفِ غیبی قرار دے دیا گیا، اور بیس بیس سال کا تجربہ رکھنے والے برطانوی سرکاری ملازموں کو، ان کا نقطۂ نظر سنے بغیر ہی، سزا سنا دی گئی۔ یہ ہماری قومی ذہنیت کی ایک نمایاں مثال ہے، جس کو "انصاف پسندی" کا نام دیا جاتا ہے، لیکن بسا اوقات، جیسا کہ اس موقع پر اس کو "مریضانہ ذہنیت" قرار دینا بہتر ہوتا ہے۔

لیکن میں یہ باب کسی بھی برطانوی یا ہندوستانی سیاسی گروپ کی حمایت کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اُن قابلِ رحم عوام کی ترجمانی کی خاطر تحریر کر رہا ہوں جو عام طور سے باہمی بحث و تمحیص کے درمیان تقریباً نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔

۲

بھوک بہت ظالم کارٹونسٹ ہے۔ یہ ایک بچے کے نازک بدن کو لے کر اپنے قلم کی ایک لائن سے اس کا پیٹ اس قدر پھلا دیتی ہے کہ ہر شخص کو گمان ہونے لگتا ہے کہ خیالی خوراک سے پُر ہے۔ بنگال کے لوگوں کی المناک تصویروں میں بچوں کی تصویریں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں جب یہ بچے خوراک کی تلاش میں گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے تو ان کے چہرے ہڈیوں پر تنے ہوئے کسی ماسک کی طرح نظر آتے تھے، ہاتھ پاؤں سوکھی ہوئی ٹہنیوں کی مانند دکھائی دیتے تھے لیکن ان کے پیٹ بے ڈھنگے طریقے پر پھولے ہوئے ہوتے، جیسے وہ ان کی بھوک کا مذاق اُڑا رہے ہوں۔ تاہم بالغ لوگوں میں بھوک کی یہ عجیب و غریب علامت نظر نہیں آتی تھی۔ ان کے پیٹ نظر ہی نہیں آتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نچلی پسلیوں اور رانوں کے درمیان براؤن رنگ کی کھال کا ایک پیوند لگا ہوا ہے۔ وہ بھی زندہ کارٹون نظر آتے تھے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران ہم سب نے وہ پوسٹر دیکھے ہیں جن میں یورپ کے مظلوم عوام کی حالت کی عکاسی کی گئی ہے۔ ہم سب ان تصویروں سے آشنا ہیں جن میں ایک ماں، جو خود بھی بھوک سے ڈھانچہ ہوگئی ہے، اپنے مرتے ہوئے بچے کو گود میں لیے کھڑی ہے۔ نوجوان جسم جو سمٹ کر فقط ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے ہیں، اپنی اندھی آنکھوں سے ہولناک آسمان کو گھور رہے ہیں۔ بس یہی حال کلکتہ کا بھی تھا۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو زندگی نہیں، کوئی خوفناک ڈراما ہے جس کے پروڈیوسر نے اس کی تیاری میں بے حد مغالطہ آرائی کی ہے۔ کسی انسان کے گالوں کی ہڈیاں اس طریقے سے باہر کیسے نکل سکتی ہیں؟ انسان کی پسلیاں اتنی نمایاں کس طرح ہو سکتی ہیں؟ شانوں کو دیکھ کر یہ خوفناک تاثر کس طرح مل سکتا ہے کہ ہڈیوں کے ایک لمبے چوڑے ڈھانچے پر کسی نے کپڑا ٹانک دیا ہے؟

"نہیں یہ زندگی نہیں ہے۔ یہ تو سنسنی خیز ڈراما ہے۔ وہ بھی نہایت گھناؤنا"۔ ہر شخص یہی سوچتا ہے اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ کوئی پروڈیوسر اتنے ہولناک واقعات، اتنی بڑی تعداد میں پیش کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ چوہوں کو ہی لے لیجیے۔ اگر یہ کوئی ڈراما یا فلم ہوتی تو اس میں چوہے، چھوٹے چھوٹے نظر آتے۔

لیکن رات گئے چورنگھی کی محرابوں تلے یہ مناظر اکثر دیکھنے میں آتے تھے کہ مجبور اور بے کس لوگ بڑی تعداد میں جمع ہیں، جنھیں نہ دنیا کا کچھ ہوش ہے نہ پرواہ، اور ان کے پیچھے سایوں میں دبک کر پھرتے ہوئے چوہے کتوں جتنے بڑے نظر آتے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گٹروں میں پلنے والے ان بدنصیب انسانوں کی طاقت رفتہ رفتہ زائل ہو جاتی اور اس کے ساتھ ساتھ چوہے پہلے سے زیادہ بے خوف اور نڈر ہو جاتے تھے۔ اب وہ انسان سے ڈرنے کی بجائے بچوں کے اوپر چڑھنے لگے تھے، انھیں جلدی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی آنکھوں میں چمک تھی، جیسے کہ وہ ان بدقسمت لوگوں کی موت کا انتظار کر رہے ہوں۔

کوئی بھی فلم ڈائریکٹر اس قسم کی فلموں کو پاس نہیں کرتا، اس پر واقعات کو ایک بگڑی ہوئی شکل میں پیش کرنے کا الزام عائد ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ پیروڈی نہیں تھی۔ سیدھا سیدھا ایک واقعہ تھا۔

کلکتہ جانے سے قبل میں نے وہاں کی بہت ساری کہانیاں سُن رکھی تھیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ ناقابلِ یقین کہانی کا تعلق اس بچی کچھی اور گلی سڑی خوراک کے لیے جو لوگ مونسپلٹی کے کوڑے دانوں میں پھینک دیتے تھے، فاقہ کشوں کے درمیان لڑائی سے تھا۔ ان لڑائیوں کی کہانیاں بار بار شائع ہوتی تھیں اور ہر بار اس قدر تکلیف دہ اور کربناک تفصیلات کے ساتھ، کہ ان کی حقیقت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ یہ کہانیاں بوگس اور جھوٹ پر مبنی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن کلکتہ پہنچنے کے چند گھنٹے بعد ہی میں نے بعینہٖ ایک ایسی ہی لڑائی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ میں ایک گلی سے گزر رہا تھا، کہ مجھے ایک بچے کی چیخ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک بچہ زمین پر گرا ہوا تھا اور اسے پھینکنے والا کوئی اور نہیں اس کا اپنا باپ تھا جو ایک ہاتھ سے کوڑے کے اس بدبودار اور غلیظ ڈھیر میں خوراک تلاش کر رہا تھا، اور دوسرے ہاتھ سے اپنے خاندان کے دوسرے افراد کو پرے دھکیل رہا تھا۔ وہ سب کے سب ایک دوسرے پر بھوکے جانوروں کی طرح غرا رہے تھے۔ کبھی کبھی غلاظت کے اس ڈھیر میں سے انھیں کھانے کے لیے کوئی سوکھا ٹکڑا مل ہی جاتا تھا۔

۳

میں اس وقت کلکتہ گیا تھا جب قحط اپنے زوروں پر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حیدر آباد میں مسز نائیڈو نے مجھے کہا تھا کہ "اس بحران نے برطانوی راج کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اتنا کانگریس کے ۵۰ سال کے پروپیگنڈے نے نہیں پہنچایا۔"

مسز نائیڈو، ظاہر ہے کہ اس واقعے پر بہت خوش تھیں۔ بشرطیکہ یہ واقعہ حقیقی ہوتا۔ یہاں یہ شرط

لگانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ مسز نائیڈو نے جن باتوں کو "واقعہ" قرار دیا تھا، وہ صرف کانگریس کا پروپیگنڈا تھیں، جن کا شمار خوش یقینی سے کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر مسز نائیڈو کو ظاہری طور پر اس بات کا یقین تھا، کہ قحط کی بڑی وجہ فوج کا لالچ تھا۔ لیکن یہ بات ایک منٹ میں جھٹلائی جا سکتی ہے، کیونکہ برطانوی فوج چاول کھاتی ہی نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہندوستانی ہر حال میں چاول کھاتے، خواہ وہ وردی میں ہوتے یا نہ ہوتے۔ ایک اور بات اٹلی کے جنگی قیدیوں کے لیے خوراک کے بارے میں کہی جاتی ہے، لیکن انھیں بنگال میں نہیں وسطی صوبے میں قید کیا گیا ہے۔ مسز نائیڈو کے گھرانے میں ایسے "واقعات" کی بہتات تھی۔ ان کی باتیں سُن کر انسان اس مفروضے پر یقین کرنے کو تقریباً تیار ہو جاتا کہ اٹلی کے چند قیدی، لاکھوں ہندوستانیوں کی موت کے ذمہ دار ہیں۔

لیکن ایک ایسے خاندان پر، جو میرے ساتھ اتنی مہربانی سے پیش آیا ہو، اس طرح کہنا میرے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ جب میں حیدرآباد سے رخصت ہوا، تو مسز نائیڈو کا وہ بیٹا جو ایک آیورویدک ڈاکٹر ہے، مجھے چھوڑنے سٹیشن تک آیا تھا، جب ٹرین چھوٹنے لگی تو اس نے مجھے ایک پیکٹ پیش کیا۔ اس پیکٹ کے اندر تانبے کی پلیٹ تھی جس میں تین سوراخ تھے۔ ساتھ ہی یہ ہدایت درج تھی کہ اگر میں اس پلیٹ کو ناف سے تین انچ کی بلندی پر اپنے پیٹ پر لٹکا لوں گا تو یہ ہیضہ کو روکنے میں بہت کارآمد ثابت ہوگی اور کلکتہ میں ان دنوں ہیضہ پھیل رہا تھا۔ مجھے ہیضہ کا یہ علاج اس قدر انوکھا لگا کہ چند روز بعد میں نے ایک یورپین ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ کیا واقعی یہ مجھے ہیضے سے محفوظ رکھنے میں مؤثر ثابت ہوگا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ پلیٹ آپ کو بندوق کی گولی سے تو شاید بچا سکے، لیکن ہیضے کے علاج میں اس کی افادیت، بلاٹنگ پیپر (سیاہی چوس) کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں۔

لیکن یہ بات ہمیں قحط سے متاثرہ علاقوں سے دور رکھنے کا باعث بنی ہوئی ہے، لہٰذا ہم بھی ٹرین کی رفتار سے آگے چلتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ مسز نائیڈو، اپنے اس دعوی میں کہاں تک درست تھیں، کہ اس قحط سے برطانوی راج پر ایک کاری ضرب پڑی ہے۔

ٹرین کو دوپہر کے قریب کلکتہ پہنچنا تھا۔ لیکن جب میں نے صبح ہی صبح کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور راستے کے اس سٹیشن پر، جہاں ٹرین ٹھہری تھی، ایک نظر دوڑائی تو مجھ پر واضح ہو گیا کہ ہم مرتے ہوئے لوگوں کی سرزمین میں داخل ہو چکے ہیں۔ سارے پلیٹ فارم پر جہاں کہیں کچھ سایہ تھا، ہڈیوں کے زندہ ڈھانچوں کے

ہجوم بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ لوگ بالکل خاموش اور تقریباً بے حس و حرکت تھے۔ کبھی کبھی کوئی بچہ بے چینی سے حرکت کرتا تھا یا کبھی کوئی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھانے کے ڈبے کو آہستہ آہستہ اُٹھا کر اس کی خالی گہرائی کو اس طرح گھورتا جیسے اسے کسی ایسے معجزے کی اُمید ہو جس سے اس خالی ڈبے میں خوراک آ جائے۔ میرے کمپارٹمنٹ کے باہر ہی ایک چھوٹی سی لڑکی بیٹھی ہوئی اپنے خالی ناشتہ دان میں اُنگلی پھیر کر انگلی کو چاٹ رہی تھی۔

میں برنارڈ شا کی طرح اس بات کا قائل نہیں ہوں کہ فقیروں کو بھیک نہیں دینی چاہیے۔ یہ درست ہے کہ ایک آئیڈیل سوسائٹی میں، نجی خیرات کی ہدایت نہیں ہوتی لیکن سوسائٹی کیونکہ ابھی تک ایک مثالی سوسائٹی میں تبدیل نہیں ہوئی ہے، یہ امر سنگدلانہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان وسائل کے ہوتے ہوئے بھی کسی دوسرے کی تکلیف کو نظر انداز کر دیا جائے اور مدد سے انکار کے ساتھ ساتھ کسی شاطرانہ اُصول کی باتیں کرنا تو بالکل ہی کھلی بے رحمی ہے۔ یہ تصور کرنا بہت دشوار ہے کہ حضرت عیسیٰ، کسی فقیر کا استقبال، اقتصادیات پر لیکچر سے کریں گے۔

اور اس طرح جب اس لڑکی نے ناشتہ دان میں پھر انگلی پھیرنی شروع کی تو میں نے اپنا سوٹ کیس اُتارا اور جلدی جلدی اس میں کھانے کی چیزیں تلاش کرنے لگا۔ لیکن نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا...... میرے سوٹ کیس سے زبان (tongue) کا ایک چھوٹا سا ڈبا، ٹماٹو جوس کی ایک بوتل، سارڈین مچھلی کا ایک ڈبا اور ڈبا بند بینز (Beans) کے سوا کچھ نہیں تھا...... تاہم میں نے سوچا کہ یہ چیزیں تو اسے دے دی جائیں اور اس کے ساتھ دو ایک روپے بھی۔

میں نے کھڑکی کھولنے کی کوشش کی مگر کھڑکی معمول کے مطابق جمی ہوئی تھی۔ میں کھڑکی پر مزید زور لگانے لگا۔ اس لڑکی کو یہ خوراک دینا، اچانک میرے لیے انتہائی اہم ہو گیا تھا۔

"میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

یہ آواز میرے ایک ہم سفر کی تھی۔ وہ خوشگوار خدوخال کا مالک ایک ہندو نوجوان تھا، جو رات کو کسی وقت گاڑی میں داخل ہوا تھا، اور سیدھا اوپر کی برتھ پر چلا گیا تھا۔

"جی...... اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو"

وہ اپنی برتھ سے اُتر کر کھڑکی کی طرف بڑھا...... پھر اس کی نگاہ خوراک کے ان ڈبوں پر

پڑی۔۔۔۔۔۔اس نے رُک کر پوچھا:

''کیا آپ یہ چیزیں، ان باہر والے لوگوں کو دینا چاہتے ہیں؟''

''ہاں میرے پاس ان کے سوا کچھ اور نہیں ہے''

''کوئی فائدہ نہیں۔ وہ یہ چیزیں نہیں کھا سکتے''

''میرا تو خیال تھا کہ وہ جو کچھ ملے گا، کھا لیں گے''

اس نے اپنا سر انکار میں ہلایا اور کہا ''نہیں۔۔۔۔۔ وہ لوگ صرف چاول کھاتے ہیں''

میں نے اس چھوٹی سی بچی کی طرف دیکھا۔ وہ اور کچھ نہیں تو یہ پنیر کھا سکتی ہے۔

''تاہم میری خواہش ہے کہ یہ کھڑکی کسی طرح کھل جائے۔ میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔۔۔۔۔''

''لیکن ان کا کچھ فائدہ نہیں۔ وہ پیسوں سے کوئی چیز خرید ہی نہیں سکتے۔ یہاں بازاروں میں خوراک ہے ہی نہیں۔ تب ہی تو یہ لوگ سٹیشن پر جمع ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کلکتہ جانے والے ٹرین پکڑنے کے لیے۔۔۔۔۔۔۔''

ہماری ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ چلنی شروع ہوئی۔ عین اسی وقت کھڑکی خود بخود کھل گئی۔ اب بھی اتنا وقت تھا کہ میں ان لوگوں کو یہ تھوڑی بہت چیزیں دے سکتا تھا، لیکن مجھے احساس ہو گیا کہ ان کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ جوں جوں ہماری ٹرین، خاموش زندہ لاشوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے کی طرف بڑھ رہی تھی، توں توں یہ خیال میرے دل میں تقویت پا رہا تھا کہ دنیا کی کوئی چیز بھی ان لوگوں کے کام نہ آ سکے گی، ماسوا اس کے کہ سنگ دل اور جلتے ہوئے آسمان سے من و سلویٰ کی معجزانہ بارش ہو جائے۔

میں اپنے ہندو دوست کی جانب متوجہ ہو گیا اور پوچھا ''جب آپ نے کہا تھا کہ یہ لوگ صرف چاول کھاتے ہیں، تو آپ کی مراد کیا تھی۔ کیا یہ لوگ واقعی صرف چاول کھاتے ہیں۔''

''میری مراد بالکل یہی تھی۔ ان لوگوں کے لیے خوراک کے معنی ہی چاول ہیں، کچھ اور نہیں نہ گوشت، نہ مچھلی، نہ انڈے، نہ آلو۔ خوراک کا مطلب نہ مکئی ہے، نہ جوار، نہ باجرا، جو چاول سے مشابہ ہوتا ہے۔ چاول کا مطلب چاول ہی ہوتا ہے۔ صبح، دوپہر، رات۔ ہر وقت۔ اگر آپ انھیں چاول کے علاوہ کچھ دیں گے تو زیادہ تر لوگوں کی سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آئے گا کہ اسے کس طرح کھایا جاتا ہے اور اگر وہ کھا بھی لیں تو انھیں موافق نہیں آئے گا۔ ان کے معدے میں گڑبڑ شروع ہو جائے گی اور وہ پیچش اور کئی دوسری بیماریوں کا

شکار ہو جائیں گے۔

یہ ہندو نوجوان میرے لیے نہایت مفید ہم سفر ثابت ہوا۔ وہ خوراک کے محکمے کی کسی شاخ میں ملازم تھا۔ اس نے قحط کے سبب کے بارے میں اتنی عجیب و غریب بات بتائی کہ اس پر جھوٹ کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن بعد میں لوگوں سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ وہ سچ بول رہا تھا۔ اس کی سنائی ہوئی کہانی مختصراً کچھ یوں تھی۔

اس کہانی کا تعلق آبادی کے مسئلے سے ہے۔ ہندوستان کی آبادی میں گزشتہ بارہ برس کے دوران چھ کروڑ نفوس کا اضافہ ہو چکا ہے۔ یہ تعداد ساری برطانوی سلطنت کی سفید فام آبادی کے تقریباً برابر ہے۔ یہ بات اگر کسی اوسط انگریز کو بتائی جائے تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جائیں اور اسے اُفق پر کئی سائے، خطرے سے خبردار کرتے ہوئے نظر آنے لگیں۔ انگریز ہی نہیں ہر امریکی باشندہ بھی اسی طرح حیرت کا شکار ہو جائے گا۔

ہندوستان میں ہر جگہ آبادی بڑھی ہے لیکن بنگال میں اس کی رفتار سب سے تیز ہے۔ کیوں؟ اس وجہ سے جس کو ہم نے ''عجیب و غریب'' قرار دیا تھا۔ اس سادہ سی وجہ کے باعث کہ بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد تقریباً، برابر ہے، وہاں کے تمام پرہیزگار لوگ، ہر قیمت پر بچے پیدا کرنے کی اندھی دوڑ میں مصروف ہیں۔

ان بچوں کو نہ خوراک نصیب ہوگی، نہ کپڑے، نہ ان کے لیے ملازمت ہوگی یا مستقبل کے امکانات۔ لیکن ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اصلی بات تو یہ ہے کہ ایک کے بعد دوسرا بچہ جلد از جلد دنیا میں آ جائے، اللہ کی رضامندی حاصل کرنے اور وشنو کی خوشنودی کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کے اعداد و شمار اتنے سادہ نہیں جتنے دنیا کے دوسرے حصوں کے اعداد و شمار ہیں۔ یہاں کے اعداد و شمار کے پیچھے جادو کام کرتا نظر آتا ہے اور جب آپ ان کا بغور مطالعہ کرنے لگتے ہیں تو یہ ناچتے اور عجیب و غریب شکلیں اختیار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ کلکتہ کا دورہ میرے لیے کئی طرح سے سبق آموز ثابت ہوگا۔

۴

آخر کار ہم کلکتہ پہنچ گئے اور ہر جگہ کارٹونوں کا وہ وحشت ناک خیال ہمارے ساتھ رہنے لگا، جس کا ہم نے اس باب کے شروع میں تذکرہ کیا تھا۔

اور یہ خیال کسی ایک طبقے تک محدود نہیں تھا، ایسا لگتا تھا جیسے سوسائٹی کے ہر طبقے میں یہ خیال رچا بسا ہوا ہے۔ اس شہر میں اپنے اوّلین دنوں میں، میں ایک نوجوان کے گھر گیا جو امدادی باورچی خانوں کا انتظام بڑی اچھی طرح چلا رہا تھا۔ وہ ایک نہایت فیشن ایبل اور جدید طرز کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ وہاں ہم نے کاک ٹیل پیے۔ اس پارٹی میں تمام مہمان نہایت شایستہ اور ممتاز لوگ تھے۔

''ہم کبھی چاول نہیں کھاتے، میرے دوست نے کہا'' جب سے یہ قحط پڑا ہے میں نے اپنے باورچی سے کہہ دیا ہے کہ چاول خریدنے کی کوشش کسی بھی حال میں نہ کرے۔''

عین اسی لمحے میں، اس کا بٹلر ایک ٹرے میں کیویئر آن ٹوسٹ (Caviare on Toast) لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس میں بٹلر کی کوئی خطا نہیں تھی، کیویئر باہر گھومتے ہوئے ڈھانچوں کے کسی کام نہیں آ سکتی تھی، لیکن میرے اندر کارٹون کا احساس شدید تر ہو گیا۔

ہر جگہ یہی صورت حال درپیش تھی۔ میں جس دوست کے ساتھ رہ رہا تھا اس کے پاس گولڈ فش کا ایک بڑا سا پیالہ بھی تھا۔ بالکنی پر بیٹھ کر ان چمک دار مچھلیوں کو دنیا کے ہنگاموں سے بے نیاز، خنک خنک پانی میں تیرتے دیکھنا، نہایت خوشگوار معلوم ہوتا تھا اور پھر ایک دن میں نے، اسی پیالے کے ساتھ، ایک پیکٹ رکھا دیکھا جس پر "Finest Goldfish Food"، (گولڈ فش کے لیے بہترین خوراک) کا لیبل لگا ہوا تھا.......... ایک بہترین خوراک کھانے والی گولڈ فش اور بھوک سے بلکتے ہوئے بچے.......... ان دونوں کا موازنہ کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن انسان کے ذہن میں اس قدر مریضانہ واہمے پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے کہ سامنے کی چیزیں، مثال کے طور پر گولڈ فش کا سڈول جسم بھی، سوجا ہوا اور مسخ نظر آنے لگا تھا۔

تمام اہم شاپنگ سینٹرز میں ریستوران اور خوراک کی دوکانیں تھیں، اور ان کے باہر، دیواروں سے ٹیک لگائے ہوئے، گٹروں میں پڑے ہوئے، سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے، خاموش ڈھانچے تھے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اگر آپ کو انگلینڈ میں اپنے گھر بھیجنے کے لیے چاکلیٹ بھی خریدنے ہوں، تو آپ کو ان کے جسموں کے اوپر سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ میں نے صرف ایک بار ایسا کیا تھا اور وہ واقعہ نہایت تکلیف دہ اور پریشان کن تھا۔ چند دن کے بعد تو مجھے خوراک کی صورت سے بھی نفرت ہونے لگی تھی۔

نجی سخاوت کرنے کی میری پہلی کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ ایک روز ہم اس بالکنی میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں ہمارے دوست نے اپنی گولڈ فش رکھی ہوئی تھی کہ ہمیں نیچے فرش پر پڑی ہوئی ایک عورت دکھائی دی۔

وہ اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی اور اس کے شانے کے ساتھ ایک بچہ چپکا ہوا تھا۔ دونوں تقریباً ننگے اور اس قدر فاقہ زدہ تھے کہ کوئی شخص ان کی کمر سے کھال اُتار کر اسے ایک پھٹے پرانے کپڑے کی طرح مروڑ سکتا تھا۔ ہم چائے پینے بیٹھے ہی تھے چنانچہ میں نے بیرے سے کہا کہ ''جس وقت باہر لوگ بھوک سے مر رہے ہوں، تو ہم یہاں بیٹھ کر کس طرح کھا، پی سکتے ہیں؟ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا'' چنانچہ ہم نے کیک کے دو بڑے ٹکڑے کاٹے، کچھ فروٹ رکھے، چائے کا ایک جگ انڈیلا، اور دو روپے کے ساتھ بیرے کے ہاتھ انھیں بھجوا دیا۔ بیرا ایک پٹھان تھا، جو بنگالیوں کو نہایت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اسے یہ کام پسند نہیں آیا لیکن وہ یہ تمام لے کر اس عورت کے پاس چلا گیا اور ہم اوپر سے دیکھنے لگے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

اس عورت کو اُٹھ کر بیٹھنے میں کئی منٹ لگے۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ، نہایت سستی سے، کیک کا ٹکڑا اُٹھا کر سونگھا، اور ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ کیک کا ٹکڑا ایک گٹر میں گر گیا جہاں سے دو کوے، اسے اپنی چونچ میں دبا کر اُڑ گئے۔ اسی اثنا میں بچے نے بھی ہاتھ پاؤں ہلانے شروع کیے۔ اس نے بھی کیک کو سونگھا، اور ایک منٹ کے لیے ایسا لگا کہ وہ اسے کھا لے گا۔ لیکن نہیں، اس نے اپنی ننھی منی انگلیوں سے صرف اسے مسلنے پر اکتفا کیا۔ چائے کی طرف انھوں نے نظر بھی نہیں ڈالی۔ البتہ کچھ دیر بعد اس نے نہایت بے دلی کے ساتھ، فروٹ اور دو روپے اُٹھائے اور ایک میلے کپڑے میں باندھ لیے۔ یہ سارے کام اس نے نہایت سست رفتاری سے سلوموشن میں.......... انجام دیے۔ ایک گھنٹے بعد بھی وہ اپنے میلے چیتھڑوں کو ادھر اُدھر کر رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے اُٹھنے کی کوشش کی اور کئی بار نہایت تکلیف دہ کوششوں کے بعد، لڑکھڑاتی ہوئی کھڑے ہونے میں کامیاب ہو گئی اور وہاں سے غائب ہو گئی۔

اگلی صبح کو قحط سے ہونے والے جانی نقصان کی روزانہ سرکاری فہرست میں درج تھا:

بے سہارا مریضوں کے ہسپتال میں داخلے	۱۳۷
ہسپتال میں اموات	۸۴
عملہ صفائی کو ملنے والی لاشیں	۷۶

اور میں بیٹھا سوچتا رہا کہ ہم نے جن دو غریب اور لاچار افراد کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی، وہ کس زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔

۵

ان صفحات میں، اس قحط کی صعوبتوں کی تفصیلات کو طول دینے سے کوئی بھی مفید مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ ہم قاری کو امدادی باورچی خانوں کے دورے پر لے جاسکتے ہیں یا پھر ایسے دیہات میں جہاں حالات اور بھی زیادہ خراب تھے۔ یا پھر وزیروں، اور تمام جماعتوں کے کاروباری لوگوں کے دفتر میں لے جاسکتے ہیں، جن کے ساتھ میں نے اس مسئلے پر تفصیل سے بات چیت کی تھی۔ لیکن ہر جگہ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے اور ذہن پہلے سے زیادہ پریشان ہوا۔

لیکن انسانی ہمدردی کے علاوہ، اس المیے سے دو اور سوالات بھی اُبھرتے ہیں، لہٰذا اس کے اسباب پر روشنی ڈالنا بہت ضروری ہے، مختصراً ہی سہی۔

ان میں سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا اس کی ذمہ داری مرکزی حکومت پر عائد ہوتی ہے؟ اس سوال کے جواب پر اس بات کا انحصار ہے کہ یہ قحط کیا قرار واقعی ہمارے شاہی وقار پر ایک دھبا کی حیثیت رکھتا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ صوبائی حکومت کس حد تک اس کی ذمہ دار تھی؟ اس کے جواب پر اس بات کا انحصار ہوگا کہ ہندوستانیوں کو کس حد تک صوبائی خودمختاری کا اہل قرار دیا جاسکتا ہے؟

آیئے اس معاملے کو جتنی جلدی ممکن ہو، اختصار کے ساتھ نمٹادیں۔

اس قحط کے تین اہم اسباب تھے۔ یہاں ہم انھیں ان کی اہمیت کے اعتبار سے بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب میں، میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ہوسکتا ہے کہ آپ ان سے اتفاق نہ کریں، لیکن یہاں میں جو واقعات بیان کررہا ہوں، ان کے بارے میں کسی شک وشبہ یا بحث کی گنجایش نہیں ہے۔

اس قحط کی سب سے پہلی اور اہم وجہ تو خود قدرت تھی۔ اگست ۱۹۴۳ء میں چاول کی فصل اس قدر خراب تھی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اس کے بعد اکتوبر میں گردباد (سائیکلون) آئے اور ہواؤں کے ان طوفانوں نے تباہی پھیلا دی۔ دریں اثنا برما میں تمام کی تمام فصل، جنگ کی نذر ہوگئی اور تمام اسباب پر مستزاد یہ کہ ۱۹۴۳ء کے موسم بہار میں سیلاب آئے اور مواصلات کا نظام جس پر پہلے ہی جنگی نقل وحرکت کی وجہ سے کافی دباؤ تھا، بالکل درہم برہم ہوگیا تھا۔

ان حالات میں قحط ناگزیر تھا۔ ہندوستان میں اگر مرکزی حکومت میں تمام کے تمام افراد ذہانت کے پتلے ہی کیوں نہ ہوتے، اور بنگال میں فرشتہ صفت انسانوں کی حکمرانی ہی کیوں نہ ہوتی، قحط پڑنا ہی پڑنا تھا۔

جو شخص اس سے انکار کرتا ہے، وہ واضح طور پر جھوٹ بولتا ہے۔

قحط کا دوسرا سبب بنگال کی صوبائی حکومت کی کرپشن، نااہلی اور غیر ذمہ داری تھی۔

دارالعوام میں اس موضوع پر ہونے والے مباحثوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حزب اختلاف کے زیادہ تر ارکان کو اس بات کا قطعاً علم ہی نہیں تھا کہ بنگال میں کوئی صوبائی حکومت بھی ہے۔ ایک ایسی حکومت جس میں ہندوستانیوں کی بے پناہ اکثریت ہے۔ جس کے پاس اتنے اختیارات ہیں جو صورت حال پر قابو پانے کے لیے کافی ثابت ہوسکتے تھے اور اگر کافی نہ بھی تھے تو دہلی سے بروقت اپیل کے ذریعے حالات پر قابو پایا جاسکتا تھا (یہ اپیل، جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے، اس وقت کی گئی تھی، جب حالات اتنے بگڑ چکے تھے کہ اب ان پر قابو پانا محال تھا)۔ برطانیہ کی لیبر پارٹی کے ارکان کی تقریریں خاص طور پر جذباتیت کے غیر مربوط اظہار پر مشتمل تھیں اور صورت حال کی حقیقتوں کو بیان کرنے میں مس ایمی وڈ فورڈ فنڈن (Miss Amy Woodford Finden) کے "Indian Love Lyrics" سے بھی زیادہ غلط تھیں۔

بنگال کی صوبائی حکومت کا ریکارڈ کیا ہے۔ اُس ہندوستانی حکومت کا جسے لوگوں نے آزادانہ طور پر کھلے اور شفاف طریقے پر منتخب کیا تھا۔

نازک ترین دور میں، اس حکومت کے سربراہ، مسٹر فضل الحق نامی ایک شخص تھے۔ ہوسکتا ہے کہ مسٹر حق کی سرگرمیوں کے بارے میں میرے خیالات کو متعصبانہ قرار دیا جائے لہٰذا میں ان کے بارے میں کلکتہ کے لارڈ چیف جسٹس کے ریمارکس پر اکتفا کرتا ہوں، جن میں انھوں نے ۲۴-اگست ۱۹۴۳ء کو مسٹر حق کو ''عوامی عہدے کے لیے نااہل'' قرار دیا تھا۔ وہ ایک پریشان کن اور ناگوار کیس میں شہادتوں کا خلاصہ بیان کر رہے تھے، جو ''جیاگنج رائس لوٹنگ کیس (Jiaganj Rice Looting Case)'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کیس کے ساتھ مسٹر حق کا تعلق، چیف جسٹس کے الفاظ میں .... یہ تھا کہ ''انھوں نے چاول کی جس کی صوبے میں سنگین حد تک کمی تھی، قانونی نقل وحمل میں مجرمانہ مداخلت کی تھی۔''

یہاں ہم اس خلاصے کا آخری حصہ درج کرتے ہیں، جو ہم نے کلکتہ سٹیٹسمین (Calcutta Statesman) ؛ مؤرخہ ۲۴-اگست سے نقل کیا ہے:

''یہ بات ظاہر ہے کہ مسٹر فضل حق نے، جبکہ وہ وزیراعلیٰ تھے، اپنی عہدے سے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور سیاسی مقاصد کے لیے انصاف کی راہ میں حائل ہونے کی کوشش کی۔

اگر خوراک کی جائز اور قانونی نقل وحمل میں رخنہ ڈالا جاسکتا ہے، اور مجرموں کو بچانے کے لیے وزیراعلیٰ اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہیں، تو صوبے میں قانون کی بالادستی کس طرح قائم رہ سکتی ہے۔ جس وقت چاول لوٹنے کا یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت وزارت داخلہ بھی مسٹر حق کے پاس تھی۔ لوٹا جانے والا چاول، بہرام پور جیل کے لیے لے جایا جا رہا تھا اور جیلوں کا انتظام محکمہ داخلہ کے سپرد تھا۔ لیکن نہ تو ان کا حلف وفاداری کام آیا اور نہ ہی عوامی ذمہ داری کے احساس نے انھیں اس قابل نفرت کام سے باز رکھا۔

چیف جسٹس کے علم کے مطابق جناب فضل حق نے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالتے وقت جو اقراری حلف اٹھایا تھا، اس کو توڑنے کی قانون میں کوئی سزا نہیں ہے۔ لیکن اس کی واضح خلاف ورزی انسان کو کسی بھی عوامی عہدے کے لیے نااہل قرار دیتی ہے۔

اگر عہدے کے اس اقراری حلف کو صرف ایک رسمی عمل سمجھا جائے تو اچھی حکومت کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ چیف جسٹس نے لکھا ہے کہ وہ یہ کام معاشرے کے افراد پر چھوڑتے ہیں، کہ وہ مسٹر حق کے بارے میں سوچیں اور کوئی فیصلہ دیں۔"

ہر شخص سوچے گا کہ اتنی تلخ تنقید کے بعد مسٹر حق سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے کسی دیہات میں چلے گئے ہوں گے اور وہاں اپنی باقی زندگی باغبانی میں گزار دی ہوگی۔ لیکن نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کے سیاسی کیریئر پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑا۔ بنگال کی سیاست اسی طرح کی ہے۔[1]

(۱) مسٹر حق، ایک انتہائی نمایاں اور کامیاب سیاست دان ہیں جو ہندوستانی قوم پرستی نے تخلیق کیے ہیں لیکن ان کی ذہنیت کا اندازہ بمبئی کرونیکل ویکلی (Bombay Chronicle Weekly) کے ۷-نومبر ۱۹۴۳ء کے شمارے کے اشتہاری کالموں میں شائع ہونے والے ایک اشتہار سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں مسٹر حق نے مشہور ماہر فلکیات اور عظیم شعبدہ باز راج جیوتشی (Raj Jyotishi) کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا تھا۔ جیوتشی کے دوسرے کارناموں میں ایسے طاقتور ہیروں اور تعویذوں کی فروخت بھی شامل ہے جن کو پہننے سے انسان کو ملازمت میں ترقی، کاروبار میں خوشحالی، ذہنی آسودگی، خاندانی خوشی اور بے شمار لاعلاج امراض سے حفاظت کی ضمانت مل جاتی ہے۔ ان ہیروں کو "تمام منحوس ستاروں کے اثرات سے انسان کو محفوظ رکھنے والی چیز" قرار دیا گیا ہے۔ تاہم مسٹر حق کے دفاع میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ تنہا ہندوستانی سیاست دان نہیں ہیں جو ان ماہرین فلکیات اور جادوگروں پر یقین رکھتے ہیں۔ جیوتشی کے پاس ہندوستانی گاہکوں (Clients) کی بہت لمبی فہرست ہے۔ جس میں ہندوستانی قوم پرستی کے نہایت نمایاں اور مشہور چیمپئن بھی شامل ہیں۔

چلیے اب ذرا سرکاری دستاویزات کا مطالعہ کر لیتے ہیں۔ میں نے جو دستاویزات پڑھی ہیں، ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر دستاویز "Official Report of the Assembly Proceedings in the Bengal Legislative Assembly" ہے۔ اس کتاب کو برطانوی پارلیمنٹ میں مباحثوں کے ریکارڈ کا بنگالی ایڈیشن قرار دیا جاسکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بنگالی ایڈیشن میں شور شرابا، ہنگامہ آرائی اور اسپیکر کی جانب سے ارکان کو خاموش رہنے کی تلقین کے باعث بے شمار مقامات پر مداخلت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اس کے صفحات، سنجیدہ بحث کی بجائے لغو مکالموں کا ریکارڈ معلوم ہوتے ہیں۔

لیکن کبھی کبھی کوئی رکن، لگا تار پانچ چھ فقرے کہنے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۵-جولائی ۱۹۴۳ء کو پیش آیا تھا جب سول سپلائیز کے وزیر عزت مآب خواجہ سر ناظم الدین نے خوراک کی صورت حال کے بارے میں ایک بیان دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو "Assembly Proceedings" کی جلد نمبر ۶۵)

اگر برطانوی حکومت پر بلند آواز میں تنقید کرنے والوں نے یہ بیان پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہوتی، تو وہ اعتراض کرنے کی اتنی جلد بازی نہ کرتے۔ اس بیان میں وزیر نے صاف لفظوں میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے حالات کے ٹھیک ہونے کے بارے میں دیدہ دانستہ غلط بیان دیا تھا، جبکہ اس وقت قحط بنگال کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ذرا ان کا بیان سنیے:

> "مجھ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ میں نے یہ بیان دیا تھا کہ بنگال میں چاول کی قلت نہیں ہے، حالانکہ اس وقت صوبے میں سنگین قلت تھی .... اس لیے کہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے قلت پر اصرار کیا تو اس سے لوگوں میں خوف وہراس پیدا ہوگا، ذخیرہ اندوزی کے رجحان میں، اضافہ ہوگا اور چاول کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ لہٰذا میں نے اس سوال پر بحث ہی نہیں کی .... میں نے یہ بات نہایت صاف ضمیر کے ساتھ کہی تھی کہ چاول کی مقدار کافی ہے اور آئندہ بھی کافی رہے گی، اور ہمیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔
>
> اس قسم کے بیانوں کی روشنی میں، یہ بات ہماری فہم سے بالاتر ہے، کہ برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان نے ایمری (ہندوستان کے لیے برطانوی وزیر مملکت) پر پیش بینی کے فقدان کا الزام، اس قدر شدومد کے ساتھ کس طرح عائد کر دیا تھا۔

مسٹر ایمری (Amery) کے خلاف اس وقت بھی غم و غصہ کا اظہار کیا گیا تھا جب
انھوں نے ذخیرہ اندوزی اور بلیک مارکیٹ کو قحط کی ایک وجہ قرار دیا تھا۔ اس وقت بھی
یہ تاثر دیا گیا تھا کہ یہ ہندوستانیوں کے کردار پر ایک حملہ...... اور اپنے کندھوں سے
الزام کو اُتار پھینکنے کی بزدلانہ کوشش ہے۔''

کیا قرار واقعی ایسا ہی تھا؟ آیئے دیکھیے کہ سر ناظم الدین نے اپنے بیان میں خود اعتراف کیا ہے کہ ''ذخیرہ اندوزی'' چور بازاری اور دوسری سماج دشمن سرگرمیاں عام تھیں۔ اس وقت ہمیں جن اہم مسائل سے نمٹنا پڑا، ان میں سٹہ بازی کے ذریعے قیمتوں میں اضافہ، اور اس سے پیدا ہونے والے لالچ سے نمٹنے کا مسئلہ بھی شامل تھا۔'' آگے چل کر انھوں نے بتایا کہ ۱۰ جون سے ۱۲ جون تک ذخیرہ اندوزوں کے خلاف ایک خصوصی مہم چلائی گئی تھی جس کے نتائج نہایت حیرت انگیز ثابت ہوئے۔'' اس کی صحیح مقدار کا اندازہ لگانا تو مشکل ہے لیکن اندازاً استر سے اسی لاکھ من، چاول برآمد کیا گیا۔ اگر ہم اس بات کو سوچیں کہ چاول کی اتنی بڑی مقدار صرف ۴۸ گھنٹے میں برآمد کی گئی تھی، تو یہ سمجھ لینے میں زیادہ دشواری نہیں ہوگی کہ ذخیرہ اندوزی ہندوستانی ذہنیت کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔

جب ایک دو برطانوی ترجمانوں نے اشارتاً کہا کہ اگر ہندوستان کے صوبے آپس میں اچھے ہمسایوں کے سے تعلقات کی پالیسی پر عمل کرتے...... اگر ان کے درمیان برادرانہ اتفاق ہوتا تو شاید حالات اتنے خراب نہ ہوتے تو اس پر بھی احتجاج کا ایک سیلاب آ گیا۔ کسی نے اس کو ہندوستان کے خلاف ایک اور جھوٹے الزام کا نام دیا اور کسی نے اس کو ''ہندوستان کے کردار پر کیچڑ اُچھالنے کی بلا جواز کوشش'' قرار دیا۔

آیئے اس ''بلا جواز کوشش'' کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر ہندوستانیوں کو ہی اپنے متعلق بیان دینے کی اجازت دیتے ہیں۔ ناظم الدین خود کہتے ہیں کہ صورت حال کو بہتر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بنگال اور اس کے دوسرے خوش نصیب ہمسایوں کے درمیان آزادانہ تجارت کو بحال کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں:

''اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ بات سب کو معلوم ہے۔ صوبائی حکومتوں نے آزادانہ تجارت
کو شکست دینے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ انھیں جہاں کہیں بھی چاول کے ذخائر
نظر آئے۔ انھوں نے اپنی سلامتی کی خاطر ضبط کر لیے۔''

انھوں نے مزید کہا کہ ''مجھے اُمید ہے، بلکہ یقین ہے کہ حکومتیں اب بھی اپنی تنگ نظری ترک کرکے
ہماری امداد کریں گی۔''

لیکن ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ یہ تھی ان کی برادرانہ محبت۔

اس برادرانہ محبت کی ایک بھی مثال ہمیں "Assembly Proceedings" کی ان شوریدہ سر جلدوں میں نظر نہیں آئے گی یا اس کی مثال ہمیں کہیں نہیں ملتی۔ کسی ایک پیراگراف میں، کسی ایک لمحے کے لیے بھی ہمیں اس بات کی شہادت نظر نہیں آئے گی کہ ارکان، انسانیت کے وسیع تر مفاد کی خاطر، اپنے فضول لڑائی جھگڑوں کو فراموش کر دیں گے۔ ہم میں سے جو لوگ جنگ سے پہلے فرنچ سینٹ کے مباحثے پڑھا کرتے تھے، اکثر اوقات ان ارکان کی غیر ذمہ داری، انا پرستی اور کرپشن سے تنگ آ جایا کرتے تھے، جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر فرانس کی عظمت کو فراموش کر رہے ہوتے تھے۔ لیکن بنگال کے سیاست دانوں کے مقابلے میں وہ لوگ ایثار و قربانی کے پیکر نظر آتے ہیں۔ بنگال اسمبلی کی کارروائی پڑھ کر گمان گزرتا ہے کہ ایوان کی تمام فضا، کسی نامعلوم زہر سے اس طرح مسموم کر دی گئی تھی کہ وہاں تہذیب و اخلاق، چکرا کر گر جاتے، اور پاؤں آخر دم توڑ دیتے تھے۔

اور خواہ سارا بنگال اُٹھ کر میری تردید کرے، میں پھر بھی یہی کہوں گا کہ اس زہر کی اصلیت، ہندوستان کی وہی پُرانی لعنت، یعنی مذہبی منافرت ہے۔ کوئی رکن بھی باہر بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کو صرف انسان کہنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ فاقہ زدہ ہندو یا قحط کے مارے ہوئے مسلمان کے نام سے جانے جاتے تھے۔ یہ الزام اس قدر سخت ہے کہ میں اسے تنہا عائد کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میں ایک بار پھر ہندوستانیوں کو یہ ناگوار شرف بخشتا ہوں کہ اس الزام کے بارے میں اپنے ہم وطنوں کے بیان ملاحظہ کریں۔

یہاں میں ایک مشہور آزاد خیال لیڈر پنڈت کنزرو کی تقریر کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں، جو انھوں نے ۱۵-اکتوبر ۱۹۴۳ء کو کلکتہ یونیورسٹی میں ایک بہت بڑے جلسے میں کی تھی (یہ اقتباس ہندوستان سٹینڈرڈ مؤرخہ ۱۷-اکتوبر ۱۹۴۳ء سے لیا گیا ہے)۔

''عزت مآب، وزیر خوراک نے، موجودہ وقت میں بھی جبکہ وہ تمام لوگوں کے تعاون
کے خواہاں ہیں، کسانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ مسلم لیگ کے نام پر تمام اجناس

خوردنی کو مارکیٹ میں لے آئیں اور ذخیرہ اندوزی سے اجتناب کریں۔ کیا بنگال
کے لیے اس صورت حال میں ایسا رویہ اختیار کرنے سے بڑا کوئی المیہ ہوسکتا ہے؟ کیا
ان حالات میں کسانوں کے صرف ایک طبقے سے اپیل کرنا، اور ایسے جذبات کو ہوا
دینا جائز ہے، جو بنگال کی آبادی کے بہترین مفاد میں نہیں ہیں؟''

یہاں یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ مسلم لیگ پر اس حملے نے اس ہندو پنڈت کی تقریر کے دوسرے حصوں کی نسبت زیادہ داد پائی۔

اور اب اس کہانی کے دوسرے پہلو کا بھی جائزہ لیتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا ردعمل کیا تھا۔ "Calcutta Statesman" مؤرخہ ١٢-اکتوبر ١٩٤٣ء میں اخبار کے مسلمان نمائندے شاہد نے لکھا ہے:

''مسلمان رہنماؤں نے ہندو حزب اختلاف سے کئی بار درخواست کی ہے کہ وہ بنگال
کی تاریخ کے اس المناک اور شرمناک باب کے خاتمے میں ان کی مدد کریں۔ اگر چہ
خوراک کے مسئلے پر اسمبلی میں حالیہ بحث کے دوران، ان کی وزارت پر نہایت
شرمناک الزامات عائد کیے گئے لیکن اس کے باوجود جناب سہروردی نے الزام
تراشوں سے تعاون کی درخواست کی۔ جواب ملا کر ''ہم قاتلوں کی بات سننے کے لیے
تیار نہیں۔''

قصہ مختصر یہ کہ بحران کے اس طویل عرصے میں بنگال اسمبلی میں اس معاملے پر بحث، جذباتیت، تعصب اور غیر ذمہ دارانہ بیانات کی بدترین مثال ہے۔[1]

ان بیانات کو پڑھنے کے بعد اس بات کا یقین ہی نہیں آتا کہ یہ بالغ افراد ایک اہم مسئلے پر بحث

---

(١) ہم دیکھتے ہیں کہ بار بار اس اہم صورت حال پر بحث روک کر، کسی فضول مذہبی جھگڑے کو ختم کرانے کی کوشش شروع کردی جاتی ہے۔ قاری اگر اسمبلی کی کارروائی کی جلد LXIV (نمبر ٣) پر صفحہ ٢٥٤ سے آگے پڑھنے کی زحمت گوارا کرے تو اس کو ہندوستان کے مثالی سیاسی ڈرامے کے ابتدائی ایکٹ نظر آئیں گے۔ اس ڈرامے کا آغاز پونا کالج (Pabna College) کے بعض مسلمان طلبہ کی جانب سے نماز کے لیے ایک کمرہ مخصوص کرنے کے مطالبے سے ہوا۔ جونہی ان کا یہ مطالبہ منظور ہوا ہندو طلبہ اس کے گرد جمع ہو کر مختلف ساز بجانے لگے اور ہنگامہ آرائی میں مصروف ہوگئے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ تمام کالج میں شور مچ گیا۔ یہ تنازعہ پھیلتے پھیلتے اسمبلی تک بھی پہنچ گیا اور اسمبلی کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاملہ ارکان کے لیے، اپنے بھوکے ہم وطنوں کی تقدیر سے زیادہ اہم تھا۔

میں حصہ لے رہے ہیں۔ وہ شیطان بچے معلوم ہوتے ہیں۔ اس الزام سے دونوں میں سے کسی کو بری کرنا، دشوار کام ہے لیکن انصاف کا تقاضا ہمیں اس اعتراف پر ضرور مجبور کرتا ہے کہ مسلمانوں نے کم سے کم اتحاد کا دکھاوا قائم کرنے کی کوشش ضرور کی تھی۔ انھوں نے صلح کی پیش کش مناسب انداز میں نہ سہی، لیکن کی تو تھی۔ یہاں ہم شاہد کے مضمون کا ایک اور اقتباس پیش کرتے ہیں:

''مسلمان ماضی کو فراموش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اب بھی ان ہندوؤں کے شانہ
بشانہ کام کرنے کو تیار ہیں، جو مسلمانوں پر الزام تراشیاں کرتے رہے ہیں۔ لیکن شرط
یہ ہے کہ ہندو بھی ماضی کو بھول جائیں اور اپنے مذہبی اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی
کوشش ترک کردیں اور بنگال کے بھوکے عوام کے مسئلے پر اپنی توجہ مرکوز کردیں۔''

ہمارا خلاصہ ضرورت سے زیادہ طویل ہوتا جارہا ہے لیکن یہ معاملہ اتنا اہم ہے کہ اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ہم نے دیکھ لیا کہ قحط کی دو اہم وجوہ تھیں۔ پہلی وجہ قدرت کی مہلک طاقت اور دوسری وجہ اس کے نتیجے میں رونما ہونے والی صورت حال سے نمٹنے میں صوبائی حکومت کی نااہلی۔

اب تیسری وجہ یعنی ہماری اپنی کوتاہیاں، دہلی کی حکومت کی ناکامی۔

اس بات سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا کہ مستقبل کے تاریخ نویس اس تیسری وجہ کو دوسری دو وجوہ کے مقابلے میں بہت کم اہم شمار کریں گے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ صوبائی حکومت نے اس وقت تک نئی دہلی سے امداد طلب نہیں کی جب تک معاملہ اس قدر خراب نہیں ہوگیا کہ اس سے عہدہ برا ہونے کی کوئی راہ ہی باقی نہ رہی۔ اور ہم ہندوستانی قوم پرستی کے بارے میں بھی یہ جان چکے ہیں کہ دہلی کی جانب سے اگر اپنے طور پر کوئی ایسا قدم اُٹھایا جاتا، جسے قبل از وقت شمار کیا جاسکتا، تو اس کے خلاف کس قدر شدید احتجاج کیا جاتا۔

اگر چہ اس بات سے ہم بالکل بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔ لیکن اپنی ذمہ داری قبول کرنے کے ساتھ ساتھ، ہمیں اپنے جائز دفاع کا حق تو ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر ہم پر ایک الزام تواتر کے ساتھ لگایا جاتا ہے کہ ہمارے پاس اعداد و شمار کافی نہیں ہیں، جو تمام صوبے میں خوراک تقسیم کرنے میں حکام کی رہنمائی کرسکیں۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ ہمارے پاس اس وقت جو اعداد و شمار تھے وہ گنجلک اور پُرانے تھے۔ یہ اعداد و شمار حاصل کرنے کا طریق کار، نہایت فرسودہ اور پُرانا تھا۔ اکثر اوقات یوں ہوتا تھا کہ ضلعی افسر اپنے چوکیدار کو

بلا کر پوچھتا ہے کہ "دریا کے ساتھ اس لکیر سے لے کر گاؤں کی سرحد تک کتنی پیداوار کی توقع ہے، اور چوکیدار اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سوچتا اور چند منٹ بعد یہ رپورٹ دیتا تھا کہ ۲۰۰ بیگھہ زمین پر پیداوار روپے میں بارہ آنے ہوگی اور ۱۰۰ بیگھہ زمین پر روپے میں چودہ آنے۔ اعداد و شمار جمع کرنے کے کام میں بس اتنا ہی ہوتا تھا، اور اگر اس کے اندازے میں ۲۵ فی صد سے کم فرق ہو تو وہ خوش قسمت شمار کیا جاتا تھا۔ ظاہری بات ہے کہ جن علاقوں میں، اس وقت بھی جب فصل بہترین ہوتی تھی، اناج کی پیداوار ساری آبادی کی ضروریات سے پانچ فی صد کم ہوتی تھی، وہاں ایسے طریقوں سے اعداد و شمار جمع کرنا، جلد یا بدیر کسی بڑے حادثے کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

لیکن ہم اگر اس قسم کے واقعات کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں تو کم از کم انھیں اپنے مناسب پس منظر میں رکھ کر دکھانے کی اجازت تو ہونی چاہیے۔ اس پس منظر میں ہمیں کیا نظر آتا ہے۔ ہمیں صرف بنگال کے صوبے میں چھ کروڑ کی آبادی نظر آتی ہے جو زیادہ تر ان پڑھ ہے اور اتنی تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے کہ بنگال کے وسائل اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اتنی بڑی آبادی تو کسی ایسی سرزمین کے وسائل پر بھی بار ہوتی جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ یہ آبادی مذہبی تنازعات کا اس بُری طرح شکار ہے کہ یہاں خانہ جنگی کا نہ ہونا، برطانوی انتظامیہ کے لیے ایک خراج تحسین کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سرکش قوم کے افراد یگانگت اور اتحاد کے ابتدائی اُصولوں سے بھی ناآشنا ہیں اور ان کا انتظام مٹھی بھر یورپی لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کو اپنے ہندوستانی ساتھیوں کی جانب سے جن کو انھوں نے اپنے زیادہ تر اختیارات منتقل کر دیے ہیں، تعاون نہیں ملتا۔

آپ ہم پر الزام لگانا چاہتے ہیں تو شوق سے لگائیے لیکن صرف اس بات کا کہ ہم کوئی معجزہ نہیں کر سکتے۔ ہم صرف اس الزام کا دیانت داری کے ساتھ اعتراف کر سکتے ہیں۔

ہندوستان میں برطانیہ کو زیادہ تر ناکامیاں .... جن کے وجود سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا .... طاقت کے بے جا استعمال سے نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ نرمی کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ ہمیں صحیح کام کا علم تھا لیکن ہم ہندوستانیوں کے جذبات کو مجروح کرنے کے خوف سے ایسا نہیں کر سکے۔ [1] بنگال میں قحط کبھی

(۱) اس کی کلاسیکی مثال ستی پر پابندی میں تاخیر ہے۔ ستی ہندوؤں کی ایک رسم تھی جس میں اعلیٰ جات کی عورتیں، اپنے شوہر کی چتا میں جل کر جان دے دیا کرتی تھیں۔ ہم اس رسم پر پابندی عائد کرنا چاہتے تھے، لیکن ۵۰ برس تک اس کام میں تاخیر کرتے رہے۔ کیونکہ ہم ہندوستان کے قومی اداروں میں مداخلت نہ کرنے کی پالیسی پر گامزن تھے۔
جاری ہے اگلے صفحہ پر

نہ پڑتا اگر ان برطانوی افسروں کو، جو قلیل تعداد میں اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے، انھیں ہندوستان کے تعلیم یافتہ، اور مقامی زراعت کاری اور دیہاتی زندگی کی پیچیدگیوں سے آگاہ لوگوں کا تعاون حاصل ہوتا۔ لیکن ایسا کوئی شخص تھا ہی نہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں ہزاروں گریجویٹ شخص بیکار پھر رہے تھے جو اس کام کے لیے انتہائی مناسب ثابت ہو سکتے تھے لیکن وہ اس کام پر غور کرنے کو بھی تیار نہ تھے۔ ان کے لیے یہ کام نہایت پست، ناگوار اور ان کی طبیعت کے ناموافق تھا۔ ایسا کام انگریزوں پر ہی چھوڑنا بہتر تھا۔ چنانچہ وہ عدالتوں میں لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کرتے، اخباروں میں کام کرتے، سٹینو گرافر حتی کہ چپڑاسی بن کر تھوڑا بہت کما لیتے تھے۔ ایک اوسط ہندوستانی جو ایک بار اپنے گاؤں سے باہر آ جائے، پھر کسی صورت میں بھی وہاں واپس جانا پسند نہیں کرتا۔

خیر کسی نہ کسی شخص کو تو ان لوگوں کو گھسیٹ کر واپس لے جانا ہی پڑے گا ورنہ دیہی علاقے تعلیم، صحت، زراعت، صفائی اور شایستہ زندگی کے ابتدائی اُصولوں سے ناآشنا رہیں گے۔ ہم خود بھی انھیں گھسیٹ کر واپس لے جا سکتے تھے۔ اس کے لیے صرف یہ قانون منظور کرنے کی دیر تھی کہ ہندوستانی گریجویٹوں کو ڈگری حاصل کرنے کے بعد سال دو سال تک دیہی انتظامیہ کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ لیکن ہماری ہمت نہ پڑی اور اب جبکہ ہم ہندوستانیوں کو صوبائی خود مختاری دے چکے ہیں۔ ہمیں ایسا قانون منظور کرنے کا اختیار بھی نہیں رہا۔ اب خود ہندوستانیوں کو یہ اہم اور لازمی قانون منظور کرنا پڑے گا۔

اور اس کے بعد چنگاریاں اُڑنے لگیں گی، احتجاج شروع ہو جائیں گے۔

میں پھر یہی بات دہراؤں گا کہ ہم جس غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہم کوئی معجزہ دکھانے میں ناکام رہے ہیں۔ جب لارڈ ویول (ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے) دہلی آئے تو ہم نے یہ معجزہ بھی تقریباً کر دکھایا تھا۔ کیسے؟ اس لیے کہ ہم میں ایک بار پھر یہ جرأت پیدا ہو گئی تھی کہ ہم اپنے انداز سے حکومت کر سکیں، قوم پرستوں کے اعتراضات سے مرعوب ہوئے بغیر بلاخوف حکمرانی کر سکیں۔ ویول (Wavell) شروع ہی سے ہر مسئلے کو فوجی زاویے سے دیکھنے کے عادی تھے۔ ان کے احکام مختصر اور فیصلہ

بقیہ: یہ بات آپ کے لیے شاید ناقابل یقین ہو، لیکن اونچی جات کے بعض ہندو اب تک ستی پر پابندی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے خود انھیں نہایت رنجیدہ آواز میں ماضی کے ان عظیم دنوں کو یاد کرتے ہوئے سنا ہے، جب عورتوں میں سچی محبت کرنے کی جرأت ہوتی تھی۔ اگر انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر چلے گئے تو اس بات پر یقین سے یہ شرط لگائی جا سکتی ہے، کہ ستی کی رسم واپس آ جائے گی۔

کن ہوتے تھے اور انھوں نے شروع ہی سے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ کسی قسم کی لغویات کو برداشت نہیں کر یں گے اور ہندوستانیوں کی بہت بڑی اکثریت نے ان کے رویے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ انھیں احساس ہوگیا تھا کہ اب کچھ نہ کچھ کام ضرور ہوگا۔ اب اسمبلی میں کبھی ختم نہ ہونے والی جھک جھک بک بک ختم ہو جائے گی۔ برطانوی افسروں کے واضح احکام، انھیں خاموش کرادیں گے۔ اگر چہ یہ بات درست ہے کہ پریس کے رویے میں کوئی واضح تبدیلی نہیں آئی تھی اور وہ بدستور ہماری مخالفت کرتا رہا۔ ویول کی عینک پر طرح طرح کے فقرے چست کیے جاتے، اسے وائسرائے کی شان وشکوہ کا حصہ قرار دیا جاتا (وائسرائے عینک کا استعمال اس لیے کرتے تھے کہ جنگ میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی تھی)۔ اخباروں کی جانب سے یہ تاثر دیا جارہا تھا کہ برطانیہ یہ سب کچھ اس لیے کر رہا ہے کہ قحط سے اس کی فوجی پوزیشن پر کوئی غلط اثر نہ پڑے۔

لیکن بین السطور پڑھنے پر اس میں ہمیں احسان مندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسی احسان مندی کی جھلک جو فرقہ وارانہ فسادات کے دوران برطانوی فوج کی آمد پر، ہجوم کے دلوں میں پیدا ہوتی ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "خدا کا شکر ہے، انگریز آگئے"۔ لیکن احسان مندی کے یہ الفاظ کبھی شائع نہیں کیے جاتے کیونکہ خون خرابے سے بچ جانے والے عوام، اس طبقے سے تعلق نہیں رکھتے جو اخبارات کے نام خط لکھتا ہے۔ باہر کی دنیا کو تو صرف یہ خبر پہنچائی جاتی ہے کہ انگریزوں نے ہجوم پر لاٹھی چارج کیا اور فلاں کانگریسی رہنما کی ناک توڑ دی۔ اس طرح "شاہی استبداد" کے نام پر ایک اور سیاہ دھبا لگا دیا جاتا ہے۔

لیکن ہندوستانی عوام کو حقیقی صورت حال کا علم ہے، ان کسانوں کو جو اپنے دھان کے کھیتوں میں امن کے ساتھ رہنے کے خواہش مند ہیں، حقیقت کا علم ہے۔........... اور وہ اسے یاد بھی رکھیں گے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ آنے والے طوفانی دنوں میں، ان دنوں کی یاد اُن کے لیے پچھتاوے کا باعث ثابت نہ ہو۔

☆☆☆

پانچواں باب

وائٹ اینڈ آف وائٹ

اگر آپ گریٹ بریٹن (Great Britain) کی تمام آبادی، مرد، عورتیں اور بچے لے کر انھیں ہندوستان میں چھوڑ دیں، تو بھی ان کی آبادی کا تناسب ایک اور نو ہوگا۔

برطانوی حکومت کے اس انوکھے پہلو کی اتنی واضح مثال شاید کوئی اور نہیں۔ دراصل یہ محض چند انسانوں کی حکومت ہے۔ زمانہ امن میں اس چھوٹی سی مستقل فوج کے علاوہ (جو لازمی پولیس سروس کے لیے ضروری ہے) ان کا تناسب چار کروڑ ہندوستانیوں اور دس ہزار برطانوی افراد کا تھا۔

"ہندوستان سے چھوڑ دو" (Quit India) کا فقرہ سُن کر، انسان کے ذہن میں بڑے پیانے پر انسانوں کے انخلا، ایک طرح کی آبادی کی منتقلی اور نقل وحمل کی بے انتہا مشکلات کا تصور آتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ سارا کام ایک روز میں مکمل کیا جاسکتا ہے اور تمام انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں کو ایک معمولی سے قافلے میں ملک سے نکالا جاسکتا ہے۔

لوگوں کی اتنی مختصر سی تعداد نے اتنے بہت سے انسانوں کے لیے اس قدر کام کبھی نہیں کیا ہوگا۔ اس کہاوت میں، میں نے "مقروض" کی جگہ "کام" کا لفظ اس لیے لکھا ہے کہ اس باب میں ہم برطانوی لوگوں کا اسی طرح راست بازی سے جائزہ لیں گے جیسا ہم نے ہندوستانیوں کا لیا ہے۔ ہم یہ دیکھیں گے کہ حقیقت میں وہ لوگ کس طرح کے ہیں اور اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کے کتنے اہل ہیں؟

کیا کامیڈی کے یہ قدیم کردار۔ پکا صاحب اور ان کی میم صاحب کا حقیقت میں کوئی وجود ہے؟ کیا وہ شام ہوتے ہی چھوٹے پیگ کے لیے چلانا شروع کر دیتے ہیں، جس طرح ای۔ ایم۔ فارسٹر نے بیان کیا ہے؟ کیا وہ دوپہر کو دھوپ میں سیر کرتے ہیں، جیسا کہ نوئل کاورڈ (Noel Coward) نے تحریر کیا ہے؟ کیا وہ صندل اور املی کے درختوں کے پس منظر میں اپنے ناجائز جذبات کی تسکین کرتے ہیں، جیسا کہ سمرسٹ ماہم (Somerset Maugham) نے بیان کیا ہے؟

ان سوالوں کا جواب، زندگی کے بیشتر سوالوں کے جواب کی طرح "ہاں اور نہیں" دیا جاسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض لوگ بہت خوفناک ہوتے ہیں، خاص طور پر خواتین میں...... جنس کی

ماری ہوئی گنوار عورتیں، جو اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ ہوٹلوں کی بار میں گزار دیتی ہیں۔ خود کو بیک وقت ایک لیڈی، اور ایک طوائف ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اور کسی میں بھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ وہ بدمزاج اور دوسروں پر حکم چلانے کی عادی ہیں، اور اگر آپ ان کو جنگ کا کوئی کام کرنے کے لیے کہیں تو چیخ چیخ کر شکایتیں کرتی ہیں۔ اگر انھیں کنٹین پر صرف آدھ گھنٹے کام کرنا پڑ جائے تو وہ خود کو سولی پر چڑھا ہوا محسوس کرنے لگتی ہیں۔ تمام بڑے شہروں میں فوجی اس بات پر بہت ناراض ہیں کہ ان کے آرام کے لیے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا۔ کلکتہ اور بمبئی میں خواتین کی بھاری اکثریت نے جنگی کوششوں میں جو ہاتھ بٹایا تھا، وہ صرف اتنا تھا کہ کبھی کبھی ایک معاشرتی ڈراما پیش کر دیا جاتا تھا۔ (اس میں بھی معاشرے کی کوالٹی اور ڈرامے میں پیش کردہ مواد دونوں کا معیار نہایت پست تھا)۔

"ریس پر جاؤ اور جنگی کوششوں میں مدد دو۔"

آپ یقین مانیں یا نہ مانیں، یہ سرخی بمبئی کے اخبارات میں ہر ہفتے نمایاں طور پر چھاپی جاتی ہے جو لوگ جنگ کے دوران برطانیہ سے ہندوستان آئے ہوئے ہیں، وہ اس اشتہار کو دیکھ کر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں کر سکتے۔ یہ بات ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ کوئی بھی ذمہ دار ایڈیٹر بدذوقی کے اس حیثیانہ اظہار کو اپنے اخبار میں شائع کرنے کی اجازت دے دے۔ بمبئی کا ریس کورس، شہر کے وسط سے سات میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ سیزن کے دوران ہر ہفتے کے روز، یہاں تیس ہارس پاور کی گاڑیوں کا ایک سمندر نظر آتا ہے، جو پٹرول پھونکتی ہیں، وہ پٹرول جو خطرناک سمندروں میں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے یہاں پہنچتا ہے اور ان کاروں میں سے بمبئی کی انگریز خواتین برآمد ہوتی ہیں۔ ہنستی مسکراتی ہوئی، کیونکہ ان کے ہیٹ نئے اور ضمیر صاف ہوتے ہیں۔ کیا ہم جنگی کوششوں میں مدد نہیں کر رہے؟ کیا کل رقم کا دو فی صد.......... ہاں پورا دو فی صد جنگ کے لیے فلاحی کاموں میں نہیں جا رہا؟ آخر کار ایک لڑکی سے، جس نے پورا ہفتہ ڈرائی مارٹنی پی کر گزارا ہو، ہفتے کی گرم دوپہر میں آپ اس سے کس بات کی توقع کر سکتے ہیں؟

میں نے یورپی ایسوسی ایشن کے کئی ارکان سے اس کے بارے میں گفتگو کی اور انھیں سمجھایا کہ یہ اشتہار بدذوقی کی ایک ناقابل بیان مثال ہے۔ میں نے کہا کہ برطانیہ میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا بلکہ برطانیہ کیا دنیا کے کسی بھی ملک میں، جس کا جنگ کے ساتھ ذرا سا بھی تعلق ہے، اس کا تصور محال ہے۔ یہ ہمارے روسی حلیفوں ہی کی نہیں بلکہ ہمارے تجارتی جہاز رانوں کی کھلی توہین ہے۔ انھوں نے جواب دیا:

"آخر ہندوستانی لوگ بھی تو ریس پر جاتے ہیں۔ پھر ہم کیوں نہیں۔"

"ہم کم سے کم دوسروں کے لیے مثال تو قائم کر سکتے ہیں۔"

"لیکن ہم تو اس طرح جنگی کوششوں میں مدد کر رہے ہیں، میں ان کا یہ جواب سن کر خاموش ہو رہا اور بات آگے نہیں بڑھائی۔ تلخ تجربے نے مجھے بتا دیا تھا کہ بمبئی یورپین ایسوسی ایشن کے ارکان مریضانہ ذہنیت رکھنے والے اور غیر اہم لوگ ہیں؛ دنیا سے بے خبر، جاہل، اور بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے والے چھوٹے لوگ۔

یہ بات برطانوی سلطنت کے لیے خوش قسمتی کا باعث ہے کہ یہ لوگ، ہندوستان میں مقیم انگریزوں کے نمائندہ نہیں ہیں۔ انگریز مرد اور عورتیں ان لوگوں کے مقابلے میں خاصے مہذب ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جو دور دراز کے اضلاع میں رہتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود بھی اس امر کا اعتراف کریں گے کہ وہ، بڑے شہروں میں رہنے والوں کی طرح تیز طبع نہیں ہیں۔ اگر آپ اس قدر گرم موسم میں جہاں سائے میں بھی درجۂ حرارت ۱۰۰ ڈگری ہو اور ایک معمولی سی تنخواہ پر گزر کرتے ہوں، اگر آپ کے پاس، اپنے ذاتی ملازم کے علاوہ، اور کوئی بات کرنے والا نہ ہو، اگر آپ کو "لائف" (Life) کے چار مہینے پرانے اور کرم خوردہ چند رسالوں کے سوا، بیرونی دنیا کی کچھ خبر نہ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کوئی شخص ہندوستانی یا آپ کا اپنا ہم وطن، آپ کا شکر گزار بھی نہ ہو، تو ان حالات میں ذہانت کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔

لیکن ان تمام افراد میں ایک چیز قدر مشترک ہے، ہمت اور جرأت۔ آپ ان چند لوگوں کو جو اتنی بڑی سرزمین پر بکھرے ہوئے ہیں، جن کی حیثیت ایک عظیم صحرا میں خاک کی چٹکی سے زیادہ نہیں، کچھ بھی کہیں، لیکن ان کے عزم و استقلال اور ہمت و جرأت سے انکار نہیں کر سکتے۔

آپ کو اس نوجوان پولیس مین کی جرأت کی داد دینی ہوگی، جو کل تک سکول میں پڑھتا تھا، لیکن آج ایک وحشی ہجوم کی مذہبی منافرتوں کا مقابلہ تن تنہا کر رہا ہے۔ ہزاروں کے اس ہجوم پر اسے اکیلے قابو پانا ہے۔ اسے حکم ہے کہ گولی صرف آخری حربے کے طور پر چلانی ہے اور اس سے یہ مراد قطعاً نہیں ہے کہ اگر کسی نے بوتل پھینک کر دوسرے شخص کا چہرہ لہولہان کر دیا ہے تو آخری حربہ استعمال کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

آپ کو شمال مغربی سرحد کے اس چھوٹے سے دستے کی ہمت اور عزم و استقلال کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، جو ہمیشہ چھپ کر گولی چلانے والوں کی سائے میں زندگی گزارتا ہے، جو ان لوگوں کے لیے انسانی شکار کی حیثیت رکھتا ہے، جو محض شغل کی خاطر دوسروں کی جان لیتے ہیں کیونکہ قبائلیوں کا طریق زندگی یہی ہے۔

چالیس سال قبل کپلنگ نے شمالی سرحد کے ان محافظوں کی زندگی اور موت پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی تھی۔

کسی سرحدی چوکی پر کشمکش،
کسی تاریک گھاٹی کا سفر.........

اور آپ کی تعلیم و تربیت پر خرچ ہونے والے دو ہزار پونڈ، ایک دس روپے کی بندوق کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ان کے یہ مصرعے آج بھی اُتنے ہی سچ ہیں، جتنی کہ اپنی تحریر کے وقت تھے۔

آپ کو جرأت کی داد دینی پڑے گی، ان ججوں کو جو جھوٹ، فریب اور الزام تراشیوں کے جنگل کے درمیان سیدھی راہ پر چلتے رہے ہیں۔ ان ڈاکٹروں کو جو توہم پرستی اور مخالفت کے حوصلہ شکن ماحول میں بھی اپنے اُصولوں پر قائم رہے: اور ان کاروباری حضرات کو جو ایسے حریفوں کے خلاف مسلسل جنگ لڑتے رہے، جن کے لیے کاروبار میں ایمان داری کے ابتدائی اُصول بھی ناقابلِ فہم تھے۔

اور سب سے زیادہ داد، خواتین کو دینی چاہیے۔ کیونکہ ان چند اور ناقابلِ ذکر عورتوں کے سوا، جن سے ہماری ریس کورس پر ملاقات ہوئی تھی، ہزاروں کی تعداد میں، نرسیں، مشنری اور حکام کی بیویاں ایسی ہیں جو ہماری تعظیم کی مستحق ہیں۔ ان کی ہمت و جرأت سنسنی خیز قسم کی نہ سہی، انھیں زندگی کے اُن صفحات کو آنسو بہائے بغیر پڑھنے کا حوصلہ ضرور دیتی ہیں۔ جن میں سے موسیقی اور رقص کی آوازیں آتی ہیں، جن میں ریشم کمخواب سرسراہٹ محسوس ہوتی ہے اور یہ چیزیں اُنھیں ایک طویل عرصے سے دستیاب نہیں ہوئیں۔ اس طرح کی ہمت کا مظاہرہ، حقیقتاً قابلِ تعریف ہے۔ یہ اس برطانوی بے اعتنائی سے زیادہ مشکل ہے جس کا مظاہرہ خواتین ہر بحران میں کرتی ہیں۔ جب کبھی ان کی ٹرین کو لٹیرے روک لیتے ہیں، یا کوئی ہجوم ان کے دروازے توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے، تو ان پُرخطر لمحات میں یہ خواتین، سکون و اطمینان کا ایک غیر فطری لبادہ، ایک خود کی طرح پہن لیتی ہیں۔

۲

یہ ہیں وہ تین الزامات جو ہندوستان میں مقیم انگریزوں پر عائد کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم ان کو افراد کو حیثیت سے دیکھیں شاہی مشین کے پرزوں کی حیثیت سے نہیں۔

سب سے پہلا الزام یہ ہے کہ وہ کبھی ''تھینک یو'' کے الفاظ نہیں کہتے۔

جس وقت میں ہندوستان میں گوالیار جانے کے لیے پہلی بار ٹرین میں سوار ہوا تو میں نے ایک کرنل سے، جس کا چہرہ نہایت سرخ تھا، دریافت کیا کہ ہندوستان میں تھینک یو کی جگہ کون سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس وقت وہ ہندوستانی قلی جنھوں نے میرا سامان اُٹھایا تھا، اپنی اجرت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ اُس وقت بہت گرمی تھی لیکن انھوں نے اپنا کام نہایت تیزی سے اور ٹھیک طرح کیا تھا اور یہ بات اخلاق کے منافی لگتی تھی کہ ان کو صرف ٹپ دے کر رخصت کر دیا جائے۔

''تھینک یو'' کرنل نے کہا ''تھینک یو''

''ہاں! تھینک یو'' میں نے جواب دیا (اگر آپ اس لفظ کو بار بار دہرائیں تو عجیب سا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہم کسی چینی مچھلی کا نام لے رہے ہوں)۔

''لیکن ہم کبھی یہ لفظ استعمال نہیں کرتے۔'' کرنل نے کہا۔

''تھینک یو کا لفظ نہیں کہتے۔''

''جی ہاں۔ کبھی نہیں۔ ایسا ہوتا ہی نہیں۔'' اس نے زور سے سر ہلایا اور گاڑی کی سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے میری طرف منہ کر کے کہا ''حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس لفظ کے وجود پر شبہ ہے۔ میں تیس برس سے ہندوستان میں ہوں، اُردو جانتا ہوں۔ ہندی جانتا ہوں، لیکن کبھی کسی کو تھینک یو کہتے نہیں سنا۔'' وہ ٹرین میں سوار ہو گیا۔

میں نے ''تھینک یو'' کہنے کی بجائے، اس کمی کو اس طرح دور کیا کہ قلیوں کو زائد ٹپ دے دیا اور یہ بتانے کے لیے کسی مردم آزار شخص کی ضرورت نہیں، کہ انھوں نے میری اس ''بخشش'' کو شکریہ ادا کرنے سے زیادہ پسند کیا۔ ان کی اجرت اتنی قلیل ہوتی ہے کہ وہ ایک زائد آنے کے لیے صاحب کو اپنے چہرے پر تھوکنے کی اجازت دے دیتے اور صاحب لوگ کبھی کبھی ایسا کرنے کے قریب قریب پہنچ جاتے تھے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ واقعہ مجھے بہت اہم لگا۔ انگریزوں نے ہندوستان سے بہت کچھ حاصل کیا ہے لیکن تھینک یو کبھی نہیں کہا۔ ہندوستانیوں نے بھی برطانیہ سے بہت کچھ حاصل کیا ہے لیکن انھوں نے بھی کبھی تھینک یو کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔ یہ انتہائی افسوس کا مقام ہے۔ ایسی باتوں سے فائدہ پہنچتا

ہے۔ مجھے علم ہے کہ اس سلسلے میں طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی جا چکی ہیں، جن کو لوگ کیلنڈروں پر چھاپتے ہیں۔ ان نظموں میں اپاہجوں کے ساتھ مسکرا کر بات کرنے اور بوڑھی سیب بیچنے والی عورت سے تھینک یو کہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان کو پڑھ کر مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ ان اخلاقی مٹھائیوں کے خالق، صرف مسکراہٹ بانٹنے پر اکتفا کرتے ہوں گے اور اپنے چھ پنس (Pence) بچا لیتے ہوں گے۔ لیکن ہم میں کچھ لوگ ایسے بھی ہے جو مسکراتے بھی ہیں اور چھ پنس بھی دیتے ہیں۔

''تھینک یو۔ تھینک یو'' آخر تھینک یو کے لیے کون سا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے سارے ہندوستان میں یہ سوال کیا، اور ہر بار خود کو اجنبی سے اجنبی تر محسوس کیا۔ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ میں کسی عجیب و غریب کمپلیکس کا شکار ہو گیا ہوں۔ میرے سوا کسی شخص کو بھی، خواہ وہ انگریز ہو یا ہندوستانی، اس لفظ کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ نوکر، اپنے سروں پر دیو قامت ٹرنک اُٹھائے ہوئے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ ہوٹل کے کمروں میں داخل ہوتے لیکن کوئی شخص انھیں تھینک یو نہیں کہتا تھا۔ آدھی رات کے وقت جبکہ صاحب لوگ اپنی برانڈی پینے، اور قہقہے لگانے میں مصروف ہوتے تھے، ویٹر جمائیاں لے رہے ہوتے تھے لیکن کوئی شخص تھینک یو نہیں کہتا تھا۔ لوگ دوسروں کی گرائی ہوئی چیزیں اُٹھا کر انھیں واپس کرتے، بسوں میں دوسروں کے لیے راستہ چھوڑتے، اجنبی اور عجیب و غریب گلیوں میں لوگوں کو راستہ بتاتے لیکن تھینک یو کا لفظ کہیں بھی سننے میں نہ آتا تھا۔ حتیٰ کہ میں اپنے آپ کو بے وقوف اور غیر مہذب سمجھنے لگا۔ میں نے اس سے بچنے کا ایک طریقہ نکال لیا۔ جب کسی شخص کا شکریہ ادا کرنا مقصود ہوتا تو میں گلے سے عجیب و غریب سی آواز نکالتا، منہ کو جھٹکا دے کر مسکرا دیتا۔ اس طرح میں جن لوگوں کا شکریہ ادا کرتا، وہ تو چونک سے جاتے تھے، لیکن میرا ضمیر مطمئن ہو جاتا تھا۔

آخر میں بہار کی شہزادی نے مجھے وہ لفظ بتائے جو تھینک یو کا متبادل ہو سکتے تھے اور ہندوستانی خواتین میں سے وہ واحد خاتون تھیں جنھیں اس لفظ کے استعمال کی ضرورت پیش ہی نہیں آنی چاہیے، کیونکہ وہ اتنی خوبصورت تھیں کہ ان کی ایک مسکراہٹ ہی شکریے کے سینکڑوں الفاظ سے زیادہ تھی۔ وہ خود بھی ہندوستانی نہیں تھیں۔ وہ ایک سابق خلیفہ کی صاحبزادی تھیں اور شاہی آداب کے ساتھ ساتھ، شاہی خون بھی ان کی رگوں میں گردش کرتا تھا۔ ان کو بھی تھینک یو کا متبادل نہ ہونے سے پریشانی ہوئی تھی۔ انھوں نے مجھے دو لفظ تحفے کے طور پر پیش کیے جو یورپین لوگوں کے ابتدائی قاعدے میں نہیں ملتے۔ شاید اس لیے کہ ان

کا استعمال حقیقی زندگی میں بہت کم ہوتا ہے۔ ان میں سے پہلا لفظ ''مہربانی'' اور دوسرا لفظ ''شکریہ'' تھا۔ میں نے ان الفاظ کا استعمال نہایت اونچی آواز میں علاقے کے نیچ ذات اور غلیظ ترین فقیروں پر بھی کرنا شروع کر دیا، جس سے صاحب لوگ اور اونچی ذات کے ہندو دہل کر رہ جایا کرتے تھے لیکن ان غریب فقیروں کے لیے یہ مسرت کا باعث ہوتے تھے جنھوں نے پہلے کسی شخص کے منہ سے اس طرح کے الفاظ سُنے ہی نہیں تھے۔

۳

ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں پر دوسرا اہم الزام یہ ہے کہ وہ ہندوستان میں رہتے ہی نہیں۔ ان کے دل تو ہر وقت سکاٹ لینڈ کی پہاڑیوں یا کیسنگٹن ہائی سٹریٹ (Kesington High Street) میں ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہندوستان کو سمجھنے کی ذرہ برابر بھی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے ذہن میں تو ہر وقت یہی خیال سمایا رہتا ہے کہ وہ یہاں سے کب اور کتنے منافع بخش طریقے سے، جانے کے قابل ہوں گے۔

اس طرح کے لوگ، نہایت نفرت کے ساتھ مجھ سے کہا کرتے تھے۔

''کیا کہا آپ ہندوستان کے بارے میں کتاب لکھیں گے؟ آپ کو یہاں آئے ہوئے ایک برس بھی نہیں ہوا۔ مجھے دیکھیے، بیس سال سے ہندوستان میں ہوں اور ابھی تک مجھے ہندوستان کے بارے میں ایک بات معلوم نہیں ہو سکی۔''

ایسے مواقع پر جی چاہتا ہے کہ جواب میں ان سے کہا جائے ''ظاہری بات ہے'' اگر آپ ہندوستان میں مزید بیس سال بھی رہیں گے تو آپ کو یہاں کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوگا۔'' آپ اسی طرح جاہل کے جاہل رہیں گے۔''

ایک تربیت یافتہ رپورٹر کے لیے یہ بات نہایت پریشان کن ہوتی ہے کہ کوئی اسے بتائے کہ کسی جگہ کے بارے میں اپنے خیالات قلمبند کرنے کے لیے وہاں بیس سال کا عرصہ گزارنا ضروری ہے۔ ایک تربیت یافتہ رپورٹر تو ایک مرتبہ ٹرین کے سفر میں اتنی معلومات جمع کر لیتا ہے، جتنی ایک عام شخص ایک برس کے قیام میں جمع نہیں کر سکتا۔

یہاں میں وہ ابتدائی سوالات اور ایک اوسط درجے کے انگریز کے جواب درج کر رہا ہوں، جو ہندوستان کے بارے میں کیے جا سکتے ہیں۔

"کیا آپ نے کبھی کوئی ہندوستانی فلم دیکھی ہے؟"

"خدا کا نام لیں۔ نہیں میں نے نہیں دیکھیں۔ یہ ہندوستانی فلمیں، نہایت خوفناک چیز ہوتی ہیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی فلمیں، یہاں کی قومی نفسیات کو سمجھنے کا آسان ترین اور تیز ترین ذریعہ ہیں۔

"کیا آپ نے بھگوت گیتا پڑھی ہے؟"

"وہ کون ہے؟ کیا کہا آپ نے؟"

"بھگوت گیتا"

لیکن انھوں نے اس کا نام تک نہیں سنا ہوتا۔ جیسے انگلستان آنے والے کسی ہندوستانی نے "نیو ٹسٹامنٹ" (New Testament) کا نام نہ سنا ہو۔

میں نے کئی انگریز پادریوں سے ملاقات کی۔ لیکن ان میں سے صرف دو ایسے نکلے جنھوں نے ایبے ڈبوئس کی ہندوؤں کے مجلسی آداب، معمولات اور رسمیں" (Abbe' Dubois', Hindu Manners, Customs and Ceremonies) کا نام سُنا تھا۔ لیکن انھوں نے بھی اسے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ حالانکہ ڈبوئس کی یہ کتاب، ان کلاسیکی کتابوں میں شامل ہے، جن کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ وہ ان مصنفوں میں سے ایک ہے، جس کے مطالعے کو ہندوستان کے بارے میں علم حاصل کرنے والا کوئی طالب علم، نظر انداز نہیں کر سکتا۔

"کیا آپ نے کوئی رات، ہندوستان کے کسی گاؤں میں بسر کی ہے؟"

"نہیں۔ خدا کا شکر ہے۔ وہاں تو کھٹمل بہت ہوتے ہیں۔"

آپ ہندوستان کے دل میں اس وقت تک کیونکر داخل ہو سکتے ہیں جب تک آپ نے کم سے کم ایک رات کسانوں کے ساتھ، کسانوں کے انداز میں نہ گزاری ہو؟

میں نے یہ تجربہ زیادہ بار تو نہیں کیا، لیکن ایک چھوٹے سے تجربے میں بھی مجھے ایک درجن کتابوں سے زیادہ باتیں معلوم ہوگئیں۔ مثال کے طور پر مجھے اس عجیب و غریب احساس یگانگت کا اندازہ ہوگیا، جو ہندوستانی باشندوں کو جانوروں کے ساتھ ہے۔ ایک جھونپڑی میں ایک کونے میں چار چھوٹی چھوٹی بکریوں کا سونا، دوسرے کونے میں مرغیوں کی موجودگی اور باہر بندھے ہوئے بیل کا بار بار نہایت سنجیدگی کے ساتھ

دروازے سے اندر جھانکنا، یہ تمام باتیں مجھے قدرتی نظر آنے لگیں۔ یہ سچ ہے کہ مجھے نیند زیادہ نہیں آئی، ساری رات کھٹملوں نے پریشان رکھا، لیکن اس کی تلافی ایک طرح سے نہیں بلکہ کئی طرح سے ہوگئی۔ شام کے وقت، بڑھتے ہوئے سایوں میں بانسری کی آواز، کنوئیں سے پانی بھرنے والی عورتوں کے دلکش خاکے، جو گہرے سبز آسمان کے پس منظر میں سیاہ نظر آرہے تھے، وہ دہی کا پیالہ اور تازہ پھل جو انھوں نے مجھے سونے سے پہلے پیش کیے تھے اور فرنگی پانی کا وہ ہار جو انھوں نے میری گردن میں ڈالا تھا۔ میں نے ان لوگوں کے رخصت ہوتے ہی وہ ہار اپنے گلے سے اُتار کر دیوار پر ٹانگ دیا اور چاندی کی اس ڈوری کو جس میں اسے پرویا گیا، ساری رات لالٹین کی روشنی میں چمکتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اور پھر اچانک صبح کا منظر، گہرے سرخ رنگ کی حسین صبح طلوع ہونے کا منظر، اور کسانوں کے وہ گیت جو وہ دھان کی فصلوں میں جاتے ہوئے گاتے ہیں۔ صبح کی روشنی میں دھان کے کھیتوں سے زیادہ دلکش منظر کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ بالکل ایک لحاف کی مانند جس پر سبز رنگ کے مختلف شیڈوں سے کشیدہ کاری کی گئی ہو۔ جہاں سرخ رنگ کی زمین میں دھان کی پنیری کاشت کی گئی تھی، اس حصے کے زردی مائل سبز رنگ سے لے کر اس گہرے سبز کا ہی رنگ تک جہاں پودے بڑے بڑے ہوگئے تھے رنگ کے مختلف شیڈ دکھائی دے رہے تھے۔

ایک اتنے خوشگوار تجربے کو، چند کھٹملوں کے خوف پر قربان کر دینا کچھ نہیں تو کم از کم غیر مہم جویانہ ضرور تھا۔

"کیا آپ کسی ہندوستانی کو حقیقتاً اپنا دوست سمجھتے ہیں؟"

"دوست؟ میں چند مہذب ہندوستانیوں سے واقف ضرور ہوں...... واقعی مہذب ہندوستانی، لیکن میں انھیں اپنا دوست تصور نہیں کرتا۔"

یہی شاید سب سے بڑا المیہ ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان ایک خلیج موجود ہے اور زیادہ تر لوگ اپنی بہترین کوششوں کے باوجود اس خلیج کو پُر نہیں کر سکتے۔

وہ غیر فانی گارڈن پارٹی، جس سے ای-ایم-فارسٹر نے اپنی کتاب اے پیج ٹو انڈیا (A Passage to India) کا آغاز کیا تھا، صرف ماضی کی ایک یادگار نہیں ہے۔ آج بھی ہندوستان کے ہزاروں باغات میں روز اس طرح کی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ اس بات میں شک نہیں کہ آج سفید اور کالے کے درمیان فرق پہلے سے کم ہے، آج ساڑھی اور سکرٹ، گاندھی کیپ اور پاناما ہیٹ، ایک دوسرے سے ملتے

ہیں، اوران کی گفتگو میں میں پریشان کن وقفے نہیں آتے۔ کیونکہ انگریزوں کو اپنا مستقبل غیر یقینی نظر آ رہا ہے، جبکہ ہندوستانی اس سلسلے میں پُر یقین ہیں۔ لیکن گارڈن پارٹی آج بھی وہی ہے۔ ذرا اس کی جھوٹی چمک دمک کو ختم کر کے اسے اپنی غیر جانبدارانہ اور ناقدانہ ذہانت کی روشنی میں دیکھیے، آپ کو وہی پہلے والا منظر نظر آ جائے گا۔ سفید فام لوگ سیاہ فاموں کے ساتھ شامل ہونے کو تیار نہیں، ساڑھی اور سکرٹ دونوں الگ الگ ہیں اور مشرق و مغرب ایک دوسرے سے ملنے کو تیار نہیں ہیں۔

اس کا سارا الزام انگریزوں پر کسی طرح بھی عائد نہیں کیا جا سکتا۔ بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ انگریز دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں لیکن ہندوستانی اسے جھٹک دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ہندوستان کے مل سٹیشنوں میں زیادہ تر کلب، نسلی امتیاز نہیں کرتے۔ تمام ارکان قطعاً برابر شمار کیے جاتے ہیں، بشرطیکہ وہ کلب کی فیس ادا کرتے ہوں۔ کسی سے کوئی سوال نہیں کیا جاتا اور نہ کسی کو مراعات دی جاتی ہیں۔

یہ باتیں اُصولی طور پر بہت اچھی ہیں۔ لیکن عملاً کیا ہوتا ہے؟ ہندوستانی مرد اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو کلب آنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ خود باقاعدگی سے کلب آتے ہیں اور ہر رات انگریز افسروں کی بیویوں کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔ لیکن ان کی عورتیں بدستور اپنے گھروں میں رہتی ہیں۔ یہ بات انگریزوں، خاص طور پر نوجوان انگریز مردوں کو بہت ناگوار گزرتی ہے۔ نسبتاً ''ترقی یافتہ'' ہندوستانی بھی، اپنی عورتوں کو گھروں میں اس طرح بند رکھتے ہیں کہ ان پر کسی کی نظر نہ پڑے، جیسے ہر شخص ملتے ہی ان پر جھپٹ پڑے گا!

اس میں شک نہیں کہ یہ ناگواری نہایت معمولی سی ہے، لیکن بالکل ویسی ہی ہے، جو ہندوستانی اس وقت محسوس کرتے ہیں جب اُن کو، اُن کے اپنے گھر میں نسلی تعصب کا شکار بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات ضروری ہے کہ انگریزوں کو بھی اس کا احساس دلایا جائے کہ ان کا تعصب ہندوستانیوں کو کس قدر ناگوار گزرتا ہے۔

شاید انگریزوں سے اہم ترین سوال یہ ہو سکتا ہے،

''آپ اینگلو انڈین لوگوں کے بارے میں کیا کہیں گے؟''

لیکن شاید اس سوال کے جواب میں ''پکا صاحب'' اپنی حقیقی ذہنیت کو بے نقاب کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

۴

ہندوستان میں اس وقت تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار اینگلو انڈین [1] ہیں اور شاید دنیا کی بدقسمت ترین آبادی کے فرد ہیں۔

وہ نہ انگریز ہیں نہ ہندوستانی، نہ یہ ہیں نہ وہ، اُن کی قسمت میں شکست لکھی ہوئی ہے، خواہ گیند سیاہ خانے پر رُکے، یا سرخ خانے پر یا صفر کے خانے پر۔ انسان کی فطرت اتنی غیر روادار اور متکبر، اور انسانی دماغ اس قدر غیر منطقی ہے کہ اُن کے دونوں سوتیلے بھائی، انگریز اور ہندوستانی ان سے نفرت کرتے ہیں۔

اور یہی نہیں، سب سے بُری بات یہ ہے کہ خود انھیں بھی آپ سے نفرت ہے۔

ان کو صرف ایک لگن ہے، جس نے انھیں بُری طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، کہ کسی طرح اپنے خون کی آمیزش سے انکار کر سکیں۔

یہ بات اگر اتنی المناک نہ ہوتی تو یقیناً مضحکہ خیز ہوتی۔ میں ایک زمانے میں ایک اینگلو انڈین نرس سے واقف تھا، وہ ایک اچھی لڑکی تھی، صابر، کام میں ماہر اور اپنے سیاہی مائل رنگ کے باوجود خوبصورت، اس کی اصلیت کے بارے میں شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے بال، اس کی آنکھیں اور اس کی ہتھیلیاں سب اس کی اصلیت کی غمازی کرتے تھے۔ لیکن اسے بات کرتے ہوئے سُن کر تو آپ کو گمان ہوتا تھا کہ وہ اپنا شجرۂ نسب شاہی خاندان سے ملا سکتی ہے۔ جب کوئی چپڑاسی غلط دوا لے آتا یا کوئی جمعدارنی صفائی میں سستی کا مظاہرہ کرتی تو وہ چیخ کر کہتی۔ ''یہ ہندوستانی......ان کا کوئی کیا کرے۔ کسی کام کے نہیں ہوتے۔''

اس کا باپ انگریز اور ماں ہندوستانی تھی۔ وہ اکثر باپ کے ساتھ اپنی تصاویر مجھے دکھایا کرتی تھی۔ ان تصویروں میں کہیں بھی اس کی ماں نظر نہیں آتی تھی۔ صرف ایک بار مجھے اس کی ایک جھلک نظر آئی تھی، ایک تاریک سا سایہ جو تصویر کے پس منظر میں نظر آ رہا تھا۔ لیکن جونہی وہ تصویر نظر آئی، اس نے اپنے البم کا وہ صفحہ پلٹ دیا۔

---

(۱) اینگلو انڈین کی اصطلاح ''ہاف کاسٹ'' (Half Caste) (یعنی آدھی ذات والا) کی ایک شائستہ شکل ہے۔ ان میں نوے فی صد انگریز مرد تھے جنھوں نے ہندوستانی عورتوں سے شادی کی تھی۔ ایسی انگریز عورتوں کی تعداد بہت کم ہے جنھوں نے ہندوستانیوں سے شادی کی ۱،۴۰،۰۰۰ کی تعداد بھی حقیقت سے بہت کم ہے، کیونکہ اینگلو انڈین اپنے آپ کو مخلوط نسل کا، ظاہر کرنے سے گھبراتے ہیں، اور اپنی اصلیت کو چھپانے کے لیے ہر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں۔

''مجھے ''گھر'' سے باہر بہت دن ہوگئے ہیں۔'' بہت ہی زیادہ'' یہ ہے۔ایک اینگلو انڈین لڑکی کا وہ فقرہ جسے وہ ہر دم دہراتی رہتی ہے۔''بہت لمبا عرصہ گزر گیا میرا'' گھر'' سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔'' حالانکہ وہ غریب لڑکی کبھی'' گھر'' گئی ہی نہیں۔لیکن وہ اس کا اعتراف نہیں کرتی۔ وہ اس اعتراف پر موت کو ترجیح دیتی ہے۔

''میری رگوں میں ہسپانوی خون ہے'' یہ ایک اور بات ہے جسے یہ لوگ ہر دم یاد دلاتے رہتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے کالے، بالوں اور سیاہ رنگت پر پردہ پڑ سکتا ہے۔بعض لڑکیوں نے تو ہسپانوی زبان کا ایک آدھ لفظ بھی سیکھ لیا ہے جسے وہ ہر وقت، کسی سے بھی بات کر رہی ہوں، دہراتی رہتی ہیں اور کہتی ہیں کہ یہ فقرہ انھوں نے اپنی دادی سے سیکھا تھا۔

''چار ہفتے میں آپ کا چہرہ، چار گنا گورا'' یہ ان بے شمار اشتہارات کی سرخیوں میں سے ایک ہے جو کھال کو گورا کرنے کی ادویات تیار کرنے والی کمپنیاں شائع کراتی ہے۔اینگلو انڈین لڑکیاں اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ان دواؤں کی خریداری پر صرف کر دیتی ہیں۔ کیونکہ ان دواؤں کے اشتہارات نہایت چالاکی سے تیار کیے جاتے ہیں۔'' آپ ایک منٹ کے لیے بھی یہ نہ سوچے کہ اگر آپ کا رنگ پیدائشی طور پر کالا ہے، تو آپ کچھ نہیں کر سکتیں۔اب اس دوا کے آجانے کے بعد، بیوٹی ٹریٹمنٹ کی دنیا میں انقلاب آ گیا ہے۔ یہ آپ کی کھال کے لیے بہترین ٹانک ہے جو براہ راست ان خلیوں پر اثر کرتی ہے، جو آپ کی رنگت کو کنٹرول کرتے ہیں۔

میں ان ادویات کے اثر پر تبصرہ کرنے کا اہل نہیں، لیکن اگر اُن کے بلند بانگ دعوؤں کو درست بھی تسلیم کر لیا جائے تب بھی اینگلو انڈین لڑکیوں کو پہچاننا دشوار نہیں ہوگا۔ وہ اپنی آواز تو نہیں بدل سکیں گی۔ ان کی آواز میں ایک عجیب سی تیزی ہوتی ہے جو ہنستے وقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر ان کے بال بھورے بھی ہوں، اگر پیدائشی طور پر ان کی رنگت صاف ہو تب بھی ان کی رنگت میں سیاہی کا سایہ صاف نظر آتا ہے۔ جیسے ان کی رگوں میں خون کی جگہ شہد گردش کر رہا ہو۔بعض اوقات یہ رنگت بہت خوبصورت نظر آتی ہے، بالکل اس طرح جیسے چراغوں کی روشنی میں ہاتھی دانت کے مجسمے رکھے ہوں، لیکن اس پر مشرق کی چھاپ بہت نمایاں ہوتی ہے۔

ان لڑکیوں کی صرف ایک تمنا ہوتی ہے کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو کسی انگریز سے شادی کر لیں، اور

اس ملک سے باہر کہیں بھی، کسی طرح بھی باہر نکل جائیں۔انھیں زندگی نے ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا ہے جو نہ ادھر ہے نہ ادھر، نہ انھیں انگریز قبول کرتے ہیں نہ ہندوستانی۔ چنانچہ وہ چاہتی ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو، اس قید خانے سے نکل جائیں۔ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے اس خواہش میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ امریکی اور برطانوی فوجیوں کو شادی کی بے شمار پیش کشیں کی جاتی ہیں، جن کے ساتھ اکثر مالی ترغیبات بھی شامل ہوتی ہیں۔

ہم اس قسم کی لڑکیوں کو کوئی الزام نہیں دے سکتے۔ خاص طور پر ان کو جو یہ جانتی ہیں کہ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہو جائے گا۔اسے اپنی بہن کی مثال یاد ہے جس کی شادی کسی انگریز کے ساتھ نہیں ہو سکی اور مثال چنداں خوشگوار نہیں ہے، اس کے سامنے صرف دو راہیں ہیں، یا تو وہ شادی نہ کرے اور تنہائی میں فخر کے ساتھ، جو اس کے افلاس کا نعم البدل ثابت نہیں ہو سکتا، اپنی باقی زندگی بسر کرے یا پھر کسی ہندوستانی سے شادی کرے اور اس زمرے میں شامل ہو جائے جس سے انھیں اتنی نفرت ہے۔ یہ دوسری راہ اکثر اوقات ان کے لیے شدید پچھتاوے کا باعث بنتی ہے کیونکہ اس کے ہندوستانی رشتہ دار ہمیشہ اس سے نفرت کرتے رہیں گے، اسے شک وشبہ کی نظر سے دیکھیں گے اور کبھی بھی اسے ''اپنوں'' میں شمار نہیں کریں گے۔ اگر اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو جائے اور وہ بھی اپنے دادا کی طرح تو اس کی پوزیشن اور بھی ناگوار ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے اینگلو انڈین کیتھولک سکول بھی اسے ''غیر'' سمجھتے ہیں۔ وہ تلخ مزاج ہو جاتا ہے اور جب بڑا ہو جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ذلیل کرنے میں خوشی محسوس کرنی شروع کر دیتا ہے۔ شہر کے لفنگوں کے ساتھ شراب پینے لگتا ہے۔ قحبہ خانوں میں لڑائیاں لڑتا ہے، بندرگاہوں پر آوارہ گردی کرتا ہے اور ہندی میں گالیاں نکالتا ہے۔...... بالکل کم (Kim) کی طرح جو زندگی کی راہوں میں بھٹک گیا تھا۔

ان کی پہلی نسل میں، جب تک وہ اپنے انگریز باپ کی شیخی مار سکتے تھے، ان کی حالت اس قدر خراب نہیں تھی۔ اس بات کی ضمانت دینے کے لیے کہ ان کا بھی کوئی مقام ہے، سماجی طور پر نہ سہی سرکاری طور پر سہی، مختلف سرکاری محکموں میں ان کے لیے کافی اسامیاں مخصوص ہیں، خاص کر پولیس اور ریلوے میں۔ ان میں سے چند لوگ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر ایسی پوزیشنوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے جہاں انھیں دولت اور اہمیت دونوں حاصل ہوئیں۔ لیکن اینگلو انڈین باشندوں کی زیادہ تر تعداد کے لیے مستقبل اتنا روشن نہیں ہے اور ہمیں یہ بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان کی زیادہ مشکلات، خود ان کی اپنی پیدا کردہ ہیں۔ وہ شدید

احساس کمتری کا شکار ہونے کی وجہ سے، اس خیال کو دیوانگی کی حد تک اپنائے ہوئے ہیں کہ ہم "ہندوستانیوں سے برتر ہیں۔ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ کر کے دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ برطانیہ سے وفاداری اس حد تک کرتے ہیں کہ وہ مضحکہ خیز نظر آنے لگتے ہیں۔

یہ افسوس ناک صورت حال، کسی حد تک برطانوی حکومت پر ایک بدنما دھبے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ۱۸۵۷ء کی ذہنیت کا نتیجہ، بلکہ باقیات میں سے ہے۔ اس وقت ہندوستانیوں کو "کمبخت مقامی باشندوں" کا نام دیا جاتا تھا اور چند سر پھرے لوگ اس خیال میں مست رہتے تھے کہ "ان لوگوں کی فلاح و بہبود کے ضامن ہم ہیں"۔ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ ایسا رویہ اختیار کرنا اتنا ہی غیر منافع بخش ہے جتنا کہ یہ ظالمانہ ہے۔ ڈچ باشندوں نے کبھی اپنی ماتحت قوموں کے ساتھ اس قسم کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے شروع ہی سے دونوں نسلوں کے درمیان شادیوں کی حوصلہ افزائی کی جس کی وجہ سے آج بھی ان کے ماتحت علاقوں میں یوریشین نسل، ایک زندہ اور باوقار قوم تسلیم کی جاتی ہے بلکہ ڈچ کالونیوں میں استحکام کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

اگر ہم نے بھی ڈچ لوگوں کی مثال اپنائی ہوتی تو کیا ہوتا؟ اگر ہم میں اتنی دور اندیشی ہوتی کہ ہم مشرق اور مغرب کی شادی کرا دیتے؟ اگر ہم اینگلو انڈین باشندوں کا ایک بڑا طبقہ تخلیق کر دیتے جو قرار واقعی حقوق و مراعات کا مالک ہوتا...... تو کیا ہوتا؟ یہ سوچنا مؤرخوں کے لیے ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ قیاس آرائی اب صرف قیاس آرائی ہی رہے گی۔ اس کا تجربہ کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب ہندوستان میں انگریزوں کی طاقت تیزی سے زوال کی جانب جا رہی ہے اور اینگلو انڈین باشندے بے یار و مددگار، ساحل پر کھڑے اُفق پر اس جہاز کا انتظار کرتے رہیں گے جو انھیں یہاں سے لے جائے...... لیکن وہ جہاز کبھی نہیں آئے گا۔

☆☆☆

چھٹا باب

چند اختتامی معروضات

اس طرح کی کسی بھی کتاب میں بہت ساری چیزوں کا چھوٹ جانا، ناگزیر ہوتا ہے۔ لیکن اس اعتراف کا مقصد اس مکتب فکر کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں ہے، جو ہندوستان کے بارے میں کتاب لکھنے کے لیے کم از کم تیس برس ہندوستان میں گزارنے کی شرط عائد کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص سو برس تک بھی ہندوستان میں رہے تو بھی اس کے علم میں بے شمار خامیاں موجود ہوں گی۔ ہندوستان جیسے پیچیدہ اور ناقابل فہم ملک میں تو اگر سکالروں کی فوج کئی نسلوں تک کام کرتی رہے، تب بھی وہ صرف اس کی سطح تک ہی محدود رہے گی اس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ پائے گی۔ ایک اکیلا آدمی تو صرف اتنا کر سکتا ہے کہ اسے جو پہلو اہم نظر آئیں، ان کا ایک ابتدائی خاکہ تیار کر دے۔

میری بھی یہی کوشش رہی ہے لیکن اس کے باوجود مجھے اندازہ ہے کہ اس خاکے میں بہت سی لکیریں غیر یقینی اور مبہم ہیں، بہت سی خالی جگہیں ہیں جن کو پُر کرنا ضروری ہے۔ اس باب میں ہم ان لکیروں میں توانائی اور خالی مقامات کو پُر کرنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے ہم اس چیز کو لیتے ہیں، جو ہندوستان کے بارے میں بہت کم کتابوں میں نظر آتی ہے۔

ریاستیں

دارالعوام میں ہندوستان کے بارے میں جو مباحثے ہوتے ہیں، ان پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی ہمیں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ زیادہ تر مقرر اس بات سے قطعاً ناواقف ہیں کہ ہندوستان کا دو بٹا پانچ رقبہ برطانوی حکومت میں شامل نہیں ہے۔ اس علاقے میں مختلف راجے اور شہزادے حکمران ہیں۔[1] جن کی رعایا میں کم از کم آٹھ کروڑ افراد شامل ہیں۔ اگر کوئی مقرر، ریاستوں کا ذکر بھی کرتا ہے تو سرپرستی کے اس انداز سے جیسے وہ ریاستیں نہیں، سرکس میں رکھے ہوئے کھلونے ہیں، جو کانگریس چھڑی کی ایک جنبش کے ساتھ

(۱) ہندوستان میں ۵۶۲ ریاستیں ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک تہائی کی حیثیت معمولی ہے اور سو ریاستیں تو اتنی چھوٹی ہیں کہ ریاستوں کی بجائے جاگیروں کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ تاہم ان میں سے بعض ریاستیں مثلاً کشمیر، حیدر آباد اور میسور بڑی ریاستوں میں شمار ہوتی ہیں اور ان کی آبادی یورپ کے بعض ممالک سے زیادہ ہے۔

غائب کرسکتی ہے۔ وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ کیا ان کو غائب کرنا ایک پسندیدہ فعل ہوگا؟ اور اگر ہم فرض کر بھی لیں کہ پسندیدہ فعل ہوگا تو یہ کام کس طرح کیا جائے گا اور کون کرے گا؟ اور نہ ہی یہ مقرر، اس انتہائی اقدام کے ممکنہ نتائج کے بارے میں سوچتے ہیں۔

کیا ان ریاستوں کے حق میں کچھ کہا جاسکتا ہے؟ یقیناً اگر ہم عملی انسان ہیں، تو سب سے پہلے اس بات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کریں گے اور یہ فیصلہ ہم ان ریاستوں میں سے ایک ریاست کے دورے کے بعد کریں گے۔

۲

شام پانچ بجے کے قریب، اگر آپ بیلاری سے بنگلور (جو ریاست میسور کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے) جانے والی ٹرین میں سفر کر رہے ہوں تو آپ کو قدرتی مناظر میں اچانک تبدیلی کا احساس ہوگا۔ یہ تبدیلی، درختوں، یا پھولوں کی نہیں اور نہ ہی جغرافیائی حالات سے متعلق ہے، بلکہ ایک معاشرتی تبدیلی ہے۔ اب تک آپ خستہ حال دیہات، اجڑے ہوئے کھیت اور پتلے دُبلے، نیم فاقہ کش مویشی دیکھ رہے تھے، اچانک آپ کو صاف ستھرے گھر، سبزہ زار زمین، وسیع چراگاہیں اور اتنے تندرست و توانا مویشی نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں، جن پر انگلستان کی کوئی کاؤنٹی بھی فخر کرسکتی تھی، یہ تبدیلی اس قدر حیرت انگیز ہوتی ہے کہ ہر مسافر یہ دریافت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایک دم یہ تبدیلی کس طرح آگئی۔ اس کا جواب ہے۔

''ہم نے ابھی سرحد عبور کی ہے اور برطانوی ہند سے ریاست میسور میں داخل ہوگئے ہیں۔''

ہر انگریز جو پہلی بار یہ بات سُن رہا ہو، اس پر اس کا ردِعمل پریشان کن ہوتا ہے.......... یا کم از کم پریشان کن ہونا چاہیے۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ ''اگر میسور کی خوشحالی اور ہندوستان کے افلاس میں، جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں، اس قدر نمایاں فرق ہے، تو برطانوی ہندوستان میں یقیناً کوئی خرابی، کوئی خامی ہوگی۔'' ہم اس ردِعمل پر ابھی تھوڑی دیر میں غور کریں گے کیونکہ یہ ردِعمل قدرتی، صحت مند اور جواب کا حقدار ہے۔ لیکن فی الحال ہم ان لہلہاتے کھیتوں اور خوشحال دیہات کو دیکھتے ہیں جو اگر ہمارے غور سے دیکھنے پر بھی اصلی اور حقیقی ثابت ہوتے ہیں تو ان ہندوستانی تبصرہ نگاروں کو خاموش کرانے کے لیے کافی ثابت ہو سکتے ہیں جو ریاستوں کو عہدِ رفتہ کی یادگار سمجھ کر نظرانداز کر دیتے ہیں اور انھیں کوڑے کے ڈھیر سمجھتے ہیں جن کو کانگریسی شعلوں کی نذر کر دینا چاہیے۔

بنگلور میں گاڑی سے اُتر کر ہمیں ایک جدید شہر نظر آتا ہے، جہاں روشنی کا انتظام اچھا اور سڑکیں پختہ ہیں اور ہندوستانی معیار کے مطابق تقریباً صاف ستھرا ہے۔ یہاں ہمیں وہ ناقابلِ بیان گندگی نظر نہیں آتی جو ہندوستان کے زیادہ تر بڑے شہروں کے گلی کوچوں میں ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ وہ بدبودار، سڑے ہوئے گند، غلاظتوں کے ڈھیر اور ان پر بھنبھناتی ہوئی مکھیاں، کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا حتیٰ کہ کتوں کی وہ غم ناک فوج، وہ خواری اور بیماریوں کی پوٹلیاں بھی کہیں نظر نہیں آتیں۔ میسور کے مہاراجا اگرچہ ایک راسخ العقیدہ ہندو ہیں، لیکن ان میں لوگوں کے مذہبی جذبات کا مقابلہ کرنے کی اتنی جرأت بھی ہے کہ انھوں نے بیمار کتوں کو اذیت ناک زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی۔

میسور شہر میں بھی یہی کہانی دہرائی جارہی ہے۔ ہسپتال، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، آرٹ اور دستکاریوں کے سکول، کہیں کہیں نہیں بلکہ بیسیوں کی تعداد میں نظر آتے ہیں اور جب آپ شہر سے نکل کر دیہات کی طرف جائیں تو کشادہ اور پختہ سڑکیں، اور سرسبز کھیت آپ کے منتظر ہوں گے جس طرف بھی نظر دوڑائیں آپ کو زرخیز زمین نظر آئے گی جس کو آبپاشی کے ایک بہت بڑے نظام سے سیراب کیا جاتا ہے۔ جب آپ سڑک کو چھوڑ کر پیدل سفر کرنا شروع کریں تو آپ کو ہر دیہات ہندوستانی معیار سے، صاف ستھرا نظر آئے گا۔ لیکن یہاں اس بات کی وضاحت کرنی ضروری ہے کہ ہندوستان میں ''صاف'' کے معنی، کسی دوسرے ملک میں ''صاف'' کے مطلب سے مختلف ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ آپ کہیں کہ ''یہ نشانیاں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے، صرف ایک سیاح (ٹورسٹ) کا سرسری تاثر ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس حسین پردے کے پیچھے، مطلق العنانیت اور ظلم اپنی انتہائی نفرت انگیز شکل میں، پروان چڑھ رہے ہوں۔''

ہاں! ایسا ممکن ضرور ہے لیکن یہاں ایسا نہیں ہو رہا۔

حکومت کے دائرہ کار میں بھی ہمیں یہی اعلیٰ معیار دکھائی دیتا ہے۔ اصولی اور عملی، دونوں طور پر، میسور کے نمائندہ اداروں کو محض اس وجہ سے، کہ انتظامیہ، مقننہ کے سامنے پوری طرح جواب دہ نہیں ہے، تضحیک سے دیکھنا، بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے برطانیہ کے دارالامرا کو قطعاً بے کار قرار دینا۔ دارالامرا کا اُصولی طور پر دفاع کرنا مشکل ہے (لیکن دوسرے ملکوں میں بھی ایسے قابلِ تعریف ادارے ہیں جن کا اُصولی جواز پیش کرنا آسان کام نہیں) لیکن عملی طور پر کم سے کم آج کے دور میں یہ نہایت مفید خدمت انجام دے رہا ہے اور

میسور میں بھی، جہاں انتظامیہ کی پوزیشن وہی ہے جو اس صدی کے آغاز میں دارالامرا کی تھی، انتظامیہ بہت شاذ ہی کبھی عوام کی منتخب اسمبلی سے نبرد آزما ہوتی ہے، کیونکہ اسمبلی کو اپنی طاقت کا پوری طرح اندازہ ہے۔

اگر کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کی ریاستی فضا میں جمہوریت زندہ نہیں رہ سکتی یا فروغ حاصل نہیں کر سکتی تو اسے میسور کی قانون ساز کونسل کے مباحثوں کا مطالعہ کر کے اپنی خام خیالی کا علاج کر لینا چاہیے۔ تقریروں کے معیار اور عملی دانش مندی میں دنیا کے بہت کم منتخب ادارے ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ میرے یہاں آنے سے چند روز قبل، کونسل میں اجتماعی جرمانوں کے بل پر گرما گرم بحث ہوئی تھی۔ اس بل کا مقصد جیسا کہ اس کا نام ظاہر کرتا ہے، ایسے دیہاتوں کے تمام باشندوں پر اجتماعی جرمانہ عائد کرنا تھا، جہاں کسی قسم کی گڑبڑ یا فساد ہوا ہو (یہ بل برطانوی ہندوستان کے ایک بل کی نقل تھا)۔ اس بحث میں اگرچہ ارکان کے جذبات بہت برانگیختہ تھے، لیکن بحث نہایت درمیانہ روی کے ساتھ اور متوازن طریقے سے ہوئی، جس کی مثال برطانوی دارالعوام کے ریکارڈ میں بھی مشکل سے ملے گی۔ [1] بحث کے بعد اس بل کے حق میں چونتیس اور مخالفت میں اکیس ووٹ پڑے۔ اس میں کئی ترامیم، حزب اختلاف کی جانب سے پیش کی گئیں اور تمام کی تمام منظور کر لی گئیں۔ یہ ایک روشن خیال جمہوریت کی مثال ہے۔ یا آپ اسے ایک روشن خیال بادشاہت کی مثال بھی قرار دے سکتے ہیں کیونکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں۔

میں نے میسور کو ہر زاویے سے دیکھا ہے۔ میں نے محل میں مہاراجا سے ملاقات کی............ اور محل بھی کیا چیز ہے! اس کا طرزِ تعمیر اچھا نہیں بالکل شادی کے کیک کی طرح نظر آتا ہے جس میں اوپر تلے کئی منزلیں ہیں اور ہر منزل پر بے انتہا آرائش کی گئی ہے۔ لیکن شام ہوتے ہی اس عظیم عمارت کی حیثیت ہی تبدیل ہو جاتی ہے۔ جونہی اس کی آرائشی روشنیاں جلنی شروع ہوتی ہیں، انسان اپنے آپ کو پرستان میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ وہ کیک جیسی بلڈنگ نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے اور ہمیں صرف اس کا ڈھانچا یا یوں کہیے کہ اس کا بھوت دکھائی دیتا ہے جس کے اردگرد روشنیوں کے بے شمار ہار پڑے ہوئے ہوں، جو نقشی آسمان پر اس طرح معلق رہے ہوں جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے انھیں سہارا دے رکھا ہے۔

مہاراجا خود بھی ایک خاصے مہذب نوجوان ہیں، جس کا خلوص شفاف ہے۔ مجھے وہ انگریزوں کے زیادہ حامی نظر نہیں آئے، انھوں نے میرے ساتھ گفتگو میں انگریزوں کے بارے میں بعض نہایت عقل مندی کی باتیں کیں اور ساتھ ساتھ ان کی پالیسیوں پر کھری کھری تنقید بھی کی۔ لیکن وہ میسور کے یقیناً حامی تھے۔ ان

(۱) ملاحظہ ہو: Mysore Legislative Council Debates، جلد ۲۸، صفحہ نمبر ۲۰۱۱ - جولائی ۱۹۴۳ء۔

کے زیادہ تر وزیر انگلستان کی کابینہ میں بھی اپنا مقام پیدا کر سکتے تھے، لیکن شاید یہ تعریف دو دھاری ہے۔ ان کا انتخاب سوسائٹی کے مختلف طبقوں سے کیا گیا تھا۔ ان میں سے کئی نے میرے سامنے اس عزم کا خاص طور پر اظہار کیا کہ وہ میسور کو کانگریس کے چنگل میں پھنسنے نہیں دیں گے۔

''ہم وکیلوں کا راج ہرگز برداشت نہیں کر سکتے۔'' یہ تھا وہ فقرہ جس سے وہ کانگریس سے اپنی نفرت کا اظہار کرتے تھے۔

میں نے میسور کا نچلا طبقہ بھی دیکھا۔ میں ان کے دیہاتیوں، ان کی بیویوں اور بچوں سے ملا............ ان کے گھروں میں بھی، اور کھیتوں میں بھی۔ میں نے انھیں کام کرتے بھی دیکھا اور کھیلتے ہوئے بھی۔ بلکہ اس وقت بھی جب وہ عبادت کرتے تھے۔ وہاں شہر کے پاس ہی، ایک پہاڑی تھی جس پر ایک مقدس شخص، ایک جوگی تیس سال سے مقیم تھا۔ وہ ایک غار میں، بلکہ ایک چھوٹے سے سوراخ کے اندر رہتا تھا۔ دور دور سے پجاری، اس کا درشن کرنے آتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا تھا لیکن میری موجودگی سے کوئی بھی پریشان نہیں ہوتا تھا، کوئی شخص میری طرف گھورتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ بعض اوقات، رات گئے جب تمام پجاری رخصت ہو جاتے تو میں اس سوراخ میں گھس جاتا تھا اور اس کی نیچی اور اگربتی کے دھوئیں سے کالی چھت کے نیچے اس جوگی کے ساتھ اکیلے بیٹھ جاتا تھا۔ وہ میری نظر سے گزرنے والے خوبصورت ترین بوڑھوں میں سے ایک تھا۔ پتلا دُبلا اور لمبا، بالکل ایل گریکو (El Greeco) کی مانند۔ اور ہمارے درمیان مختلف زبانوں کے امتزاج اور اشاروں کی مدد سے لمبی لمبی گفتگو ہوتی تھی۔ لیکن اس نے کبھی کوئی قابل ذکر بات نہیں کی۔ اس کی باتیں زیادہ تر ایسے جانے پہچانے حقائق پر مبنی ہوتی تھیں، جن کا علم ہر شخص کو پہلے سے ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر، ''جنگ ایک بہت خوفناک بلا ہے'' یا ''انسان ازل سے گنہگار اور بداعمال ہے''۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس کی باتوں سے سروکار نہیں تھا۔ وہ شخص دیکھنے میں اس قدر خوبصورت تھا کہ میرا جی چاہتا تھا کہ وہ کسی عجائب گھر میں رکھا ہو، ایک شیشے کے ڈبے میں، جو پوری طرح روشن ہو، تاکہ انسان اس سے ہر زاویے سے لطف اندوز ہو سکے۔

۳

کانگریس، من حیث الکل، ریاستوں کی مخالف ہے۔ [1] اس کا کہنا ہے کہ یہ ''برطانیہ کی سلطنت

(۱) اس کتاب کے باب نمبر دو میں ہم نے دیکھا ہے کہ گاندھی کانگریس کے اس موقف کے مخالف تھے لیکن انھوں نے مختلف اوقات میں اتنے متضاد بیان دیے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا دشوار نظر آتا ہے کہ وہ واقعی کیا سوچتے ہیں۔

کے ستون ہیں۔ اس نے یہ تاثر عام کر دیا ہے کہ یہ ریاستیں برطانوی ایجاد ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریاستیں اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہیں اور جو شخص بھی انھیں ایسا کہتا ہے، تاریخ کے ابتدائی اُصولوں سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کرتا ہے۔

''اٹھارھویں صدی کے وسط میں، جب مغلوں کی طاقت روبہ زوال تھی، ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے سیاسی امور میں مداخلت شروع کی۔ اس وقت، انھیں ہندوستان کے مختلف حکمرانوں، مثلاً نظام اور مرہٹوں سے مدد مانگنی پڑی، تاکہ انھیں اپنے ساتھ ملا کر، فرانس کی طاقت کو بڑھنے سے روکا جاسکے۔ اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی، ایک سیاسی قوت نہیں بنی تھی اور جن حالات نے کمپنی کو اپنی طاقت بڑھانے میں مدد دی، وہی حالات اُن مقامی سرداروں کو مضبوط کرنے اور آزادانہ بنیادوں پر اپنی حکومت قائم کرنے میں معاون ثابت ہوئے، جو دِلی کے مغل بادشاہوں کے برائے نام وفادار تھے۔ اس طرح ہندوستان کی نسبتاً بڑی ریاستوں کی اکثریت، اگرچہ ہندوستان کی پُرانی بادشاہتوں کی باقیات میں شامل نہیں ہیں، لیکن انھیں برطانوی پالیسی کی پیداوار بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔''[1]

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ کانگریس کی اشتہار بازی کرنے والے، واقعات کو غلط طریقے سے پیش کرنے اور دھوکا دہی میں، اس قدر نیچے نہیں گرے جتنے وہ ریاستوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے گرے ہیں۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے ہزاروں میں سے صرف ایک مثال دینا ہی کافی ہوگا۔ کانگریس کی ان مطبوعات میں جن کی اشاعت دنیا بھر میں کی گئی ہے، ایک کتابچہ "Fifty Facts About India" بھی شامل ہے۔[2] یہ کتابچہ، اسی نام سے شائع ہونے والے ایک کتابچے کے جواب میں تحریر کیا گیا ہے، جو برٹش انفارمیشن سروسز نے امریکہ میں شائع کیا تھا اور اس کا تحتی عنوان ہے ''ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی جہنم''۔ یہ نہایت بے شرمی سے جھوٹ بولنے کی ایسی مثال ہے کہ ڈاکٹر گوئیبلز بھی اس کے برابر تو کجا اس کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ یہ کتابچہ اس قسم کے بیانات سے بھرا ہوا ہے جیسے ''ایک شخص جو ہندوستانی جانتا ہو، ہندوستان میں کہیں بھی چلا جائے، اس کی بات لوگوں کی سمجھ میں آجائے گی۔'' حالانکہ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ ''جاپانی زبان، آئرلینڈ کے باشندوں کو پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔'' لیکن یہاں ہم ریاستوں کے بارے میں ان بیانات کا ذکر کریں گے جو

(۱) ملاحظہ ہو: انڈین سٹیٹ، مصنفہ کے۔ ایم۔ پانیکر، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

(۱) ہمارا ہندوستان پبلی کیشنز، بمبئی۔

اس کتابچے میں درج ہیں۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ میسور، اقتصادی طور پر ہندوستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ علاقہ ہے؛ ٹراونکور، کوچین اور بڑودہ میں شرح خواندگی سب سے زیادہ ہے؛ حیدرآباد تعلیم اور صنعتی پیداوار میں تیزی سے ترقی کر رہا ہے؛ اور بہت سی دوسری ریاستوں میں بھی ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں، جن سے ہندوستان، جس پر کانگریس کا غلبہ ہے، بالکل بے خبر ہے، لیکن اس کتابچے میں ان ریاستوں کی ترقی کو نظرانداز کر دیا گیا ہے اور تمام ریاستوں کو رجعت پسندی اور جاہلیت کا گڑھ قرار دیا ہے۔ جہاں چند بداعمال اور بدکار لوگ اپنی مطلق العنان طاقت کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بعض شہزادے بدکار اور بداعمال ہیں۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ برطانوی حکومت نے ان شہزادوں کی بداعمالی اور نااہلی ثابت ہو جانے پر، انھیں تخت وتاج سے محروم کر دیا ہے، کیونکہ اسے اس کا مکمل اختیار حاصل ہے۔ الور کا شہزادہ بھی ایک ایسا ہی شہزادہ تھا۔ ظلم اور بہیمیت میں اس کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ کیونکہ وہ نیرو (Nero) اور مارکوئس ڈی سیڈ (Marquis de Sade) کو بھی تشدد کرنے کے طریقے سکھا سکتا تھا۔ ایک عورت نے، جو اسے اچھی طرح جانتی تھی، اور اس کی قیمت بھی چکا چکی تھی، مجھے یہ ہولناک کہانی سنائی تھی کہ ایک بار پولو میچ میں شہزادہ کوئی نمایاں کارکردگی نہیں دکھا سکا، تو اس نے اس بات کا انتقام اپنے گھوڑے سے لیا اور اسے مار مار کر ہلاک کر دیا۔'' اور ایک ایسی عفریت کا ذکر "Fifty Facts About India" میں ان الفاظ کے لیے کہا گیا ہے ''الور کے شہزادے کو ایک محب وطن ہندوستانی ہونے کی پاداش میں تخت وتاج سے محروم کر دیا گیا۔''

اس بیان پر کوئی تبصرہ کرنا بھی ناممکن ہے!

۴

جیسا کہ ہم نے پہلے کہا تھا، ہر غیر جانبدار انگریز اس سوال کا دیانت دارانہ جواب چاہتا ہے کہ ''بعض ریاستیں، شرح خواندگی اور صنعتی ترقی میں برطانوی ہندوستان سے اس قدر آگے کیوں نکل گئی ہیں؟''

''اس سوال کا کوئی سکہ بند جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں کانگریس کا جواب ہوتا ہے کہ ریاستوں میں حکومت لاکھ بُری سہی، لیکن برطانوی حکومت سے پھر بھی بہتر ہے، کیونکہ ایک ہندوستانی مطلق العنان بادشاہ، ہر حال میں ایک اچھے انگریز سرکاری ملازم سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ لیکن یہ جواب حقیقت کو مروڑ تروڑ کر بیان کرنے پر مبنی ہے۔ اس بات کا صحیح جواب اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کو پوری طرح بیان کرنے کے لیے ہمیں تاریخ کا بہت لمبا جائزہ لینا پڑے گا۔ عام طور سے ہوتا یہ ہے کہ جب کسی ریاست میں رحم دلانہ مطلق

العنانیت کا دور دورہ ہوتا ہے تو وہاں ترقی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ میسور کو ہی لے لیجیے۔ انگریزوں اور میسور کے درمیان ۱۷۹۹ء میں معاہدہ ہوا تھا اور اس کے بعد سے اس کی ترقی کے اہم ترین برسوں میں وہاں کے حکمران نابالغ بچے تھے اور اس کو حالات کی خوش قسمتی کہیے کہ ان بچوں کے اتالیق نہایت روشن خیال انگریز تھے۔ انھوں نے ان بچوں کی کم عمری کے دوران ریاستی پالیسیوں کو اس طریقے سے ڈھالا کہ وہاں ترقی شروع ہوگئی، یہی نہیں انھوں نے اپنے شاگردوں کے ذہنوں پر اپنے خیالات کی گہری چھاپ لگا دی، جس سے اُن کا اثر زندگی بھر جاری رہا اور جب یہ نام نہاد ''مطلق العنان'' مہاراجا بنے تو انھوں نے مشرقی ظالموں کی طرح نہیں، بلکہ پُرانی طرز کے آزاد خیال لوگوں کی طرح حکومت کی۔

اور یہ بات بھی سنجیدگی سے جائزہ لینے پر غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ میسور کی صنعتی ترقی، برطانوی ہندوستان کی پسماندگی کو اور بھی زیادہ نمایاں کر دیتی ہے۔ اس بات کا انحصار چند خوشگوار قدرتی اتفاقات پر ہے، جن میں سے دو اہم اتفاقات یہ ہیں: اوّل یہ کہ میسور کی معتدل آب وہوا، ہندوستان بھر میں سب سے اچھی ہے اور دوم یہ کہ وہاں پانی کثرت سے موجود ہے، جس کی وجہ سے وہاں بجلی بہت بڑی مقدار میں پیدا کی جا سکتی ہے۔

میسور کے بارے میں اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے، برودا کی ریاست پر بھی بڑی حد تک صادق آتا ہے، جہاں کے آنجہانی گائیواڑ نہایت ذہین شخص تھے، جنھوں نے اپنے طویل دورِ حکومت میں لوگوں کی فلاح و بہبود میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

کانگریس کے پروپیگنڈہ کرنے والے ٹریونکور اور کوچین کی مثالیں اکثر دیتے ہیں کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلے جائیں، تو کیا ہو سکتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی شرح خواندگی، ساڑھے بارہ فی صد سے بڑھ کر ۵۵ فی صد اور ۳۵ فی صد تک پہنچ سکتی ہے۔ ہم تعلیم کے مسئلے پر بعد کے ایک حصے میں بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ ٹریونکور اور کوچین کی تعلیمی ترقی بھی غیر معمولی حالات کا نتیجہ ہے کچھ تو اس لیے کہ ان کی آبادی ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ قدامت پسند ہے اور اس کا بڑا حصہ برہمنوں پر مشتمل ہے اور کچھ اس لیے کہ وہاں تاریخی اتفاقات کی بدولت مشنریوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کی وجہ ٹریونکور اور کوچین شرح خواندگی کے معاملے میں ہمیشہ سے باقی ہندوستان سے آگے رہے ہیں، اُس وقت سے جب ہندوستان تو کیا انگلستان میں بھی کوئی شخص تعلیم کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتا تھا۔

ہندوستان میں شرح خواندگی کے اعداد و شمار سے بہت کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے یا کچھ بھی ثابت نہیں

کیا جا سکتا۔ اس کا انحصار تبصرہ نگار کی جانبداری یا غیر جانبداری پر ہوتا ہے۔ زیادہ لوگ ان کے تاریخی اور جغرافیائی پس منظر کو سمجھے بغیر ہی یہ اعداد و شمار پیش کر دیتے ہیں۔ وہ اڑیسہ کی انتہائی کم شرح خواندگی پر حیران تو ہوتے ہیں لیکن انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اڑیسہ کا بیشتر رقبہ نہایت گھنے جنگلات پر مشتمل ہے اور وہاں زیادہ تر جنگلی لوگ آباد ہیں۔ وہ بمبئی میں جہالت کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں جیسے وہ اعداد و شمار سارے صوبے کے نہیں، صرف بمبئی شہر کے ہیں۔ حالانکہ بمبئی کے صوبے میں ایسے علاقے بھی ہیں جہاں جدید ذرائع مواصلات کے ذریعے پہنچنا ہی مشکل ہے اور وہاں بے شمار قبیلے، رہتے ہیں جو طرح طرح کی زبانیں بولتے ہیں۔

۵

مستقبل میں کیا ہوگا؟

اس سلسلے میں یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یا تو ریاستیں ختم کر دی جائیں گی یا پھر انھیں اپنے اداروں میں معقول حد تک رد و بدل کرنا پڑے گا، تا کہ ان کا وجود محض آرائشی نہ رہے، وہ کچھ کام بھی کر سکیں۔ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کے بعد ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ریاستوں کا خاتمہ ہی بہتر ہوگا، خواہ صرف اقتصادی لحاظ سے سہی۔ وہ تجارت کی آزادانہ ترقی کی راہ میں مصنوعی رکاوٹیں پیدا کرتی ہیں اور ان میں دولت کے بڑے بڑے ذخائر ہیں جسے زیادہ منافع بخش طریقے سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ بات نہایت مضحکہ خیز لگتی ہے کہ نظام حیدرآباد کو، ایک بت کی طرح سونے کے اُس پہاڑ پر بیٹھے رہنے دیا جائے جسے کبھی گردش میں آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس قدر ناقابل یقین دولت کے مالکوں پر بھی دوسرے عام لوگوں کی طرح ٹیکس عائد ہونا چاہیے۔ یہ بات بھی ناقابل تردید ہے کہ بعض چھوٹی ریاستوں میں عوام کے حقوق کو بُری طرح پامال کیا جاتا ہے اور انصاف کو مروڑ تروڑ کر اپنے حق میں کیا جاتا ہے۔ اور ان کی عیاشیوں کا تو ذکر کرنا ہی فضول ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب معاملہ حد سے بڑھ جائے تو انگریز مداخلت کرتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں عام تاثر یہی ہے کہ یہ مداخلت بہت تاخیر کے ساتھ کی جاتی ہے۔ بہت سے حکمرانوں کے اس بھیانک ڈرامے کو، سازشیں اور قتل و غارت شروع ہونے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہیے تھا۔

ریاستوں کے بارے میں برطانیہ کی پالیسی، من حیث الکل، حقیقت پسندانہ ہے۔ ہم نے انھیں بارہا کہا ہے کہ اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں، تو انھیں اپنے اداروں کو جدید رنگ میں رنگنا پڑے گا۔ ہم ان پر اس بات کا دباؤ مسلسل ڈالتے رہتے ہیں کہ وہ اپنے معاہدوں کو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کریں اور کبھی

کبھی ہم اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ لیکن یہ معاہدے موجود ہیں۔ سو برس سے موجود ہیں اور ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان پر دستخط کرنے والوں میں سے بیشتر وفادار اور سلطنت کے سرگرم رعایا میں شمار ہوتے ہیں۔ انھیں خارجہ پالیسی کے سوا ہر حق کی ضمانت دی گئی ہے اور وہ نہایت فخر کے ساتھ اپنے حقوق کی حفاظت کرتے۔ [1] ان معاہدوں کو کاغذ کا پرزہ سمجھ کر پھاڑ پھینکنا، نہ صرف دھوکا دہی ہوگی بلکہ اس سے فسادات اور گڑبڑ کا ایک سلسلہ بھی شروع ہو سکتا ہے۔ بعض حکمرانوں کے پاس تو تربیت یافتہ فوجیں بھی ہیں جو مرتے دم تک ان کا ساتھ دیں گی۔ انگریزوں کی طاقت کے بغیر، جس سے وہ ہر فیصلے کو مسترد کر سکتے ہیں، یا ہندوستان سے ان کے تیزی سے انخلا کی صورت میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ فوجیں کیا کریں اور کس وقت مارچ کرنا شروع کردیں۔ ہندوستان کی تاریخ انگریزوں کی آمد سے قبل صدیوں تک خانہ جنگیوں کا شکار رہ چکی ہے، اور یہ بات فرض کر لینے کا کوئی جواز نہیں ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو پھر نہیں دہرائے گی۔

تاہم حقائق، قیاس آرائیوں کی نسبت بہت اہم ہوتے ہیں اور ہم نے کتاب کے اس حصے میں وہ حقائق جمع کر لیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ریاستوں کی کہانی، اس کہانی سے مختلف ہے جو کانگریس ہمیں باور کرانا چاہتی ہے۔ ہم نے ریاستوں کے سجاوٹی پہلو کو دانستہ نظر انداز کر دیا ہے۔ اگرچہ ایک پُرجوش کانگریسی بھی ان حیرت انگیز دعوتوں، اور ان میلوں کے خاتمے پر افسوس کرتا، جن کا اہتمام ریاستوں کے حکمران اپنی رعایا کے لیے کرتے ہیں اور رعایا بھی اسے اتنا ہی پسند کرتی ہے لیکن ریاستیں سرکس دکھانے کے علاوہ اور بلند تر کام بھی کرتی ہیں۔ لہٰذا لارڈ کرزن نے ان کے بارے میں جو کہا تھا، وہ یاد دلانا بہت ضروری ہے۔ اگرچہ اس وقت سے، جب لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے، اب تک دنیا کافی تبدیل ہو چکی ہے، لیکن ان کی باتوں میں اب بھی اتنا ہی وزن ہے جتنا تب تھا۔ لارڈ کرزن نہ تو بے وقوف تھے نہ ہر خطرے کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے عادی۔ انھیں ہندوستان کا اتنا علم تھا جتنا کسی انگریز کو کیا، کسی ہندوستانی کو بھی نہیں تھا۔ ان کا فیصلہ یہ تھا:

> "ہندوستان کے شہزادے، قدیم اور اشرف نسلوں کے حسن کو فنا ہونے سے بچانے اور ان کی طاقت برقرار رکھنے کا سبب ہیں۔ وہ اپنی ذاتی مثال سے ثابت کرتے ہیں کہ عالی مرتبہ شجرۂ نسب آج بھی عالی ظرفی، دلیرانہ خیالات، عوامی خدمت کے بلند معیار، اور ذاتی خوش خلقی کا باعث ہے۔ ان کے بغیر اگر ہم نے ان اوصاف کو فنا ہونے دیا تو ہندوستان کا معاشرہ اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائے گا جیسے طوفان میں کوئی "کشتی بے بادبان۔"

(۱) جارج پنجم نے نہایت واضح الفاظ میں ریاست کے سربراہوں کے ساتھ برطانیہ کے وعدوں کو دوہرایا ہے کہ "ہم ہندوستان کے شہزادوں کے استحقاق، ان کے حقوق، اور اُن کی شان و شوکت کو برقرار رکھیں گے اور یہ وعدہ نہایت پختہ اور صدقِ دل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

تعلیم

اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور کے لیے کئی جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔ لہٰذا ہم صرف اہم نکات پر بحث کریں گے۔

ہندوستان میں تعلیم کے بارے میں دو مکاتبِ فکر ہیں۔ پہلا یہ کہ تعلیم کو اقتصادیات کا تابع ہونا چاہیے کیونکہ خالی پیٹ بچوں کو تعلیم دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دوسرا مکتبۂ فکر یہ کہتا ہے کہ تعلیم کو دوسرے تمام امور پر فوقیت حاصل ہونی چاہیے، کیونکہ جب تک ہم کسان میں ذہانت کا معیار بلند نہیں کریں گے، اس وقت تک اسے ایسی باتیں نہیں بتا سکتے جو معیارِ زندگی کی بلندی کا سبب بن سکیں۔ درحقیقت یہ ایک ہی مسئلے کے دو پہلو ہیں، جنھیں الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بحث کہ ان میں سے کسے فوقیت دی جائے، بالکل اسی طرح غیر منافع بخش اور فضول ہوگی جیسے انڈے اور مرغی کی بحث۔ تعلیم کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور پیسہ حاصل کرنے کے لیے پہلے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے۔ یہ ایک ایسی سچی بات ہے جس کا اطلاق انفرادی طور پر ہی نہیں قوموں کی سطح پر بھی ہوتا ہے۔

ہندوستان جیسے ملک میں، تعلیم کی سطح کو ایک اعتدال پسندانہ اور قابلِ قبول حد تک بلند کرنے کے لیے کتنی عظیم رقم درکار ہوگی، اس کا اندازہ بہت کم لوگوں کو ہے۔ دنیا کی آبادی کے پانچویں حصے کو خواندہ بنانا کوئی جھوٹی بات نہیں ہے۔ اس میں سے ۸۹ فی صد لوگ، یعنی ۳۴ کروڑ، جو امریکہ کی آبادی سے دوگنا ہے، دیہات میں رہتے ہیں اور ہر گاؤں کے لیے کم از کم ایک اُستاد کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ایک گاؤں کی آبادی اوسطاً ۵۰۰ رکھی جائے تو ہمیں ۳۵ لاکھ اساتذہ درکار ہوں گے۔ یہ اعداد و شمار اس قدر دیو قامت ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ عام قاری کے سر پر سے گزر جائیں گے۔ لہٰذا ہم انھیں ایک اشتہار کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

اسامیاں خالی ہیں

ضرورت ہے ۳۵ لاکھ اساتذہ کی جو دنیا سے کٹے ہوئے علاقوں میں تنہا رہ سکیں۔ تنخواہ ۶۰ روپے ماہوار۔

۶۰ روپے ماہوار، یعنی تقریباً ۲۵ شلنگ یا ۶ ڈالر فی ہفتہ۔ یہ تنخواہ ہندوستان میں عیش کرنے کے لیے نہ سہی، زندہ رہنے کے لیے کافی ہے۔ اگر ہم سکول اساتذہ کی اس فوج کو ۶۰ روپے ماہوار ادا کریں تو ابتدائی اخراجات ۲۱ کروڑ پونڈ ہوں گے۔ یہ رقم نہ صرف ہندوستان میں خرچ کی جانے والی رقم سے دس گنا بڑی ہے، بلکہ ہندوستان کے کل محاصل سے بھی زیادہ ہے۔[1] اور یہ صرف اساتذہ کی تنخواہوں کی رقم ہے۔ سکولوں کے لیے عمارتوں کی تعمیر، اور انھیں ساز و سامان سے لیس کرنے پر جو کثیر رقم خرچ کرنی پڑے گی، وہ اس کے علاوہ ہوگی۔

اور اگر ہمارے پاس سکول اساتذہ کو ادا کرنے کے لیے یہ رقم ہو بھی اور ہم کسی طرح مالی شعبدہ بازی کر کے یہ عظیم رقم حاصل کر بھی سکیں (اگرچہ کس طرح اتنی بڑی رقم حاصل کر سکیں گے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا) تو اتنی ساری خواتین کہاں سے لائیں گے؟ ہم صرف ایک چٹکی بجا کر تو اتنے سارے لوگوں کا انتظام نہیں کر سکتے، جو پنسل، ربڑ اور رولر ہاتھ میں لیے ملازمت کرنے کو تیار ہوں۔ اس وقت جیسے حالات ہیں، ان میں اس تعداد کا پچاسواں حصہ حاصل کرنا بھی نہایت رجائیت پسندی کا مظاہرہ کرنے کے مترادف ہوگا اور اگر ہم یہ پچاسواں حصہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی جائیں، تو بھی اُن علاقوں تک پہنچنے اور ان علاقوں میں خود کو محفوظ رکھنے کے لیے، ان خواتین کو بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ صرف پنسل اور رولر ان کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ مفصل[2] کے علاقے، ان خواتین کے لیے جنھیں تحفظ حاصل نہ ہو، تفریحی مقامات کا درجہ نہیں رکھتے۔ وہ مڈل ویسٹ یا انگلینڈ کی کاؤنٹیز سے بہت مختلف ہیں۔ لہٰذا اپنے سکول کی اُستاد کی حفاظت کرنے پر ہمیں اس کی تنخواہ سے زیادہ رقم خرچ کرنی پڑے گی۔ سکول اساتذہ کا پیشہ، نرسنگ کی طرح ہندوستان میں عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس پر کردار کے خراب ہونے کی مہر ثبت ہوتی ہے۔[3]

---

(۱) دراصل سارجنٹ سکیم کے تحت، جو شاید جنگ کے بعد ہندوستان میں تعلیم کے لیے بنیاد بنائی جائے گی، سالانہ اخراجات کا تخمینہ ۳۱۳ کروڑ روپے یا ۲۳ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ لگایا گیا ہے اور اس میں بھی زیادہ سے زیادہ ۱۴ سال سے کم عمر بچوں کو ہی تعلیم دی جا سکے گی۔ یہ عظیم سالانہ خرچ، ابتدائی طور پر نسبتاً اعتدال پسندانہ ہوگا اور تقریباً ۵۰ برس گزرنے پر ۲۳ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ کی حد تک پہنچے گا۔

(۲) ہندوستانی صوبوں کے اندرونی حصے۔ یہ لفظ قصبوں کے مقابلے میں دیہی علاقوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

(۳) ایک انگریز یا امریکی کے لیے یہ بات سمجھنی مشکل ہے کہ ہندوستان میں ہر اس عورت کو جو بچے پیدا کرنے اور کھانا پکانے کے علاوہ کوئی کام کرتی ہے، کیوں ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر بنگال میں اگر کسی لڑکی کی آواز سریلی ہو، یا وہ گیت پسند کرتی ہو تو چند برس پہلے تک اس کی شادی کے معاملے میں اس کے والدین کو نہایت دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر دھورجاتی مکرجی کی "ماڈرن انڈین کلچر" صفحہ ۱۹۱۔

لہٰذا ہمارے لیے صرف اتنی بڑی تعداد میں پیسہ حاصل کرنے اور ان خواتین کو تلاش کرنے جنھیں ہم وہ پیسہ دیں گے، ایک اور مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا ہے اور وہ ہے ہندوستان کے سارے مردوں، ہندو اور مسلم کی ذہنیت میں ایسا انقلاب لانا کہ سکول اساتذہ کے ساتھ ان کا رویہ تبدیل ہو جائے۔

یہ مسائل حل کرنا اتنا آسان کام نہیں ہے جتنا مفروضوں پر یقین رکھنے والے ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ "یہ مسئلہ حل کرنا اتنا مشکل نہیں ہے۔ ہم اس تمام مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے مردوں کو سکول کے اُستاد بنا سکتے ہیں۔" لیکن اس کا جواب ہے قطعاً نہیں۔ فرض کیجیے کہ ہمیں ایک بٹا پچاس عورتوں کی جگہ ایک بٹا چالیس مرد سکول اساتذہ مل جائیں، جن کو اپنی عزت بچانے کے لیے کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تب بھی پیسے کا مسئلہ تو باقی رہے گا اور پھر ان نوجوانوں کو دیہات میں جانے پر راغب کرنے کا مسئلہ بھی ہے، کیونکہ ہندوستان میں اصل مسئلہ ہی دیہاتیوں کو خواندہ بنانے کا ہے اور اس کا مطلب ہے تنہائی، دوسروں سے کٹ کر زندگی بسر کرنا اور شہر سے مشابہ ہر علاقے کو لمبے عرصے کے لیے خیر باد کہہ دینا۔ اس کا مطلب ہے ناہموار راستوں پر میلوں پیدل چل کر اس جگہ تک پہنچنا جہاں سے بس ہفتے میں صرف دو بار گزرتی ہے اور جہاں اس بس کا سفر ختم ہوتا ہے وہاں بھی ایک دیہات ہوتا ہے، صرف اس سے ذرا بڑا اور قدرے کم گندا جسے ہم پیچھے چھوڑ کر آ رہے ہیں۔

کانگریس کے پروپیگنڈا کرنے والے اس بات کے جواب میں یہ کہیں گے کہ جونہی انگریز ہندوستان سے جائیں گے، ہمارے نوجوان شہروں کو خیر باد کہہ کر جنگلوں میں گھس جائیں گے اور شہروں کی چمک دمک کو بھول جائیں گے۔ اس پروپیگنڈے کے جواب میں ہم صرف "واقعی" ہی! کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ بات بدقسمتی سے جدید ہندوستان میں دنیا کے دوسرے ممالک کی نسبت بہت نمایاں ہے کہ اگر کسی نوجوان کو ایک بار گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کا موقع مل جائے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت واپس گاؤں جانے پر مائل نہیں کر سکتی۔ وہ شہر میں بھوکے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں اور بسا اوقات بھوکے رہتے بھی ہیں۔

ہمارے یہ بکھرے بکھرے نوٹ انتہائی منفی انداز کے ہیں، کیونکہ ان کا مقصد ان فضول باتوں کی تصحیح کرنا ہے، جو انگلینڈ میں اور خصوصاً ان نوجوان سکول اساتذہ میں ہوتی ہیں، جو شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سری نگر سے ٹرچنوپولی (Trichinopoly) تک صرف ایک پینی (Penny) ادا کر کے بس میں سفر کیا جا سکتا ہے۔ ان کو نہ ہندوستان کے رقبے کا علم ہے نہ ذرائع آمد و رفت کی خستہ حالی کا پتہ ہے۔

اس مسئلے کے مثبت حل کے بارے میں بھی جلدیں کی جلدیں لکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن میں صرف اپنی ذاتی رائے پر اکتفا کروں گا جو مختصراً یہ ہے کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہمیں انقلابی طریقے استعمال کرنے پڑیں گے۔ جن میں ریڈیو اور سینما کا بہت دخل شامل ہوگا۔ دراصل وہ سکول اساتذہ کی جگہ لے لیں گے۔ یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ طریقے وقتی طور پر استعمال کیے جائیں گے کیونکہ مشین کبھی ایک سکول ٹیچر کی جگہ مستقل طور پر غصب نہیں کرسکتی۔ لیکن ہندوستانی عوام کے ذہنوں پر صدیوں سے جہالت کی جو تہ جمی ہوئی ہے اس کو کھرچنے کا کام تو کرسکتی ہے۔

زبانیں

ایک کانگریسی کو، جو "ایک ہندوستان" کے خبط میں مبتلا ہے، کوئی بات اس سے زیادہ پریشان نہیں کرتی جتنا یہ سادہ سا واقعہ کہ ہندوستان میں ۲۲۵ مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔

ہم اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ یہ واقعہ گمراہ کن ہے، لیکن اس کے لیے جو جواب انھوں نے تراشا ہے، وہ اس سے بھی زیادہ گمراہ کن ہے، مثال کے طور پر ان کا یہ کہنا کہ "ہندوستانی بولنے والا شخص، ہندوستان کے کسی گوشے میں بھی چلا جائے، اپنی بات سمجھا سکتا ہے۔" اس بات کا امکان تو ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے، اپنی جیبوں میں رکھی چیزوں سے اپنا مطلب ظاہر کردے لیکن زبان سے سمجھانا مشکل ہے (اسے تو صرف باہر نکال کر دکھایا جاسکتا ہے)۔

ہندوستان میں ۲۲۵ زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن ان میں سے بہت سی مقامی اور غیر اہم ہیں۔ مثال کے طور پر قبائلی بولیاں، جو تبت اور چینی نسل کے مخلوط لوگ بولتے ہیں لیکن ایسے لوگ صرف ہندوستان کے شمال مشرقی علاقوں میں رہتے ہیں۔ عملی طور پر ہندوستان میں زبانوں کی تعداد ۱۵ ہے۔ اس تعداد میں کانگریس کے ارکان اپنی کوششوں کے باوجود کمی نہیں کرسکتے۔

ان میں سب سے اہم زبان ہے:

اُردو ⎤
⎬ جو ۱۵ کروڑ لوگ بولتے ہیں۔
ہندی ⎦

ہم نے انھیں ایک ساتھ بریکٹ میں درج کیا ہے، جس کی وجہ آگے بیان کی جائے گی۔

اس کے بعد بنگالی زبان ہے۔ یہ بالکل علیحدہ زبان ہے اور ساڑھے پانچ کروڑ افراد بولتے ہیں۔

اس کے بعد جنوب میں بولی جانے والی زبانیں تامل، تلگو، کناڑا اور ملایالم ہیں۔ یہ بھی علیحدہ علیحدہ زبانیں ہیں اگرچہ ان میں کبھی کبھی ہلکی سی مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ یہ بھی ساڑھے پانچ کروڑ لوگوں کی زبانیں ہیں۔

دو اور اہم زبانیں مرہٹی (جسے دو کروڑ لوگ بولتے ہیں) اور گجراتی (جو ایک کروڑ پچاس لاکھ افراد کی زبان ہے) ہیں۔

ان زبانوں میں سے اُردو اور ہندی سب سے زیادہ اہم ہیں، کیونکہ یہ زبانیں بولنے والے دوسروں سے تین گنا زیادہ ہیں۔ یہ زبانیں ایک نہیں، کیونکہ اُردو میں عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت ہے لیکن ایک دوسرے سے کافی حد تک مشابہ ہیں اور انھیں بولنے والے ایک دوسرے کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ گاندھی کی کوشش ہے کہ ان دونوں زبانوں کو "ہندوستانی" کا نام دے کر یکجا کردیا جائے اور باقی ۲۰ کروڑ لوگوں پر بھی یہ زبان مسلط کردی جائے۔ لیکن انھیں ابتدا ہی سے ایک سنگین دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور یہ دشواری معمول کے مطابق مذہبی دشواری ہے۔ یہ دونوں زبانیں بولنے میں ایک جیسی ہیں، لیکن ان کے رسم الخط جداگانہ ہیں۔ ہندی سنسکرت سے نکلی ہے اور ناگری رسم الخط میں بائیں سے دائیں جانب لکھی جاتی ہے جبکہ اُردو جو فارسی سے نکلی ہے، فارسی رسم الخط میں دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی انجیل یعنی "قرآن شریف" بھی فارسی رسم الخط میں لکھا ہوا ہے اور اس لیے مسلمان، اس رسم الخط کو تبدیل کرنے یا اُن کی زبان کو ہندوستان کے رنگ میں رنگنے پر شدید غم وغصہ کا اظہار کرتے ہیں۔

کانگریس قدرتی طور پر اس سنگین اختلاف کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ ان کے پروپیگنڈے کے ماہر، ان اختلافات کو انگریزوں کی ایجاد قرار دیتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں بابل کے بُرج (Indian Tower of Babel) کو "ہم آہنگی کے مندر" کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی بلی تھیلے سے باہر آجاتی ہے۔ .... عام طور سے مستقل مزاج مسلمانوں کی جانب سے ہندوؤں میں "جذب" ہو جانے سے انکار پر شدید غصہ کی بنا پر۔ اس بارے میں مسلمانوں کے عزمِ صمیم کو کہ وہ اُردو کو ایک علیحدہ زبان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں، محض ہندی کی ایک آوازِ بازگشت کے طور پر نہیں، نامور ہندو سکالر پروفیسر امرناتھ جھا نے بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔ انھوں نے دی لیڈر (The Leader) الہٰ آباد میں ایک حالیہ

مضمون میں" ہندوستانی کا بلبلہ (The Bubble of Hindustani) میں لکھا ہے:

"آپ بے راست بازی سے کام لیتے ہیں۔ آپ ہندو طلبہ کے کسی بھی ہاسٹل میں چلے جائیں، وہاں آپ کو ریڈنگ روم میں اُردو کا کوئی نہ کوئی رسالہ ضرور نظر آ جائے گا۔ مسلمانوں کے ہاسٹل میں ہندی کا رسالہ غلطی سے بھی نہیں ملے گا۔ یونیورسٹی کے امتحانات میں آپ کو ایسے ہندو نظر آ جائیں گے جو اُردو کے طالب علم ہوں۔ لیکن ہندی...... یا اگر کوئی معجزہ رونما ہو جائے تو سنسکرت کا ایک طالب علم بھی مسلمانوں میں نہیں ملے گا۔ مجھے اس طرح کی بات کرنے پر افسوس ہے، لیکن جب تک ہمارے مسلمان دوست ہندی سے نفرت کم نہیں کرتے، ہمیں ان کے ساتھ اتحاد کا خیال ترک کر دینا چاہیے۔"

گاندھی ہمیں یہ یقین کرنے پر مجبور کریں گے کہ انگریزوں کے ہندوستان سے جاتے ہی، یہ اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ بالکل ایسے ہی جیسے دھوپ نکلتے ہی دھند غائب ہو جاتی ہے۔ ہندو مسلمانوں کو اُردو میں، جس سے وہ نفرت کرتے ہیں، محبت نامے لکھیں گے اور مسلمان ہندوؤں کو سنسکرت میں جسے وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، محبت بھرے خط لکھیں گے۔ لیکن مجھے زبان کے مسئلے پر گاندھی کے حقیقی خیالات معلوم نہیں، اس کتاب کے ہر صفحے کو پڑھنے کے بعد بھی جو انھوں نے اس موضوع پر لکھی ہے۔[1]

اگر آپ ہندی اور اُردو کو ہندوستانی کا ایک مشترکہ نام دے بھی دیں (جس کے امکانات ۱۰ میں سے ایک بھی نہیں) اور اگر آپ ان کے لیے ایک مشترکہ رسم الخط تلاش کر بھی لیں (جس کا امکان ۱۰۰۰ میں سے ایک بھی نہیں) تب بھی باقی ہندوستان کا کیا ہوگا؟ آپ اچانک ایک زبان بولنے والے اتنے بڑے گروپ کو (جس کی تعداد فرانس کی کل آبادی سے زیادہ ہے) یہ حکم نہیں دے سکتے کہ وہ دوبارہ سکول جائیں، اپنے لٹریچر کو قربان کر دیں۔ اور اپنی ذہنی زندگی کی از سرِ نو ابتدا کریں۔ آپ ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ انھیں دو زبانیں سیکھنی پڑیں گی۔ آپ کو کہنا پڑے گا کہ "ہمیں تین زبانیں سیکھنی پڑھیں گی۔ کیونکہ انگریزی پہلے ہی سے حکومت اور تجارت سے متعلق امور میں ایک لازمی ثانوی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ تاریخ اس بات کی

---

(۱) جو طالب علم گاندھی کے ذہنی جھگڑوں کے بارے میں دلچسپی رکھتے ہوں، کتاب "Our Language Problem"، مصنفہ مہاتما گاندھی (ہنگو رانی کراچی) پڑھ لیں۔ ایک اور کانگریسی کتاب جو اس مسئلے پر بڑے دلچسپ انداز سے بحث کرتی ہے "National Language of India" (کتابستان الٰہ آباد)۔

شاہد ہے اور کانگریس بھی اس کا اعتراف کرتی ہے، خواہ دانت پیس کر ہی۔

اور اس طرح یہ مسئلہ باقی ہے اور اس وقت تک باقی رہے گا، جب تک کہ جدید دنیا، کسی معجزے سے تبدیل نہیں ہو جاتی اور وہ معجزہ بھی اتنا بڑا ہونا چاہیے جو مسٹر ایچ جی ویلز کو بھی دہلا کر رکھ دے۔ دریں اثنا سب سے اہم بات یہ ہے کہ کانگریس کا یہ کہنا کہ ہندوستانی بولنے والا شخص، ہندوستان میں ہر جگہ سمجھا جا سکتا ہے، ایک کھلا جھوٹ ہے۔ ملک کے وسیع علاقوں میں وہ کسی سے راستہ بھی نہیں پوچھ سکتا یا چائے کا ایک کپ بھی نہیں مانگ سکتا، پیچیدہ خیالات کو بیان کرنا تو دور کی بات ہے، مثلاً "مجھے اس مالی کی چٹھی کی پنسل دے دو" شاید یہی بہتر ہے کیونکہ اگر ان کو پنسل مل جائے گی تو وہ اس سے مزید فضول باتیں ہی لکھیں گے۔

صنعت اور زراعت

اس قدر طویل موضوع کو ایک فٹ نوٹ میں بیان کرنا، یقیناً ایک مضحکہ خیز کوشش ہوگی۔ یہ چند پیراگراف ایسا کرنے کی کوشش نہیں ہیں، بلکہ دلچسپی رکھنے والے طالب علموں کو یہ بتانے کی کوشش ہیں کہ اگر وہ ان خطوط پر کام کریں تو اپنی تحقیق کو منافع بخش طریقے سے آگے بڑھا سکتے ہیں۔

برطانیہ کی صنعتی اور زرعی پالیسی ہمیشہ سے ہندوستان میں اس کے ریکارڈ پر کلنک کے ٹیکے کی مانند رہی ہے۔ اس کے بارے میں کانگریس کے اعتراضات درست ہیں۔ یہ بات درست ہو سکتی ہے کہ کوئی اور سامراجی طاقت اس سے بھی برے انداز میں کام کرتی: یہ کہنا بھی ٹھیک ہے کہ ہم نے ہندوستانیوں کا جو ظالمانہ استحصال کیا ہے، اس میں کہیں کہیں رحم دلی کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور یہ بات بھی سچ ہے کہ ہماری نااہلی کی وجہ اصل حالات سے ہماری ناواقفیت تھی، بغض و عناد نہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم نے ہندوستانیوں کا بڑے پیمانے پر استحصال کیا ہے اور ہماری نااہلی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

مثال کے طور پر یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ دہلی میں، زمینوں کے محکمے کو محکمۂ صحت اور محکمۂ تعلیم کے ساتھ ایک چھوٹے سے دفتر تک محدود کر دیا گیا ہے، حالانکہ ہندوستان جیسے زرعی ملک میں زمینوں کے محکمے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ جنگلات اور آبپاشی جیسے بنیادی مسئلوں سے ضمناً اس کے فرائض میں شامل ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جس طرح محکمۂ اطلاعات کا سربراہ کسی چپڑاسی کو بنا دیا جائے (اگرچہ بعض چپڑاسی، اطلاعات کے کچھ وزیروں سے بہتر کام کرتے نظر آئیں گے)۔ اسی طرح یہ بات بھی مجھ سے

بالاتر ہے کہ جنگ کے پانچویں سال میں بھی، ہندوستان بھر میں ایک فیکٹری بھی اس قابل نہیں ہے کہ وہ چند ایک پرانی جنگی مشینوں کے دو ایک فاضل پرزوں کے سوا، کوئی اور چیز بنا سکے۔ حالانکہ ان پانچ برسوں میں ہم نے ہندوستان کو ''جمہوریت کا اسلحہ خانہ'' قرار دینے اور اس کی ترقی کے قصیدے لکھنے میں روشنائی کے دریا استعمال کر لیے ہیں۔ جب کانگریس کہتی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کو دیدہ و دانستہ صنعتی طور پر پسماندہ رکھا ہے تو وہ درست ہی کہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چند صنعتوں کو مثال کے طور پر سوتی کپڑے، فولاد سازی، سیمنٹ اور کاغذ تیار کرنے کی صنعتوں نے گزشتہ بیس برس کے دوران تیزی سے ترقی کی ہے، لیکن تمام بھاری صنعتیں، موٹر سازی، جہاز سازی، ریل کے انجن تیار کرنے، اسلحہ تیار کرنے اور کیمیکلز (Chemicals) کی صنعتیں بدستور تعطل کا شکار ہیں۔ ہندوستان میں کیمیکلز تیار کرنے کی تمام صنعتیں، جیسے مورار جی سکیم، انگریزوں نے حکومت کے ساتھ مل کر تباہ کر دیں۔ ہندوستان میں ماچس سازی کی صنعت کو جو ابھی طفولیت کے ایام میں تھی، ظاہر میں سویڈن کی، لیکن حقیقت میں برطانوی ماچس سازی کی صنعت کے حق میں ختم کر دیا گیا۔ سیمنٹ اور موٹر سازی کی صنعتوں میں یہی کہانی دہرائی گئی۔ موٹر سازی کی صنعت کے سلسلے میں تو برطانیہ اور امریکہ کے درمیان کچھ کھٹ پٹ بھی ہوئی کیونکہ برطانیہ، امریکی فرموں کو ہندوستان میں اپنے دفاتر قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

برطانوی پالیسی کا جواز پیش کرنے والے ''ایک نئی روح'' کی باتیں کرتے ہیں اور یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ ہندوستان صنعت کے معاملے میں تیز قدموں سے ترقی کی جانب رواں دواں ہے۔ اعداد و شمار پیش کرتے ہیں لیکن یہ ''تیز قدم'' محض ایک واہمہ، اور ''نئی روح'' محض آنکھوں کا دھوکا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اخبارات میں بیون بوائز (Bevin Boys) کو بہت زیادہ شہرت دی جا رہی ہے۔ یہ ان نوجوانوں کے گروہ ہیں جنھیں حکومت انگلستان کے صنعتی طریقے سیکھنے کے لیے برطانیہ بھیجتی ہے۔ ان لڑکوں کا پہلا دستہ ۱۹۴۱ء کے اوائل میں انگلستان گیا تھا) یہ بات بہت خوش آئند سنائی دیتی ہے اور اصولاً ہے بھی۔ لیکن اس طرح کتنے لڑکے بھیجے جا رہے ہیں۔ تین ماہ میں اوسطاً پچاس۔ اگر جنگ ۱۹۴۶ء تک بھی جاری رہے، اور لڑکوں کی روانگی میں بھی کوئی رکاوٹ نہ پڑے تو بھی ان کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز نہیں کرے گی۔ چالیس کروڑ کی آبادی میں سے پورے ایک ہزار۔ اگر یہی وہ ''نئی روح'' ہے تو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ہم بادل نخواستہ اس سلسلے میں کانگریس کی شکایت کو مبنی بر انصاف تصور کرنے پر مجبور ہیں، کہ دنیا کی صنعتی طور پر سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوم کے ایک سو پچاس سالہ دور حکومت کے بعد بھی صرف چار اعشاریہ چار فی صد ہندوستانی باشندے

صنعتوں میں ملازم ہیں۔[1]

اور اب ہم ہندوستان کے بہت اہم اقتصادی مسئلے، یعنی ہندوستان میں زراعت کی حالت، کی طرف آتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ دس میں سے نو ہندوستانی قطعاً دیہاتی زندگی بسر کرتے ہیں اور ان میں آٹھ زراعت میں مصروف ہیں۔ ہندوستان خواہ کتنی بھی تیزی سے صنعتی ترقی کرے، وہ آئندہ ایک طویل عرصے تک ایک زرعی ملک ہی شمار کیا جائے گا اور وہاں ترقی کی ہر سکیم کا آغاز اراضی کو ترقی دینے سے ہونا چاہیے۔

آپ کو کسانوں کے لیے منصوبہ بندی کرنی پڑے گی، کیونکہ جب تک کسان کی قوت خرید میں اضافہ نہیں کیا جاتا باقی تمام باتیں ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے مترادف ہیں۔

لیکن ہندوستان کے زیادہ منصوبہ ساز، خاص طور پر انگریز، ہوائی قلعے تعمیر کرنے میں مصروف ہیں، اور نہایت تیزی سے تعمیر کر رہے ہیں، کیونکہ وہ حسب سابق خود کو حقائق سے آگاہ کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ واقعات کا ہندوستان، خیالات کے ہندوستان کے بالکل برعکس ہے، کم از کم زیادہ لوگوں کے خیالات کے اور ان میں ملٹن (Milton) بھی شامل ہیں جنھوں نے "The Wealth of Ormus and of Ind" لکھی تھی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں اراضی کی کمی نہیں ہے: جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں بہت گنجان آبادی ہے اور انسانوں کے پاس رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان قدرتی وسائل کی کبھی ختم نہ ہونے والی دولت سے مالا مال ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا تہائی حصہ بالکل بے کار اور بنجر زمینوں پر مشتمل ہے اور وہاں بہت سی ضروری چیزوں کا فقدان ہے، مثلاً کوئلے کا۔[2] یہ زمین، جو لوگوں کے تصورات میں سونا اگلتی

---

(۱) تاہم برطانیہ کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ہندوستانی سرمایہ کار، خود اپنے ملک میں سرمایہ کاری کرنے سے مسلسل گریز کرتے چلے آئے ہیں، خاص طور پر ایسے معاملات میں جن میں نقصان کا اندیشہ ہو۔ اس سلسلے میں ریلوے کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ ہندوستانیوں سے ریلوے کے لیے سرمایہ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن اس کے باوجود انگلستان کو ۹۲ فی صد خود فراہم کرنا پڑا۔ آج کل ہر چیز کو ہندوستانیت کا رنگ دینے کی پالیسی کے تحت،، یہ لازم کر دیا گیا ہے کہ ہر نئی کمپنی میں کم سے کم ۱۰ فی صد ہندوستانی سرمایہ ہونا ضروری ہے۔ اگر انگریز سرمایہ کاری سے ہندوستانیوں کے گریز کے باعث، باقی سرمایہ لگا دیں اور کمپنی اتفاق سے کامیاب ثابت ہو جائے تو تمام ہندوستانی سرمایہ دار ''برطانوی استحصال'' کے خلاف زوردار احتجاج شروع کر دیتے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے سرمایہ لگانے کا موقع خود کھو دیا تھا۔

(۱) اگرچہ ہندوستان میں کوئلے کے ذخائر کے بارے میں بہت بلند بانگ دعوے کیے جا رہے ہیں لیکن ہندوستان میں انگلستان کی نسبت دس فی صد کوئلہ بھی نہیں نکالا جا سکا اور جو نکالا گیا ہے وہ بھی معیار میں بہت کم ہے۔

ہے، دراصل اس کی قیمت، اوسطاً ۵۱ روپے فی ایکڑ ہے، جو انگلستان کی زمینوں کے بھاؤ کا ایک چوتھائی اور جاپان کا ایک تہائی ہے۔

اس بات میں کس کا قصور ہے؟

یقیناً اس بات میں برطانیہ کا سارا قصور نہیں ہے۔ لیکن اسی طرح ہندوستان کا بھی سارا قصور نہیں ہے۔

ہندوستانی زراعت کاروں کی بڑی تعداد، ابھی تک قرون وسطیٰ میں زندگی گزار رہی ہے۔ وہ ان سادہ اُصولوں سے بھی قطعاً ناواقف ہیں جو زیادہ تر ممالک میں کاشتکاروں کی فطرت ثانیہ بن چکے ہیں۔ ان کے آلات نہایت قدیم اور پُرانے زمانے کے ہوتے ہیں، وہ زمین پر مختلف فصلیں کاشت کرنے کے اُصول سے قطعاً ناواقف ہیں اور زمین کی اہم ترین ضرورت، یعنی کھاد کو قرار واقعی دھوئیں میں اُڑا دیتے ہیں۔ گائے کے گوبر کو جو قدرتی کھاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا ہے، یہ لوگ اس کے اُپلے تھاپ کر ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ زمین ہر روز بے کار سے بے کار تر ہوتی جا رہی ہے۔

ہمیں یہ بات قبول کر لینی چاہیے کہ یہ صورت حال انگریزوں کے لیے شرم کا باعث ہے۔ یہ کام کس قدر بھی بڑا کیوں نہ ہو، اس کی راہ میں کتنی ہی مذہبی اور فرقہ وارانہ مشکلات کیوں نہ حائل ہوں، کسان کی پیدائشی قدامت پسندی اور حال ہی میں قوم پرستوں کی جانب سے اصلاحات کی مخالفت کے باوجود، ہمیں کسی نہ کسی طرح ان مشکلات پر قابو پانا چاہیے تھا اور اگر قابو نہ بھی پا سکتے تو کم از کم قابو پانے کی پُرعزم کوششیں تو کرنی چاہئیں تھیں۔ ہمیں سالہا سال قبل اپنے آپ سے کہنا چاہیے تھا کہ ہمیں بڑے پیمانے پر افلاس کا سامنا ہے اور یہ افلاس زیادہ تر زرعی طریقوں کے استعمال میں نااہلی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ہمیں اس نااہلی کا مقابلہ اپنی پوری قوت کے ساتھ کرنا چاہیے۔" ہمیں کھاد کے اس اہم مسئلے کو حل کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں کسان کو گوبر کے علاوہ کوئی اور ایندھن فراہم کرنا چاہیے تھا (جس کا مطلب بڑے پیمانے پر شجرکاری کرنا تھا) یا پھر کسان کو کوئی دوسری کھاد فراہم کرنی چاہیے تھی۔ لیکن اس کے برعکس ہم نے یہ کھادیں بڑی مقدار میں برآمد کیں، خاص طور پر مونگ پھلی کی کھل اور جانوروں کی ہڈیاں۔

مجھے اعتراف ہے کہ ہم نے بعض باتوں میں خود کو اپنی عظیم روایات کا اہل ثابت بھی کیا ہے۔ اس کی بہترین مثال آبپاشی کا نظام ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مہینوں بارش کا ایک قطرہ بھی نہیں پڑتا یہ مسئلہ

بہت اہم ہے۔ انگریزوں نے ہندوستان کو دنیا میں سب سے بڑا نہری نظام دیا، جس سے تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ ایکڑ اراضی زیر کاشت لائی جا سکی۔

لیکن ہماری اس کامیابی نے دوسرے شعبوں میں ہماری ناکامیوں کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ اگر ہم اس مسئلے کو دوسرے زاویے سے دیکھیں تو ہم نے ان معاشرتی برائیوں کو روکنے کی کبھی سنجیدگی سے کوشش نہیں کی، جو ہندوستان میں زرعی نظام کو اس طرح تباہ کر رہی ہیں جس طرح جڑی بوٹیاں فصلوں کو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم قانون سازی کے ذریعے زمینوں کو زرخیز نہیں بنا سکتے اور نہ قلم کے زور سے فصلیں اُگا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے پاس اتنی طاقت ہو (جو ہمارے پاس ہے) تو ہم کوئی قانون تو منظور کر سکتے ہیں، جس سے وہ بیڑیاں کٹ جائیں جو کاشتکاروں کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ سوچنا لایعنی ہے کہ یہ بیڑیاں ہندوستان کی اپنی تیار کردہ ہیں، یا ان کو کاٹنے کی کوشش پر احتجاج اور ہنگامے شروع ہو جائیں گے۔ ایک حکمران کا کام حکومت کرنا ہے اور اس سلسلے میں ہم اپنا کام کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

مثال کے طور پر وہ بدترین کیڑا جو ہندوستانی مزارع کی فصلیں تباہ کر دیتا ہے جو اس کی اراضی میں زہر گھول دیتا ہے اور سال بہ سال اس کی ان کوششوں کو ناکام بنا دیتا ہے، جو وہ غلامی کے درجے سے چند انچ اونچا اُٹھنے کے لیے کرتا ہے، بنیا کہلاتا ہے۔ بنیا یا ہندو سود خور وہ کیڑا ہے کہ خون چوسنے میں اس کا جواب ملنا مشکل ہے۔ وہ آپ کو ہر گاؤں میں نظر آتا ہے۔ ان لوگوں سے گوشت کے پاؤنڈ مانگتا ہوا، جو پہلے ہی اتنے دبلے ہو چکے ہیں کہ اسے ایک اونس گوشت بھی نہیں دے سکتے۔ یہ سود خور ہندوستان میں زمین کا اصل مالک شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ کئی نسلوں کے قرض نے مزارعہ کو اتنا غریب کر دیا ہے کہ وہ اپنے سارے خاندان کی کمائی سے بھی، اُس قرض کا صرف سود ہی ادا کر سکتا ہے، جو اس قدر قدیم ہے کہ تاریخ کی دھند نے اسے لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستانی کسان حکومت کو ٹیکسوں کی اتنی رقم نہیں دیتا، جتنی کہ بنیے کو سود کے طور پر ادا کرتا ہے۔ اُن کے سود کی شرح ۳۵ فی صد فی سال اور سود مرکب کی شکل میں ہوتی ہے۔ ۵۰ فی صد تک شرح سود عام ہے اور بعض جگہ تو وہ ۷۵ فی صد تک بڑھ جاتی ہے۔[1]

یہ لعنت ہر قیمت پر ختم کی جانی چاہیے تھی لیکن ہم نے صرف اسے چٹکیوں میں اُڑا دیا۔ پنجاب میں بلاضمانت قرضوں پر سود کی شرح ۱۸ فی صد مقرر کی گئی اور مدراس کی صوبائی وزارت نے دیہی قرضوں کا بل منظور کیا جو اچھی طرح ڈرافٹ کیا گیا ہے۔ اس کی علاوہ کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ صورت حال وہی ہے جو صدیوں

(۱) ملاحظہ ہو: "The Story of India" مصنفہ ایف آر مورائس (نوبل پبلشنگ ہاؤس، بمبئی)

سے چلی آ رہی ہے۔

بتوں کو ختم کرنے کی راہ میں تین رکاوٹیں ہیں:

ان میں سے پہلی تو، حسب سابق مخصوص مفادات ہیں۔ ان کی پشت پر بڑے آدمی ہیں۔ ان کی پوزیشن خاصی مستحکم ہے اور انگریزوں کے چلے جانے کے بعد مستحکم تر ہو جائے گی۔ دوسری رکاوٹ انتظامی ہے: اس بات کو یقینی بنانے کے لیے جو اصلاحات کی گئی ہیں، ان پر عمل درآمد بھی ہو رہا ہے، انسپکٹروں کی ایک فوج کی ضرورت ہوگی جس کو تلاشی لینے اور تفتیش کرنے کے وسیع اختیارات حاصل ہوں۔ تیسری کسان کا اپنا کردار ہے، وہ بہت سست اور ناعاقبت اندیش ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح وقتی ضرورتیں پوری ہو جائیں، بعض لوگ اس کی سستی کو جسمانی کمزوری کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور دوسرے اسے ''کرما'' کے ہندو اصول کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جس کو مروڑ تروڑ کر اس کا مطلب کچھ بھی نکالا جا سکتا ہے اور جو حال کے کسی بھی ناگوار واقع سے فرار حاصل کرنے کے لیے انسان کی بہترین ایجاد ہے۔ بہر حال وجہ خواہ کچھ بھی ہو، ہمیں کسان کو اس خود ساختہ عذاب سے نجات دلانی ہے۔ خود اس کے نہ چاہنے کی صورت میں بھی............اور اگر انگریزوں نے ایسا نہ کیا تو دوسرا کوئی اس کام کی کوشش بھی نہیں کرے گا۔

زراعت کے ایک اہم شعبے میں انگریز، عالمی رائے عامہ کے روبرو خود کو ہر الزام سے بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں، جبکہ ہندو ملزم کے کٹہرے میں کھڑا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ رائے عامہ کے فیصلے سے متاثر نہیں ہوگا۔ یہ شعبہ مویشیوں کا ہے۔

ہندوستان میں مویشیوں کی صورت حال کے بارے میں ناقابل فہم اعداد و شمار کے صفحے کے صفحے لکھے جا سکتے ہیں لیکن مختصراً واقعات درج ذیل ہیں:

دنیا بھر کے مویشیوں کی ایک تہائی تعداد، ہندوستان میں پائی جاتی ہے، جو مضحکہ خیز حد تک زیادہ ہے اور ان میں سے بیشتر بالکل بے کار ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں مویشیوں کی فی ایکڑ تعداد ڈنمارک سے، جو کسی زمانے میں یورپ کا ڈیری فارم کہلاتا تھا، دوگنی ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستان میں آپ کو کسی قیمت پر بھی دودھ کا اچھا گلاس نہیں مل سکتا!

اس شرمناک صورت حال کا ذمہ دار ہندو مذہب ہے، جو مویشیوں کو ذبح کرنے کی اجازت نہیں دیتا، وہ سسک سسک کر مر جائیں، بھوک سے مر جائیں، بیماری کی حالت میں ادھر اُدھر ڈولتے ہوئے پھرتے

رہیں، جو ہر شخص کے لیے خواہ وہ کتنا بھی سنگدل کیوں نہ ہو، ناگوار ہوتا ہے لیکن ان کو کوئی تکلیف پہنچائے بغیر اس مصیبت سے نجات دلائے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ کانگریس کے ایک رکن مینو ماسانی، ستم ظریفی کے ہلکے سے شائبے کے بغیر کہتے ہیں" ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم اس قدر رحمدل واقع ہوئے ہیں۔''[1] نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیمار مویشی صحت مند مویشیوں کے لیے بھی زندگی محال کر دیتے ہیں۔ ان کے سو مویشیوں میں سے ۷۰ دودھ دینے کے قابل نہیں ہوتے[1]، صرف کھاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں باقی ۳۰ مویشیوں کے لیے اتنی کم خوراک بچتی ہے کہ مویشیوں کی دودھ کی پیداوار اوسطاً ڈیڑھ پاؤنڈ فی کس ہوتی ہے۔ دودھ کی یہ مقدار دنیا کے کسی نارمل ملک کی پیداوار کی نسبت ایک تہائی سے بھی کم ہے۔[2] یہ ہے وہ قیمت جو ایک ہندو، اپنے مویشی خانے میں وشنو مہاراج کے احکام کی تعمیل میں ادا کرتا ہے۔

یہ مسئلہ ایک معاصر مسئلہ ہے اور اس کے حل کے سلسلے میں انگریزوں کو کوئی الزام نہیں دیا جا سکتا۔ جب تک ہندو مذہب اپنی موجودہ شکل میں موجود ہے، اس کا حل تلاش کیا ہی نہیں جا سکتا۔ گاندھی شاید ہندوؤں کا نقطۂ نظر تبدیل کر سکتے لیکن وہ ہمیشہ ٹھوس مسئلوں کے حل سے گھبراتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا رویہ اُس جواب سے ظاہر ہو جائے گا، جو انھوں نے گئوشالہ کے ایک منیجر کو دیا تھا۔ اس شخص نے ایک خط کے ذریعے ان سے مشورہ طلب کیا تھا جو درج ذیل ہے:

''اس وقت میرے گئوشالہ میں ۵۰۰ گائیں ہیں۔ وہ تمام قطعاً بے کار مویشی ہیں اور کھانے کے سوا کچھ اور کام نہیں کر سکتے۔ ان میں سے اوسطاً ۳۵۰ سے لے کر ۴۰۰ تک مویشی تقریباً موت کے دہانے پر کھڑے ہوئے ہیں، جو کسی وقت بھی دم توڑ سکتے ہیں۔ آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔''

اگر گاندھی نے اس کا مختصر سا جواب دیا ہوتا کہ ''تمام کو گولی مار دو'' تو وہ ہندوستان کی اتنی بڑی خدمت کرتے، جتنی عدم تشدد کی ہزار مہمیں بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ خیالات میں ایک انقلاب کا آغاز کر دیتے

---

(۱) ملاحظہ کیجیے: "Our India"، مصنفہ مینو ماسانی (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس)۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستانیوں کو جانوروں کے ساتھ دیدہ و دانستہ طور پر ظالمانہ سلوک کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا، اگرچہ تمام واقعات اور شہادتیں ان کے خلاف جاتی ہیں۔ لیکن ان کی جہالت اور مذہبی دیوانگی، دونوں مل کر جو نتائج پیدا کرتی ہیں، وہ شیطانی ظلم سے بھی زیادہ ہیں۔

(۱) جرمنی میں ایک گائے اتنا دودھ دیتی ہے جتنا ہندوستان میں نو مویشی۔

جو بالآخر ہندوستانی زراعت میں انقلاب کا باعث بنتا اور کسانوں کو غلامی کی سطح سے بلند ہونے پر اُکساتا۔ (اور اس کے ساتھ ہندوستان کے بارے میں کتابیں لکھنے والوں پر بھی احسان کرتے کہ پہلی بار انھوں نے کوئی ایسی بات کی ہے، جو فوراً سمجھ میں آ جاتی ہے۔ ورنہ ان کی باتیں تو اس قسم کی ہوتی ہیں کہ انھیں سولہ دفعہ پڑھنے اور طویل غور و فکر کرنے کے بعد آپ ان کا ایک مطلب اخذ کرتے ہیں، لیکن اگلے ہی صفحے پر اس کی تردید کر دی جاتی ہے۔)

لیکن گاندھی نے یہ نہیں کہا کہ "تمام کو گولی مار دو" یہ فقرہ بہت براہ راست ہوتا، اینگلو سیکسن لوگوں کی صاف دلانہ باتوں کی مانند.......... اور سب سے بڑھ کر یہ بات گائے کی اس پوجا کے خلاف جاتی تھی جس کو وہ بہت مشتہر کیا کرتے ہیں۔ وہ نہایت چالاکی سے اس مشکل سے نکل گئے۔ اولاً اصل مسئلہ کو قطعاً نظر انداز کر کے اور ثانیاً اس کا الزام کسی اور کے سر لگا کر.......... یہاں انھوں نے سارا الزام انتظامیہ پر عائد کر دیا۔

انھوں نے جواب دیا:

> "یہ بات انتظامیہ اور اس طرح کے اداروں کے منتظمین کے لیے لازمی ہے کہ وہ بیمار اور کمزور مویشیوں کی نرسنگ اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے مؤثر ترین طریقے تجویز کریں۔"

اور اُن کے ان عملی اور روشن خیالی پر مبنی الفاظ سُن کر، مرتے ہوئے وہ جانور، کینسر میں مبتلا گائیں اور وہ بچھڑے جن کی ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں، ایک مرتبہ نہایت احسان مندی سے ڈکارے تو ضرور ہوں گے۔

☆☆☆

ساتواں باب

ہندوستان سے جائیں یا نہ جائیں

پورے ایک سال بعد بھی وہ اپنی جگہ موجود تھا۔ "ہندوستان چھوڑ دو" کا وہ نعرہ جو بڑے بڑے حرفوں میں ریلوے سٹیشن کے باہر درج تھا۔ اب وہ قدرے مدھم پڑ چکا تھا، کیونکہ مون سون کی بارشوں سے چاک کی لکھائی بہ گئی تھی۔ لیکن اب بھی اسے آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے۔ میں نے ایک پُرانے دوست کی طرح اس کا خیر مقدم کیا۔ ہندوستان پہنچنے پر مجھے جو پہلا شاک لگا تھا، وہ اسی کو دیکھ کر لگا تھا اور پھر یہ نعرہ جب کبھی میں کسی غیر منافع بخش راہ پر چلنے لگا، تو مجھے یاد دلاتا رہا کہ اہم بحث یہی ہے کہ ہندوستان کو چھوڑ دیا جائے یا نہیں اور میں ہندوستان سے جانے سے قبل، اس کا جواب دینے کی ضرور کوشش کروں گا۔

اس سوال کے تین حصے کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ کیا ہمیں ہندوستان سے چلے جانا چاہیے؟ یہ بنیادی طور پر ایک اخلاقی سوال ہے۔

۲۔ کیا ہم ہندوستان سے جا سکتے ہیں؟ یہ سوال زیادہ تر ایک مادی سوال ہے اور دفاعی معاملات سے متعلق ہے۔

۳۔ کیا ہم ہندوستان سے چلے جائیں گے؟ بدقسمتی سے اس کا جواب زیادہ تر مصلحتوں پر مبنی ہے۔ اس کا انحصار بہت سے عوامل پر ہے جن کا اندازہ لگانا دشوار ہے اور اس کا جواب دانشمندانہ قیاس آرائی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔

آیئے ہم ان تینوں سوالوں کا جواب اسی ترتیب میں دیتے ہیں۔ یاد رہے کہ ان کے جوابات کسی حد تک ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں گے۔

سب سے پہلے ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ کیا ہمیں ہندوستان سے چلے جانا چاہیے؟ یہ سوال برطانوی ووٹروں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ ہم برطانوی ووٹروں کو مسٹر سمتھ اور مسز سمتھ کا نام دیں گے۔ سمتھ فیملی کے زیادہ تر ارکان جب کبھی ہندوستان کے بارے میں سوچتے ہیں، جو بہت کبھی کبھی ہوتا ہے تو ان کو ایک مبہم سا فراخ دلانہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کو ہندوستان چھوڑ دینا چاہیے اور وہ شاید اسی احساس کے تحت

ووٹ دیں گے۔ یہاں میں نے "رائے" کے لفظ کی جگہ "احساس" کا لفظ دانستہ استعمال کیا ہے، کیونکہ رائے تو ایک ایسا نقطۂ نظر ہوتا ہے............ یا ہونا چاہیے............ جو واقعات کے مطالعے کے بعد، قائم کیا جاتا ہے، لیکن برطانوی ووٹروں کی بڑی تعداد کو نہ تو اصل واقعات کا علم ہے اور نہ ہی وہ ان کا مطالعہ کرنے کی طرف مائل ہیں۔ وہ صرف اپنے جذبات پر انحصار کرتے ہیں۔ انھیں نقشے میں ہندوستان کی پہچان ہے اور وہ جانتے ہیں کہ وہ کم از کم ایک ملک نظر آتا ہے۔ انھیں گاندھی سے بھی لگاؤ ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتے ہیں "بہرحال وہ خاصا جرأت مند شخص ہوگا، یہ ٹھیک ہے کہ وہ دیکھنے میں خوبصورت نہیں لیکن اس میں ہمت ضرور ہے اور اس کو جیل میں رکھنا، اس کے ساتھ تقدیر کی زیادتی ہے۔"

سمتھ خاندان کے ذہنوں کا یہ تجزیہ، برطانیہ کے نئے سمجھدار ووٹر کی توہین کرنے کے مترادف سمجھا جائے گا لیکن کیا یہ واقعی توہین ہے۔ میں نے ہندوستان میں کام کرنے والے سینکڑوں انگریزوں سے ملاقاتیں کی ہیں، جن کو ہندوستان کا علم کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے، جتنا کہ انگلستان میں ان کے دوسرے بہن بھائیوں کو ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ ان کو ہندوستان کی تاریخ، معیشت یا جغرافیہ کے بارے میں ابتدائی علم بھی نہیں ہے اور ان میں شاذ ہی کسی نے گاندھی کے سوا کسی اور ہندوستانی شخصیت کا نام سنا ہے۔ انھیں ہندو اور مسلمان کے درمیانی فرق کے متعلق کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی یہ پتہ ہے کہ ان میں سے اکثریت کس کی ہے؟ ان کے ذہنوں میں حکومت کے طریق کار کا تصور ہی نہیں ہے اور اگرچہ ان میں سے زیادہ تر کو یہ معلوم تھا کہ لارڈ ویول ہندوستان کے وائسرائے ہیں، لیکن ان کے اختیارات اور ان کی حدود کا کوئی علم نہیں تھا۔ ان لوگوں میں، جن میں افسر اور ماتحت دونوں شامل ہیں، بے انتہا جہالت پائی جاتی تھی، لیکن وہ اپنے رشتہ داروں کے مقابلے میں خود کو ہندوستانی امور کا ماہر تصور کرتے ہیں۔ یہ امر اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ جمہوریت کس طرح کام کرتی ہے، اور انسان یہ سوچنے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ کیا ملک میں عوامی انتخابات کرانے سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ہندوستان کے امور سے سمتھ اور ان کے ہندوستان میں کام کرنے والے بھائیوں اور بیٹوں کی عدم دلچسپی، اس وقت اور بھی زیادہ عجیب دکھائی دیتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں کو ایک منٹ کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ ہندوستان کو چھوڑنے کا ان کے گھروں پر اور اُن کی جیب پر کیا اثر پڑے گا۔ مسٹر چرچل انھیں بتا چکے ہیں کہ دس انگریزوں میں سے دو انگریزوں کی روزی براہ راست یا بالواسطہ طور پر ہندوستان سے وابستہ ہے اور انھیں یہ بات بھی یاد ہے کہ مسٹر چرچل اپنے معاصروں کی نسبت زیادہ صاف گو ہیں۔ لیکن مسز سمتھ، اپنے پارلیمانی نمائندوں (خاص کر ان علاقوں کے نمائندے جہاں ورکنگ کلاس رہتی

ہے) کی وساطت سے "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعروں پر نہایت جوش و خروش کے ساتھ داد دیتے ہیں اور اسے کسی نہ کسی طرح سے "ترقی" اور "نئی دنیا" اور سر ولیم بیورج (Sir William Beveridge)، پروفیسر لاسکی (Prof. Laski)، جے بی پریسلے (J.B. Priestley) اور بوڑھے انکل ٹام ڈرائی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔

اور اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ اگر ہمارے ووٹروں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی کہ ہمیں صرف اخلاقی وجوہ کی بنا پر ہندوستان سے نکل جانا چاہیے، تو وہ اس کے حق میں ووٹ دیں گے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا کرنا، خود اُن کے مفاد میں نہیں ہے۔ برطانیہ کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ نہیں ہوگا کہ برطانوی ووٹر، اس بات کے حق میں ووٹ دیں گے جو وہ صحیح سمجھتے ہیں، اس بات کے مکمل علم کے باوجود کہ اس میں ان کا اپنا نقصان ہوگا۔ اس سلسلے میں غلاموں کی تجارت پر پابندی کا قانون مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، حالانکہ اس منافع بخش تجارت سے انگریزوں کو بہت فائدہ پہنچا تھا۔ تاہم ابھی تک برطانوی ووٹروں نے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ صرف حقائق سے بے اعتنائی اور جہالت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہم انھیں اخلاق کے گلدستے پیش نہیں کر سکتے کیونکہ انھوں نے اپنے آپ کو ان کا اہل ثابت نہیں کیا ہے۔

میں اتنا متکبر نہیں ہوں کہ یہ فرض کر لوں کہ میری کتاب برطانیہ کے ووٹروں کی بڑی تعداد کو اپنا ذہن تبدیل کرنے پر مجبور کر دے گی۔ لیکن ایک ذاتی نقطۂ نظر بھی مسائل کو صاف تناظر میں دیکھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ واضح اور صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہو۔ لہٰذا میں بھی اپنا نقطۂ نظر بیان کروں گا اور ان سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔

کیا ہمیں ہندوستان چھوڑ دینا چاہیے؟

اخلاقی طور پر اس کا جواب ایک پُرجوش "ہاں" میں ہونا چاہیے۔ اگر اٹلانٹک چارٹر (Atlantic Charter)، کوئی چیز ہے، اگر ساری جنگ کا کوئی مقصد تھا تو اس کا جواب "ہاں" میں ہونا چاہیے۔

اور اخلاقی طور پر یہ بھی ضرور ہے کہ اس "ہاں" کو ہندوستان کی دو بڑی قوموں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان برابر خودمختاری اور حاکمیت کے اُصول کو تسلیم کرنے کے ساتھ، مشروط کیا جائے۔ جب تک یہ شرط پوری نہ کی جائے اس وقت تک یہ "ہاں" بالکل دھوکا اور بہلاوا ثابت ہوگی۔ ہم ایک ہاتھ سے آزادی دیں گے اور دوسرے ہاتھ سے واپس لے لیں گے۔ ہم صبح کو ۲۵ کروڑ ہندوؤں کو آزاد کریں گے اور تیسرے پہر ۱۰ کروڑ مسلمانوں کو اس جگہ جسے وہ یقیناً جیل سمجھتے ہیں، بند کر دیں گے۔

اس نکتے پر ہمیں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں۔ ہم پاکستان کے باب میں، اس کی کافی وضاحت کر چکے ہیں۔ لیکن یہ بات نہایت اہم ہے کہ دانشور، رائے عامہ کے رہنما، خصوصاً لیبر پارٹی کے نوجوان ارکان کانگریس کے پروپیگنڈے کو طوطے کی طرح دہرانے کی بجائے واقعات کا مطالعہ کریں اور اصل مسئلہ کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کا خلاصہ صرف ایک فقرے میں کر دیا گیا ہے۔ ''تقسیم کرو اور چلے جاؤ''۔ اس پالیسی کی مخالفت کرنے کی صرف دو وجوہ ہو سکتی ہیں۔ پہلی وجہ ہے واقعات سے لاعلمی اور دوسری وجہ ہے حق خود ارادیت کے اُصول سے انکار۔

یہ تو تھا اس مسئلے کا اخلاقی پہلو۔ اب ذرا مادی پہلو کی طرف چلتے ہیں۔

۲

کیا ہم ہندوستان سے جا سکتے ہیں؟

ہاں کیوں نہیں۔ لیکن ایک نہایت ہی غیر ذمہ دار شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم ہندوستان سے راتوں رات جا سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہندوستان کا جارحیت کے مقابلے میں کون دفاع کرے گا۔ (۱)

دفاع کے اس بنیادی مسئلے پر انگلستان میں نام نہاد ''ہندوستان کے دوستوں'' نے کبھی توجہ ہی نہیں دی، کیونکہ ان کے دماغ کانگریسی پروپیگنڈے نے مختل کر دیے ہیں۔ ان کے دماغوں میں ہر وقت یہ بات ڈالی جا رہی ہے کہ ہندوستان اپنا دفاع کرنے کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہے، صرف آزادی ملنے کی دیر ہے۔'' یہ بے ضرر فقرہ جتنا بے معنی ہے، اتنا ہی جھوٹ پر مشتمل ہے۔ ایک جانب ہندوستانی اب بھی عدم تشدد کا حامی ہے، کم از کم ہندو آبادی تو اس پالیسی کی حامی ہے۔ اگرچہ آج کل کچھ لوگوں نے اس خطرناک دھوکے کی شدت کو کم کر دیا ہے، لیکن ہندوؤں کے ذہن سے اس کا نقش مٹانا ناممکن کاموں میں شامل ہے۔ گاندھی کے فلسفے میں ''ہندوستانی اپنا دفاع کرنے کے لیے بے تاب ہیں'' کا مطلب یہ ہے کہ ''ہندوستانی ہر اس جارح کے لیے دروازے کی چٹائی کے فرائض انجام دینے کو بے تاب ہے، جو اس پر اپنے پاؤں صاف کرنا پسند

(۱) میں نے سادگی کے پیش نظر خانہ جنگی کے امکان پر غور کو دانستہ چھوڑ دیا ہے۔ پاکستان بننے سے خانہ جنگی کا سب سے خطرہ خود بخود ٹل جائے گا لیکن پھر بھی یہ بات خاصی یقینی ہے کہ ہندوستان کے بڑے علاقے میں روایتی مزاجیت کا دور دورہ شروع ہو جائے گا۔ اسی طرح یہ امر بھی ناقابل قیاس ہے کہ ہندوستان کی ریاستیں کسی جنگ کے بغیر اپنے آپ کو ختم کرنے پر رضامند ہو جائیں گے۔ اسی طرح شمال مغربی سرحد پر پھر جنگ کے شعلے بھڑک سکتے ہیں اور قبائلی جنگوں کا آغاز ہو سکتا ہے جو سرحدوں کے پار بھی پھیل سکتی ہے۔

کرے۔'' دوسری طرف وہ لوگ جنھوں نے عدم تشدد کی پالیسی کو مسترد کر دیا ہے۔ یہ نعرہ محض دنیا کو متاثر کرنے کے لیے لگا رہے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ وہ کس چیز سے اپنا دفاع کریں گے۔ غلیلوں سے؟ کشتیوں کے مستولوں سے؟ یا گندے انڈوں سے؟ یہ ایک بالکل جائز سوال ہے لیکن اس کا مناسب جواب نہیں دیا جاتا، کیونکہ پروپیگنڈا کرنے والے لوگ بڑے چالاک ہیں۔ وہ جواب دینے کی بجائے آپ سے سوال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ''ہندوستان اس قدر کمزور ہے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر ہمارے پاس بحری فوج، فضائیہ اور اسلحہ سازی کے کارخانے نہیں ہیں تو اس میں کس کی خطا ہے؟'' ان خطیبانہ سوالوں پر داد کا شور اتنا بلند ہوتا ہے کہ آپ کے سارے جواب تالیوں کی گونج میں گم ہو جاتے ہیں۔

دراصل ان سوالوں کے جواب دینا ہی بے کار ہے۔ اس وقت یہ پوچھنا ''کہ کس کی خطا'' ہے بالکل لایعنی ہے۔ لیکن چلیں، ہم سخاوت سے کام لیتے ہیں۔ ہم کانگریس کے اس رکن کی بات کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں، بہت اچھا! ہم آپ کی بات کو پوری طرح تسلیم کر لیتے ہیں، اس میں تمام تر خطا ہماری ہے لیکن کیا اس سے حقائق تبدیل ہو جائیں گے؟'' اس صورت حال کے ٹھوس حقائق تو تمام کے تمام اپنی جگہ بدستور موجود ہیں اور ان کی نوعیت اتنی سنگین ہے کہ مس پرل بک (Miss Pearl Buck) کے قدم بھی تھوڑی دیر کے لیے رک جائیں گے۔ اس کی ایک بہت سادہ مثال یہ ہے کہ ہندوستان کے پاس بحریہ نام کی عملاً کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ جنگ کے آغاز کے وقت ہندوستان بحریہ کے پاس صرف چند چھوٹے چھوٹے پٹرول شپ تھے۔ (۱) یہ کھلونے جیسی بحریہ، ڈنمارک جتنے سائز کے کسی ملک کے لیے بھی ناکافی ثابت ہوتی، ایک بڑے ملک کی جو انگلینڈ، فرانس، جرمنی، سکینڈے نیویا، اٹلی اور بلقان کی ریاستوں کے مجموعی رقبے سے بڑا ہے، ضرورتوں کو کیسے پورا کر سکتی ہے۔

خیر! اب دیکھنا یہ ہے کہ اس صورت حال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ان چھوٹے چھوٹے جہازوں کو حملہ آوروں کے گروہ کا مقابلہ کرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ تو پھر کیا کریں؟ اس معاملے کو اقوام متحدہ پر چھوڑ دیں؟ لیکن یہ معاملہ تو کافی بحث طلب اور لمبا ہے؟ اگر اس معاملے کو اقوام متحدہ پر چھوڑ دیا جائے تو کیا وہ یہ توقع نہیں کریں گے کہ انھیں یہ عظیم ذمہ داری سنبھالنے کے عوض کیا حاصل ہوگا؟ .... اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ کیا وہ یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے کہ گاندھی فوجی بھرتی کے خلاف

(۱) اس کے بعد سے اس میں چند کورویٹ (Corvettes)، مائن سویپر (Mine Sweeper) اور سلوپس (Sloops) کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

مہم نہ چلائیں؟ گاندھی تو اپنے زندگی بھر کے دعوؤں کے مطابق یہ مہم ضرور چلائیں گے۔

خدا کے واسطے، اس سوال کے جواب میں لیت ولعل سے کام نہ لیجیے اور نہ ہی اس کو اپنی مثالی لیکن مبہم باتوں کی نذر کیجیے۔ بحریہ آسمان سے نازل نہیں ہوتی۔ یہ ایک حیرت انگیز اور نازک آلہ ہوتی ہے جس میں ہمت وجرأت کے ساتھ ساتھ فولاد و آہن کی سختی ہوتی ہے اور جو لوہے کی کیلوں اور خون کی گرم جوشی کا مرکب ہوتی ہے۔ اس کو کئی لحاظ سے قوموں کی ذہانت کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا ہندوستان میں اتنی ذہانت ہے کہ وہ ایک عظیم بحریہ تخلیق کر سکے؟ چلیں ہم پھر دریا دلی کا مظاہر کرتے ہیں اور ایک لمبا سانس لے کر "ہاں" کہہ دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں اپنے شکوک وشبہات کے باوجود لیکن ایسی صورت میں بھی بحریہ کو تیار کرنے، اس کے لیے نوجوان بھرتی کرنے اور ان میں جذبہ پیدا کرنے کے لیے کم از کم بیس برس تو درکار ہوں گے۔

اور ان بیس سال تک کیا ہوگا؟ کیا برطانوی بحریہ بدستور یہ فرائض انجام دیتی رہے گی؟ کسی قسم کے معاوضے اور شکریے کے بغیر؟ کیا اس کا بل برطانوی ٹیکس گزاروں کو ادا کرنا پڑے گا؟ اگر ہم چند برطانوی سیاستدانوں کی مجنونانہ باتوں پر یقین کریں تو اس کا جواب ہاں ہی ہوگا۔ لیکن اگر فیاض برطانوی ورکنگ کلاس کو، جو آج اپنے مفادات کے خلاف ووٹ دینے پر آمادہ ہے، اصل حقائق کے بارے میں ذرا سا بھی علم ہو جائے، تو کیا اس وقت بھی اس سوال کا جواب ہاں ہی دیا جا سکے گا؟

ہندوستان کی فوج پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ اس میں کسی شخص کو بھی شک نہیں کہ ہندوستانی فوجوں نے موجودہ جنگ کے دوران بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ یہ فوج، تن تنہا، دنیا کی ایک بٹا پانچ آبادی کا دفاع کر سکتی ہے۔ اس میں تربیت یافتہ جوانوں کی شدید کمی ہے۔ اس کے علاوہ اس فوج کو جس قدر طویل وعریض رقبے، اور جتنے عظیم مفادات کا دفاع کرنا ہے، اس کے حساب سے اس کتاب کی تحریر کے وقت تک صرف مٹھی بھر افسر ہیں، جن کو میدان جنگ یا دفاتر میں کوئی بڑی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔ ہم ایک بار پھر اس بات کا اقرار کر لیتے ہیں کہ یہ ہماری غلطی ہے، ہم نے دانستہ طور پر اختیارات اپنے پاس رکھے، لیکن خواہ یہ صورت حال ہماری خود غرضی کا نتیجہ ہو یا ہندوستانیوں کے ذمہ داری قبول کرنے سے گریز کا انجام، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں ہم حقائق بیان کر رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک افسروں کا تعلق ہے، ہندوستان کو از سر نو ابتدا کرنی پڑے گی۔

ہمیں اس بات کا تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ افسر اچانک آسمان سے ٹپکنے شروع ہو جائیں گے۔ پوری

طرح مسلح اور ڈسپلن اور حکم دینے کی طاقت سے لیس، جو اس امانت کے دفاع کے لیے ضروری ہے جو انھیں سونپی گئی ہے۔ کم از کم کانگریس کے اعلانات سے تو ہم یہی اندازہ لگا پائے ہیں، لیکن ایک حقیقت پسند انسان کے لیے یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ اعلیٰ تربیت یافتہ افراد، جن کو وہ تمام علم حاصل ہو جو دور جدید کے ایک افسر کو ہونا چاہیے، اتنی بڑی تعداد میں تیار کرنے پر ایک نسل سے کم کا عرصہ درکار ہو سکتا ہے۔ خواہ حالات کتنے ہی سازگار کیوں نہ ہوں۔

جب تک یہ فوج تیار نہیں ہو جاتی، تب تک کیا ہوگا؟ کیا ہندوستان کا دفاع ایک بین الاقوامی فوج کرے گی، جس میں پولینڈ آزاد فرانس، امریکہ، روس اور چین کے باشندے شامل ہوں گے؟ (ظاہری بات ہے کہ قابل نفرت انگریزوں کی خدمات حاصل نہیں کی جائیں گی) اور کیا یہ ممکن ہوگا کہ کوئی چیک (Czech) لیفٹیننٹ یا ناروے کا سارجنٹ، مدراسیوں کے عدم تشدد کے حامی گروہ کو ٹینکوں کی لڑائی کے ابتدائی آداب سکھائے، خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ ٹینک موجود ہی نہ ہوں؟ اور اس سے ہمیں ایک اور مشکل کا خیال آ گیا ہے، ہندوستان میں اسلحہ سازی کے کارخانوں کا نہ ہونا۔ کیا ہم ایک بار پھر ہندوستان ...... بلکہ دو ہندوستانوں ...... کے ہاتھ ہتھیار بیچنے کے لیے بین الاقوامی خون چوس گروہوں کے درمیان دوڑ کا مشاہدہ کریں گے۔ کیا ہم زہاروف (Zaharoffs) کی ایک اور نسل کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان چکر کاٹتے دیکھیں گے، جو پیر کے روز مسلمانوں کو ۵۰ مشین گنیں اور منگل کو ہندوؤں کے ہاتھ ۶۰ مشین گنیں فروخت کرتے نظر آئیں گے؟

آپ ان سوالوں کو فضول قرار دے سکتے ہیں، لیکن یہ سوال جس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے کیے جا رہے ہیں، وہ بھی تو فضول ہے۔ یہ بات بھی تو فضول ہے کہ ہندوستان فوج کے بغیر گزارہ کر سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ ہندوستان کے پاس فوج ہے اس سے بھی زیادہ فضول بات ہے۔ یہ یقین کرنا بھی فضول ہے کہ یہ فوج بیس سال سے کم مدت میں تیار کی جا سکتی ہے اور ان خطرات اور دشواریوں کو، جو دفاع کو بین الاقوامی کنٹرول میں دینے سے پیش آ سکتی ہیں، غیر اہم قرار دینا سب سے زیادہ فضول ہے۔

شاید ان باہم مقابلہ کرتی ہوئی فضول باتوں پر غور کے بعد، قاری کو اس نعرے کے غیر معمولی طور پر فضول ہونے کا کچھ احساس ہو گیا ہوگا، جس کو وہ پہلے من وعن قبول کرنے پر تیار تھا "ہندوستان اپنے آپ کا دفاع کرنے کے لیے بے تاب ہے، اگر وہ آزاد ہو جائے" شاید میڈ ہیٹر (Mad Hatter) نے بھی ایسی بیوقوفی کی بات نہ کی ہو۔

۳

"کیا ہم ہندوستان سے چلے جائیں گے؟"
اس سوال کا جواب دینا سب سے دشوار ہے۔ کیونکہ اس کا انحصار ہندوستان کی تحریک آزادی کے آغاز سے، خود ہندوستانیوں کے رویے پر ہے۔ (۱)

اگر کرپس کی تجاویز (Cripps' Proposal) مان لی جاتیں تو آج ہم ہندوستان کو چھوڑنے کے بالکل قریب ہوتے۔ ہمارے بیگ پیک ہو چکے ہوتے۔ ہم زیادہ تر لوگوں سے رخصت ہو چکے ہوتے اور ٹیکسی ہمارے دروازے پر کھڑی ہوتی۔ لیکن کرپس کی تجاویز قبول نہیں کی گئیں۔ لہٰذا اب ہر شخص روانگی کے انتظار میں بے چین ہے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سوٹ کیس لیے تار آنے کے منتظر ہیں۔

یہاں کرپس کی تجاویز پر ہونے والی بحث کو دہرانے کا وقت نہیں ہے۔ اس کی تفصیلات بہت ضخیم ہیں اور ویسے بھی اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اور وہ نفسیاتی ماحول دوبارہ پیدا کرنا ناممکن ہے، جس میں یہ تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ تاہم اس سلسلے میں دو نکتے ایسے ہیں، جن کا عام قاری کو علم ہونا چاہیے۔ اوّل یہ کہ ہندوستان کی دو بڑی اقلیتوں نے ان تجاویز کو ہندوؤں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف قرار دیا تھا۔ مسلمانوں اور اچھوتوں نے یکساں غصہ کے ساتھ کہا تھا کہ "آپ نے ہمیں ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔" اور ان دونوں کا (جن کی مجموعی تعداد ۱۶ کروڑ ہے) کہنا بالکل درست تھا۔

دوسری بات، جس کا احساس ضروری ہے، یہ ہے کہ اب ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد، ان تجاویز کو مسترد کرنے میں اپنی غلطی پر بُری طرح نادم ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو سارے ہندوستان میں برہمن اس بات پر دانت پیستے نظر آئیں گے، کہ ہم نے اس جنت کو کیوں ٹھکرا دیا۔ کیونکہ ان تجاویز میں وہ تمام عناصر موجود تھے، جو انھیں ہندوؤں کے لیے جنت بنا سکتے تھے۔ کرپس کی پیشکش میں وہ تمام چیزیں شامل تھیں جن کی

---

(۱) پاکستان کے دفاع کے مسائل، ہندوستان کی نسبت کم ہوں گے۔ اس کی وجہ جزوی طور پر تو یہ ہے کہ پاکستان رقبے میں چھوٹا، اور اس کا ساحلی علاقہ نہ ہونے کے برابر ہوگا، لیکن بنیادی وجہ یہ ہے کہ مسلمان، ہندوستان میں ہمیشہ سے جنگجو قوم رہے ہیں۔ ان میں حکم جاری کرنے کی قدرتی صلاحیت ہے، اور وہ اس کا آٹھ سو برس تک مظاہرہ کر چکے ہیں۔ حالیہ جنگ کے دوران میں بھی، مسلح افواج میں سب سے زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہے اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پاکستان، فوراً ہی مسلمان دنیا کے ساتھ اپنے روابط استوار کر لے گا۔

کوئی فاش ڈکٹیٹر تمنا کر سکتا تھا لیکن اب وقت گزر چکا ہے۔ کیونکہ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ، مسلمان قوم کی آنکھیں کھلتی جا رہی ہیں اور اچھوتوں کا سر بلند ہو رہا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اب سٹیج روشن ہو گیا ہے اور عالمی ناظرین یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کا ڈراما اس قدر سادہ نہیں ہے، جتنا کہ انھیں باور کرایا گیا تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود، کسی نہ کسی طرح، ہم ہندوستان سے چلے جائیں گے۔ شاید جلدی میں، جو ایک ایسا المیہ ہوگا جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یا شاید نسبتاً فرصت سے، جس سے ہمیں اور ساری دنیا کو، اس بات کا موقع مل جائے گا کہ وہ اُن نسلی، فوجی اور اقتصادی تبدیلیوں کو قبول کر سکیں، جو ہندوستان میں ہمارے جانے کی صورت میں رونما ہوں گے۔

۴

ہم ہندوستان سے کل نکلیں یا نسبتاً فرصت سے، لیکن ہم روحانی اعتبار سے کبھی ہندوستان سے نہیں نکل سکتے۔ کیونکہ اپنی تمام منفی اور مثبت خطاؤں، اپنے کبھی کبھی طیش میں آ جانے اور اکثر دور اندیشی کا مظاہرہ نہ کرنے کے باوجود، ہم نے ہندوستان کو ایسا امن دیا، جو ریگستان کا امن نہیں، ہم نے ہندوستان کو قانون دیا اور یہ طاقت کا قانون نہیں اور سب سے بڑھ کر ہم نے ہندوستانی کو آزادی دی، کیونکہ یہ ملٹن (Milton)، لاک (Locke)، ولبر فورس (Wilber Force)، مل (Mill)، برائٹ (Bright) اور گلیڈسٹون (Glad Stone) ہی تھے، جنھوں نے ہندوستانیوں کے ذہن میں حقیقی آزادی کا شعور پیدا کیا۔ ہندوستان سے ہمارے چلے جانے کے طویل عرصے بعد بھی، مستقبل کا طالب علم "Areopagitica" کے زریں ورق پلٹ رہا ہوگا اور شیلے (Shelley) کی انقلابی موسیقی پر سر دھن رہا ہوگا۔ بائرن (Byron) کی روح، ان یونیورسٹیوں کے کیمپس میں، جو ابھی تعمیر نہیں ہوئیں، خیالوں میں غرق نظر آئے گی اور کونسل چیمبرز میں برک (Burke) کے لہجے کی گونج سنائی دے رہی ہوگی۔ ہم نے ہندوستان کو، دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح یہ چیزیں دی ہیں، جو شاید ہندوستان میں بہترین پھل دے سکیں۔ اس اُمید کے پورے ہونے پر ہی انسانیت کے مستقبل کا انحصار ہے۔

بمبئی

موسم بہار ۱۹۴۴ء